ماسکو کی سفید راتیں

مستنصر حسین تارڑ



ماسکو کی سفید راتیں

سفرنامہ

مستنصر حسین تارڑ





"ماسکو کی سفید راتیں"





پہلا باب

''نصف صدی کے بعد...پھر ماسکو میں''

''اب کے سُرخ چوک کے آخیر میں واقع کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں کے عین وسط میں ایک گلرنگ انار چھوٹا۔ سرخ گنبد ایک لمحے کے لیے پیلے پڑ گئے۔ آج ماسکو کے ''کراسنایا پلوشت'' یعنی سُرخ چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ رُوسی موسیقی کی تانوں پر تھرکتا' شراب کے نشے میں جھومتا گاتا ایک سیل بے کراں تھا جو چوک میں سے نکلنے والی سڑکوں سے باہر اُبل رہا تھا۔ ہزاروں انسانی جسموں نے سرخ چوک کو اپنے اندر سمو کر اس کی عظیم وسعت کو بے معنی بنا کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے چاروں اور کھڑی عمارتیں' کریملن' لینن کا مقبرہ' گم ڈیپارٹمنٹل سٹور' کلیسا سینٹ باسل' رُوسی عوام کا عجائب گھر اور گورکی سٹریٹ ہجوم کی گرمی شوق سے موم ہو کر پگھل جائیں گی اور اس کے بعد یہ سمندر پورے ماسکو کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ انسانی آوازوں کے شور اور موسیقی کی دھمک سے کریملن کا آئیون مینار اوندھا ہو جائے گا۔

ہر چند منٹ بعد ماسکو کا نیلا آسمان' گولوں' پٹاخوں' اناروں' پھلجھڑیوں اور ہوائیوں کی آتش بازی چھوٹنے سے کسی تجریدی شاہکار کی مانند رنگین اور شوخ ہو جاتا' سپاسکایا مینار کی چوٹی پر نصب سرخ ستارہ جھلملانے لگتا۔ آتش بازی کی آواز سے اپنے آپ میں مگن ہجوم چونک اُٹھتا اور لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو جاتا۔ نظریں آسمان پر لگ جاتیں لیکن جونہی آخری شرارہ بھڑک کر بجھتا' پھر وہی شور اور موسیقی کی تانیں اُبھر آتیں۔''

(ناولٹ ''فاختہ'')

آج بھی جشن کی رات تھی۔

اور آج بھی سرخ چوک کے آخیر میں واقع کلیسا سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں

کے عین وسط میں ایک گلرنگ انار چھوٹا تھا اور سرخ گنبد ایک لمحے کے لیے پیلے پڑ گئے تھے۔

اور آج بھی ''کراسنایا پلوشت'' یعنی سرخ چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی..

روسی موسیقی کی تانوں پر تھرکتا.. اگرچہ اب اس میں مغربی موسیقی کا شور بھی شامل تھا' شراب کے نشے میں جھومتا گاتا ایک سیلِ بے کراں تھا جو چوک میں سے نکلنے والی سڑک سے اُبل رہا تھا..

اور ہر چند منٹ بعد ماسکو کا نیلا آسمان آتش بازی چھوٹنے سے کسی تجریدی شاہکار کی مانند رنگین اور شوخ ہو جاتا تھا..

تب بھی..

اور اب بھی..

بس ایک فرق تھا.. اگر کائناتی تعین کے پیمانوں پر پرکھا جائے تو نہایت معمولی سا محض چند لمحوں کا فرق تھا..

یہ معمولی فرق صرف پچاس برس کا تھا..

میں تب آیا تھا 1957ء میں اور پھر اب جا کر آیا تھا 2007ء میں' محض پچاس برس بعد..

تصویر تقریباً وہی تھی' لیکن تب کی تصویر کے کونے میں وقت نے اپنے دستخط کیے تو وہ 1957ء کی صورت میں تھے اور اب اس تصویر کے کونے میں جو دستخط ہو رہے تھے ان کی سیاہی ابھی گیلی تھی اور وہاں 2007 لکھا تھا..

معمولی سا فرق تھا..

کائناتی پیمانوں سے پرکھا جائے تو صرف چند لمحوں کا فرق..

اور اگر زمین پر گزرنے والے وقت کی پیمائش کی جائے تو پچاس برس..

یہ جو کائناتی نظام کے تحت چند لمحے گزرے تھے تو ان میں جو اولین لمحے تھے.. اور زمین پر گزر جانے والے جو پچاس برس تھے ان کے اوائل میں..

تب.. میں ایک کچی عمر کا راتوں کی نمی سے شرمندہ ہونے والا ایک ٹین ایجر تھا جو صرف اس لیے روزانہ شیو کرتا تھا تاکہ اپنے آپ کو بالغ ثابت کر سکے.. اور وہ نادانی میں کچھ بھی ثابت نہ کر سکتا تھا کہ ابھی ابھی تازہ گیلی مٹی سے بنایا گیا تھا.. اس کے چہرے کی جلد میں سے کرنیں پھوٹتی تھیں اور اُس کا بدن ہر لحظہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا تھا اور وہ کسی بھی.. جیسی کیسی بھی.. نسوانی شکل کو

دیکھ کر بخار میں پھنکنے لگتا تھا..

اور اب.. پچاس برس بعد بدن تو وہی تھا پر اُسے عمر کا بُل ڈوزر روند چکا تھا.. نہ کسی چہرے کو دیکھ کر بخار میں پھُنکتا تھا اور نہ بغاوت پر آمادہ ہوتا تھا کہ جتنی آگ تھی وقت نے اُسے راکھ کر دیا تھا۔

اور وہ جو اُس کا پیٹ ایک چیتے کی مانند ہموار اور تنا ہوا ہوتا تھا اب اُس کے قابو میں نہ آتا تھا.. چہرے کی جلد میں سے کوئی ایک کرن پھوٹے مدتیں ہو چکی تھیں اور اُس پر عمر کی مکڑی جھریاں بُن رہی تھی..

میں پوری نصف صدی کے بعد ماسکو آیا تھا اور عجیب اتفاق تھا کہ تب بھی جشن کی ایک رات تھی اور میں سرخ چوک میں تھا اور اب بھی رات جشن کی تھی اور میں سرخ چوک کی قربت میں تھا..

سرخ چوک کے پتھر تو وہی تھے.. پر میں نہ تھا.. کلیسا سینٹ باسل' کریملن' گم سٹور' لینن کا مقبرہ اور گورکی سٹریٹ اگرچہ آج یہ تورسکایا تھی پر وہی تھی اور ان پر برسوں کا کچھ اثر نہ ہوا تھا اور وقت نے مجھے زوال کا شکار کر دیا تھا..

اسی سرخ چوک کے پتھروں پر بھی میرے قدم تھے..

ان تین نقاب پوش لڑکیوں کے قدم تھے جن کے ہمراہ ''فاختہ'' تھی..

پر یہ پتھر اب مجھے پچاس برس بعد کہاں پہچانتے تھے..

یہ پتھر تب تو راسخ العقیدہ بنیاد پرست کمیونسٹ تھے اور اب کٹر سرمایہ دارانہ امریکی ثقافت کے رنگوں میں ڈوبے ہوئے تھے..

صرف پچاس برسوں میں یہ دنیا کیا سے کیا ہو گئی تھی..

اس دنیا نے اپنے کمیونسٹ خدا ترک کر دیئے تھے.. ان خداؤں کے مجسمے اوندھے کر دیئے تھے اور اُن کی جگہ مغرب کے خدا قبول کر کے اُنہیں راج سنگھاسن پر بٹھا کر اُن کی پرستش شروع کر دی تھی..

کیا ہر خدا کبھی نہ کبھی متروک ہو جاتا ہے..

گندھارا کے بدھ خدا او کعبہ کے لات اور طائف کی منات بالآخر متروک ہو جاتے ہیں.. اگرچہ لینن ابھی تک اپنے زیرِ زمین مقبرے میں حنوط شدہ پڑا تھا.. اُس کے برابر میں آراستہ

روسیوں اور دنیا کے لیے دوسری جنگ عظیم جیتنے والا جوزف سٹالن خروشچوف کے ہاتھوں کب کا جلایا جا چکا تھا۔

یہ اچھا ہی تھا کہ لینن حنوط شدہ حالت میں پڑا تھا۔ وہ زندہ ہو کر اوپر سرخ چوک میں آنکلتا تو جو کچھ وہ دیکھتا اسے دیکھ کر دوبارہ مر جاتا کہ اُس کے انقلاب فرانس کے بعد سب سے عظیم اکتوبر انقلاب کا جنازہ کس دھوم سے نکل رہا تھا۔

اُس کے مرشد کارل مارکس نے مذہب کو افیون قرار دیا تھا۔ اور آج سرخ چوک کے کونوں میں نو تعمیر کلیساؤں میں سے پادریوں کی شعلہ بار اور غیض و غضب سے بھڑکتی آوازیں لاؤڈ سپیکروں میں سے گونجتی ہوئی اُس کے مدفن کے اندر تک جاتی تھیں اور ہر سو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے سنتوں کی اداس شبیہیں آویزاں تھیں۔ وہاں کمیونزم کے روس کے بعد سب سے عظیم معبد میں۔ سرخ چوک کے مقابل جو بیجنگ کا تھیان من سکوئر تھا وہاں ماؤزے تنگ کے حنوط شدہ چہرے پر اب نزدیکی میکڈونلڈ کے نیون سائن کی جلتی بجھتی روشنیاں۔ یوں جلتی اور بجھتی تھیں جیسے اُسے کچوکے دیتی ہوں کہ تم نے ہی تو کہا تھا کہ امریکہ ایک پیپر ٹائیگر ہے۔ ایک کاغذی شیر ہے۔ اور ہم نے تمہیں قوت بازو سے نہیں ایک برگر اور کچھ فرنچ فرائز سے زیر کر لیا ہے۔ ماؤزے تنگ کی نسبت لینن اب تک قدرے آرام سے تھا کہ جتنے بھی میکڈونلڈ تھے وہ سب کے سب درجنوں کی تعداد میں ماسکو میں بکھرے ہوئے تھے۔

تب۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا' کہا جاتا تھا کہ لینن روس کا نجات دہندہ اور ایک پیغمبر ہے۔ سوویت یونین کی عظمت کا نشان ہے۔ اور وہ تھا۔

اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ مذہبی حوالے سے ایک لاش کو فوراً دبا دینا چاہیے۔ وہ ایک ایسی نحوست ہے جس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے اور اس مردے کو مقبرے میں سے نکال کر اگر دفن کرنا ہے تو کر دیا جائے۔ اگرچہ روس میں کونسا ایسا پادری ہو گا جو اس کی تدفین پر وعظ کرے یعنی اس کی نماز جنازہ پڑھائے۔ تو اسے فی الفور اس کے زیر زمین مدفن میں سے نکال کر سپرد خاک کر دینا چاہیے ورنہ نیا روس کبھی ترقی نہیں کرے گا۔

مجھے لگتا ہے کہ لینن کے نظریات تو کب کے دفن ہو چکے لیکن اس کے حنوط شدہ بدن کے دن بھی تھوڑے ہیں۔

اگرچہ صدر پیوٹن نے لینن کے مُردے کو اپنی تاریخ کا ایک حصہ قرار دے کر فی الحال

اسے دفن کر دینے کو مناسب نہیں جانا لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ کسی ایک سویر روسیوں کو یہ مژدہ سنا دیا جائے گا کہ پچھلی شب ہم نے اس منحوس مُردے کو جو کہ ولاڈیمیر لینن تھا اسے تہہ خانے میں سے نکال کر جلا دیا یا دفن کر دیا ہے تو اس خوشی میں سرخ چوک میں ایک اور جشن کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

یہ وہ ماسکو نہ تھا جو پچاس برس پیشتر میں نے دیکھا تھا۔

یہ کوئی اور شہر تھا۔۔۔

سوائے سرخ چوک' دریائے ماسکو' پوشکن کے مجسمے اور چند یادگار عمارتوں کے' یہ کوئی اور شہر تھا۔

اس شہر کا شناختی کارڈ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔۔

پچاس برس پیشتر اس شہر نے مجھے جو شناختی کارڈ دکھایا تھا اس پر مارکس' اینگلز اور لینن کی مہریں تھیں۔ "دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ تمہارے پاس کھو دینے کے لیے صرف زنجیریں ہیں' کی چھاپ تھی۔ کارڈ کا رنگ سرخ تھا اور اس کا امتیازی نشان جس سے اس کی پہچان کی جا سکتی تھی ہتھوڑا اور درانتی تھے۔۔ مذہب کا خانہ خالی تھا کہ مذہب ایک افیون تھا۔۔

اور آج پچاس برس بعد اس ماسکو نے جب میرے سامنے اپنا شناختی کارڈ نمائش کیا تو وہ یکسر مختلف تھا۔ اتنا مختلف کہ میں پہچان نہ پایا۔ اس پر گورباچوف' یلسن اور پیوٹن کے چہرے تھے۔ اسے اب دنیا بھر تو کیا اپنے مزدوروں سے بھی کچھ سروکار نہ تھا۔ کارڈ کا رنگ بین الاقوامی تجارتی منڈیوں کے رنگوں کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ البتہ مذہب کا خانہ وجود میں آ گیا تھا اور اس کے آگے لکھا تھا۔۔۔ روسی' آرتھوڈوکس' عیسائی۔

کمیونسٹ انقلابیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے آخری روسی زار اور اس کے خاندان کی ہڈیوں کو بے نشان گڑھوں میں سے کھود کر نہایت احترام کے ساتھ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد دوبارہ دفن کیا جا چکا تھا۔ اور ان کے ساتھ ہی سوویت یونین کو بھی دفن کر دیا گیا تھا۔ اور اس بار اُسے کسی بے نام گڑھے میں بغیر کسی اعزاز کے دبا دیا گیا تھا۔ کیا مستقبل میں اس سوویت یونین کی ہڈیاں بھی تلاش کر کے ان پر آنسو بہائے جائیں گے؟۔ جس طرح تب آج کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا اسی طرح آج کے کل کو ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔۔

"پراودا" میں بھی ایسا "سچ" نہ چھپ سکتا تھا جو 18 مئی کے "دی ماسکو ٹائمز" کے پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا۔ دو سفید ریش پادری نہایت شاہانہ لبادوں میں سر پر جواہرات سے مزین دمکتے

تاج پہنے اپنے ہاتھوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بی بی مریم کی تصویر رکھے اور صدر پیوٹن کا چہرہ اس تصویر میں دفن اسے بوسہ دیتے ہوئے۔ ''پیوٹن ایک آئی کان کو بوسہ دے رہے ہیں جو انہیں مذہبی راہنماؤں نے عیسیٰ ہمیں محفوظ کر دینے والا کلیسا میں ایک سروس کے دوران پیش کیا گیا۔''
جیسے زار روس کی ہڈیاں چین سے کب سوتی ہوں گی جب اُن کے اوپر جو اُن کی ذاتی جاگیر تھی وہاں مزدوروں اور کمی کمینوں کے سرخ پھریرے لہرا رہے تھے اُسی طور لینن کے حنوط شدہ چہرے پر جو داڑھی تھی' وہ بھی تو ایسی تصویر دیکھ کر دکھی ہوگی اور اُس کے بال موت کے بعد مرنے کے منظر میں مزید سفید ہو گئے ہوں گے۔ ممکن ہے اُس نے اپنی داڑھی کے کچھ بال نوچ بھی لیے ہوں۔۔

ویسے مجھے ان تغیرات زمانہ سے کیا لینا دینا۔ کہ ثبات بھی تو صرف تغیر کو ہے۔۔ مجھے تب جب میں نے اپنی زندگی کی پہلی ادبی تحریر لکھی۔۔ اور اسے آج سے نصف صدی پیشتر ''لنڈن سے ماسکو تک'' کا عنوان دیا تو ایک ترقی پسند دوست نے مشورہ دیا کہ تم اس کا نام ''میں نے لینن کا روس دیکھا'' قسم کا رکھو تو میں نے کہا تھا۔۔ اور دوست کا نام غالباً آزاد تھا کہ آزاد ملک تو ہمیشہ اپنی ثقافت' روایات اور زبان سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہیں کسی ایک شخصیت یا عقیدے کے حوالے سے ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا۔۔ آج وہ لینن کا روس ہے کل جانے کس کا ہوگا۔۔
آزاد نے مجھے یقیناً فاتر العقل جانا ہوگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روس کبھی لینن کا روس نہ رہے۔۔
ایک عام انسان کا تو ذکر ہی کیا۔۔ ملک اور سرزمینیں تو پیغمبروں کے حوالے سے بھی دائمی پہچان نہ بن سکے۔

آج کا پاکستان۔۔ اور کسی حد تک افغانستان۔۔ کبھی یونانی تہذیب کے پھریرے لہراتا تھا اور کبھی ایرانی۔۔ ملتان سینکڑوں برس تک ایرانی سلطنت کا حصہ رہا۔۔ پھر مہاتما بدھ ہر سُو راج کرنے لگے۔۔ گندھارا عہد بامیان سے لے کر سندھ کے صحراؤں تک پھیل گیا۔۔ اور بامیان کے دنیا میں سے سب سے بلند اور عالی شان بدھ مجسمے اس خطے کے سب سے بڑے خدا ہو گئے۔۔ اشوک اعظم کی بادشاہت نے بدھ مت کو اس خطے کا اپنے تئیں آخری مذہب ہمیشہ کے لیے رائج کر دیا۔۔ پھر ہندوشاہی کے زمانے آ گئے۔۔ کٹاس راج کے زمانے آ گئے اور زمین میں سے برآمد ہونے والے یونانی اور بدھ عہد کے سکوں کے ہمراہ ہندوشاہی کے دیوتاؤں کے سکے غالب آنے لگے۔۔ مسلم تہذیب ان خطوں میں سرایت کرنے لگی تو پھر اس کی بادشاہت ہوگئی۔ مختصر یہ کہ انگریز راج آیا اور

بمشکل رخصت ہوا اور اب ان خطوں کی پہچان اسلام ہے۔۔ لیکن کب تک؟
تو اگر روس کی پہچان بدل گئی ہے تو یہ ایک تاریخی عمل ہے۔۔
اگرچہ کسی کو بھی توقع نہ تھی کہ پانسا اتنی جلد پلٹ جائے گا۔۔
کمیونزم کا سکہ آنکھ جھپکتے ہی کھوٹا ہو جائے گا۔۔

اور یہ سکہ خود بخود۔۔ محض آمریت' جبر' بستیوں اور قوموں اور مذہبوں کو اجاڑنے سے انہیں اکھاڑ کر اجنبی سرزمینوں پر بسانے سے اور سائبیریا کی سرد اور سفید راتوں میں لاکھوں مرنے والوں کی بددعاؤں سے کھوٹا نہیں ہوا۔۔ بلکہ مغرب اور خاص طور پر سرمایہ دارانہ نظام نے دن رات ایک کر کے بھی اسے کھوٹا کیا۔ اقتصادی زبوں حالی اور بھوک نے اور زباں بندی نے بھی اسے کھوٹا کیا اور پھر روسیوں نے بھی اپنے سکے کو کھوٹا مان لیا۔ اگرچہ وہ کچھ مزید برسوں کے لیے کھرا ہو سکتا تھا اور دنیا کے بازار میں چل سکتا تھا۔۔

تو مجھے ان کھوٹے یا کھرے سکوں سے کیا لینا دینا۔۔ کہ میں تو ایک آوارہ گرد درویش تھا۔۔ مجھے تو کسی بھی سرزمین کے باشندوں سے سروکار تھا۔۔ ان کا نظام یا عقیدہ کیا ہے' اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔۔

آج بھی جشن کی رات تھی۔۔
یہ رات جشن کی کیوں تھی؟

آج 9 مئی کو۔۔ سوویت یونین کے استقلال کے سامنے نازی جرمنی کی قہر انگیز سپاہ نے اپنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔۔ سواستیکا کے پرچم سرنگوں کر دیے تھے۔۔
اور روسی ان سرنگوں پرچموں اور ہتھیاروں پر اپنے ڈھائی کروڑ ہم وطنوں کا خون دیکھتے تھے جو دوسری جنگ عظیم کے میدانوں اور لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ کے محاصروں میں مارے گئے۔۔

جس روز سوویت یونین نے نازی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو اس لمحے ونسٹن چرچل غسل خانے میں تھا اور یقیناً نہایت پریشان حال غسل کر رہا تھا کہ انگلستان اور اس کے مفتوح ہو چکے اتحادی اپنے سامنے شکست دیکھ رہے تھے۔ اسے خبر کی گئی تو شنید ہے کہ وہ اسی حالت میں غسل خانے سے باہر آ گیا اور چیخنے لگا کہ اب روسی ریچھ نازی جرمنی میں اپنے پنجے گاڑ دے گا۔۔ ہم جنگ جیت جائیں گے۔۔

روسی ریچھ اس جنگ میں شامل نہ ہوتا تو آج نہ انگلستان ہوتا اور نہ یورپ۔۔ وہاں نازی

راج کر رہے ہوتے.. امریکی تو اس جنگ میں پکنک منانے کے لیے آئے۔ صرف ایٹم بم چلانے کے لیے آئے اور چلے گئے..

آج 9 مئی کو ہٹلر کے دارالسلطنت برلن میں کھنڈر ہو چکی رائخ سٹاگ یا پارلیمنٹ کے سب سے اونچے اور شکستہ ہو چکے بُرج پر تین روسیوں نے سرخ پرچم لہرا کر دوسری جنگ عظیم کا اختتام کر دیا تھا.. اور ان میں سے ایک مسلمان سپاہی بھی تھا.. ازبکستان یا تاتارستان کا.. کہ اس جنگ عظیم میں روس کے زیرنگیں مسلمان ریاستوں کے لاکھوں سپاہی بھی برسرپیکار تھے.. اگرچہ وہ اپنی مسلمانی کب کی فراموش کر چکے تھے یا انہیں فراموش کروا دیا گیا تھا اور اب وہ صرف سرخ فوج کے سرخ سپاہی تھے..

عہد رفتہ میں.. سکول کے زمانوں کی بات ہے جب شہر لاہور کے پلازہ سینما میں ''فال آف برلن'' نام کی ایک روسی فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی.. اور اہل لاہور جوق در جوق یہ فلم اس لیے دیکھنے گئے کہ اشتہاری مہم میں یہ ترغیب دی گئی تھی کہ ''آئیے اور ایک مسلمان سپاہی کو برلن پر فتح کا پرچم لہراتے ہوئے دیکھیے۔''

اور یہ وہی دن تھا..

اور جب مارشل ژوکوف نے کئی ہزار بھاری توپوں کو برلن شہر پر کھول دیا تھا اور ''رائز اینڈ فال آف تھرڈ رائخ'' کے مصنف شیرر کے بقول ژوخوف کی توپوں سے داغے ہوئے گولے جب کسی جنگل میں گرتے تو اس کے ہزاروں درخت اوندھے ہو جاتے اور جب کسی آبادی پر برستے تو ہر شے ملیامیٹ ہو جاتی.. ژوخوف اور اس کی سرخ فوج نازیوں سے لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ میں مارے جانے والے کروڑوں روسیوں کی موت کا بدلہ لے رہے تھے..

تو یہ وہی دن تھا..

اور میں آج ہی کے دن ہزاروں مسرت اور خوشی سے اُبلتے روسیوں کے ہمراہ فتح کے دن کی خوشی میں سرخ چوک میں آتش بازی کا جو مظاہرہ ہونے والا تھا اسے دیکھنے آیا تھا..

لیکن میں سرخ چوک میں داخل نہ ہو سکا تھا..

کہ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور اس میں داخل ہونے والے تمام راستوں پر پولیس اور فوج تعینات تھی.. وہاں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی تو آپ کیسے دھرے جا سکتے تھے۔ اس لیے یہ حفاظتی اہلکار تمام راستے روکے کھڑے تھے.. میں نے ایک خوشامدانہ سی گزارش کی کہ میں پاکستانی

ہوں.. ایک ادیب اور صحافی ہوں.. بہت دور سے آیا ہوں.. لیکن وہاں تو مجھے ایسے ہزاروں مجھ سے بھی دور سے آئے تھے تاکہ اس جشن کی کیفیت اپنے ناظرین اور قارئین کو پہنچائیں اور ان کو بھی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

چنانچہ میں سرخ چوک کے باہر ان کے عین سامنے گورکی سٹریٹ میں کھڑا آتش بازی کے آغاز کا منتظر تھا۔

اور وہاں وہ میرے زمانوں کی گورکی سٹریٹ بھی وہ نہ رہی تھی.. تغیر کی زد میں آ کر تورسکایا سٹریٹ ہو چکی تھی..

اور میں تنہا نہ تھا..

میمونہ بھی میرے ساتھ تھی..

اور تب جو جشن کی رات تھی وہ آج کی رات سے یوں جدا تھی کہ اس روز ''نوجوانوں کے بین الاقوامی میلے'' یعنی یوتھ فیسٹیول کا آغاز ہوا تھا اور وہ رات اس میں شامل ہزاروں نوجوانوں کی آمد کی خوشی میں جشن کی رات تھی..

اور تب.. میرے ہمراہ تین نقاب پوش لڑکیاں اور ''فاختہ'' تھی.. میمونہ نہ تھی.. اور وہ بھی کیا دن تھے۔

''چیچی'' کے آغاز کی مانند دن..

''یہ بھی انہی دنوں کا قصہ ہے' جب نوخیز جسم سرحدیں عبور کرتا ہے' اولین تجربوں اور محبتوں کی کسک سے خائف بھی رہتا ہے اور اس کا لُوں لُوں ان کی خواہش بھی کرتا ہے۔ وہ اُن گرم اور رستے احساسات کی بخار آلود دُھند میں ہر منظر' ہر بدن کے اندر جانا چاہتا ہے۔ یہ وہی دن تھے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر لڑکی راج ہنس دکھائی دیتی ہے اور چیچی تو تھی ہی راج ہنس.. وہ مجھے پتہ نہیں کیا دکھائی دی۔''

بس یہ انہی دنوں کا قصہ ہے جب میں پہلی بار ماسکو آیا تھا.. یہاں منعقد ہونے والے یوتھ فیسٹیول میں برطانوی وفد کے ایک پاکستانی ممبر کی حیثیت سے میں پہلی بار ماسکو آیا تھا..

جب سوویت یونین جو تقریباً آدھی دنیا پر محیط تھا' اس کے گرد ایک آئرن کرٹین تھا.. ایک آہنی پردہ تھا جس کے پار کوئی نہ جا سکتا تھا لیکن میں گیا..

لندن کے وکٹوریہ سٹیشن سے اس طویل سفر کا آغاز ہوا اور پھر مسافر تو وہی رہے البتہ

تقریباً ہر ملک کی سرحد پر ٹرین بدلتی رہی اور اس کے ساتھ زبان بدلتی رہی.. بلجیم اور مغربی جرمنی میں سے تو میرے پاکستانی پاسپورٹ نے گزارا اور پھر جب کمیونسٹ دنیا کا آغاز ہوا اور ہم مشرقی جرمنی میں داخل ہوئے تو ہمیں سوویت یونین کی حکومت کی جانب سے جاری کردہ خصوصی اجازت نامے جاری کر دیے گئے جو ہمیں مشرقی جرمنی سے پولینڈ اور پھر روس تک لے گئے.. شاید اب بھی کہیں یادگاروں کے ڈھیروں میں وہ روسی پاسپورٹ موجود ہو جس پر روسی زبان میں میرے کوائف نہایت نستعلیق خط میں لکھے تھے اور اس پر ایک غصیلے سے نوجوان کی تصویر چسپاں تھی..

کمیونسٹ بلاک پوری دنیا سے پوشیدہ اور پردہ پوش تھا' اس میں داخل ہونا تو کیا کوئی اس میں جھانک بھی نہیں سکتا تھا.. اور ہم باہر کی دنیا کے وہ پہلے نوجوان تھے جو اس کے اندر گئے اور پولش اور روسی عوام جو رابطوں کے لیے ترسے ہوئے تھے' باہر کی دنیا کی ایک جھلک ہمارے چہروں پر دیکھنا چاہتے تھے امڈ امڈ کر ہمیں ملنے کے لیے آئے.. جہاں کہیں گاڑی رکتی' وارسا یا منسک میں وہاں سٹیشنوں پر ہم سے ملاقات کے تمنائیوں کا اتنا ہجوم ہوتا اور اتنا بڑا اور گاڑھا ہوتا کہ ہم اپنے ڈبوں سے باہر نکلنے سے جھجکتے.. اور لاؤڈ سپیکروں پر بھی اعلان ہوتا رہتا کہ پلیز اپنے ڈبے سے دور نہ جائیے گا.. ورنہ آپ ہجوم میں کھو سکتے ہیں اور ٹرین میں دوبارہ سوار ہونے سے رہ سکتے ہیں..

اور یہ کون لوگ تھے.. ہر سٹیشن پر ہزاروں کی تعداد میں پُراشتیاق اور محبت بھرے چہرے لیے ہوئے.. ہم جیسے معمولی برطانوی' پاکستانی' امریکی اور افریقی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے ملاقات کرنے کی چاہت میں مبتلا اور بیتاب..

یہ پسے ہوئے نادار اور ذلتوں کے مارے لوگ تھے' ایک بہتر مستقبل ایک سرخ سویرے کے خواب میں فیکٹریوں اور کھیتوں کھلیانوں میں ہلکان ہوتے ہوئے اور یہ ناداری اور ذلت ان کے چہروں پر ایک بیچارگی کی صورت نقش تھی.. اُن کے لباس ہماری نسبت جو مغرب سے آئے تھے' معمولی اور کھردرے تھے' ان کے جوتوں نے پالش کی شکل کبھی نہ دیکھی تھی۔ اگرچہ وہ اس ملاقات کے لیے اپنے بہترین پہناووں میں آئے تھے.. پر اُن سب کے چہرے اُلفت اور تجسس کے ایسے چراغوں کی مانند روشن ہوتے تھے جنہیں کچھ پروا نہ تھی کہ اُن کا تھوڑا سا تیل یوں بھڑکنے سے ختم ہو جائے گا اور وہ بجھ جائیں گے.. اور اُن کے ہونٹوں پر جو بے اختیار

مسکراہٹیں تھیں ایسی تھیں جیسے ہم اُن کے مدت سے بچھڑے ہوئے قریبی رشتے دار ہیں' بھائی' بیٹے اور بہنیں ہیں۔

کم مائیگی اور ناداری کے باوصف اُن ہزاروں میں شاید ہی کوئی ایک بوڑھا' نوجوان یا بچہ ایسا ہو جس کے ہاتھوں میں ہم مسافروں کے لیے کوئی ایک تحفہ نہ ہو..

کچھ نہیں تو ایک پھول..

ایک پکچر پوسٹ کارڈ..

کوئی سرخ ستارہ کوٹ کے کالر پر آویزاں کرنے کے لیے..

ایک بچی اپنے بالوں میں سے ربن اُتار کر کہہ رہی ہے' پلیز پلیز۔

ایک بوڑھی اگرچہ توانا بدن کی عورت اپنے سر پر بندھے بوسیدہ رومال کو کھول کر میرے گلے میں ڈال رہی ہے اور وہ گورکی کی ''ماں'' کی شباہت لیے ہوئے تھی۔

اور پھر خوراک.. کاغذ میں لپٹا ایک سینڈوچ.. بھنے ہوئے دانے.. کچھ نہیں تو ایک ڈبل روٹی کہ رستے میں بھوک لگے تو کھا لینا.. اگرچہ ہمیں اس سفر کے دوران نفیس ترین خوراک مہیا کی جاتی تھی..

اور یہ صرف میں نہ تھا' اُس ٹرین میں سوار سینکڑوں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر اسی نوعیت کی محبت نچھاور کی جا رہی تھی.. البتہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی عنایت کی جا رہی تھی کہ میری رنگت سانولی تھی' وہ مجھے ہندوستانی سمجھتے اور ہاتھ جوڑ دیتے اور میں اپنی شرٹ پر ٹانکے ہوئے پاکستانی پرچم کی جانب اشارہ کر کے ''پاکستان۔ پاکستان'' کہتا تو وہ اور بھی مہربان ہو جاتے۔ بے شک اُن زمانوں میں پاکستان اُن کا جانی دشمن تھا اور سوویت یونین بھی پاکستان کو بوجوہ دوست نہ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح امریکہ کی گود میں بیٹھا انگوٹھا چوس رہا تھا اور پشاور کے قریب بڈابیر کے امریکی اڈے میں متعدد ایسے ایٹمی میزائل نصب تھے جن کا رُخ سوویت یونین کے بڑے شہروں کی جانب تھا اور اُس عہد کا سب سے بڑا سیاسی اور جنگی سکینڈل رونما ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ جب امریکی پائلٹ گیری پاورا اپنے یوٹو جہاز میں سوار اسی پاکستانی اڈے سے اُڑان کر کے سوویت یونین کی فضاؤں پر پرواز کرتا جاسوسی کرتا مار گرایا گیا تھا.. اور نکیتا خروشچوف نے بیان دیا تھا کہ میں نے سب سے پہلا سُرخ دائرہ پشاور کے گرد لگایا ہے کہ جنگ کی صورت میں سب سے پہلا ایٹم بم اس پر گرایا جائے گا.. اور اتنی مخاصمت کے باوجود وہ یہ جان کر کہ میں پاکستانی ہوں' مجھ پر

زیادہ مہربان ہو جاتے۔

ان ہزاروں بوڑھوں اور نوجوانوں کو مجھ سے کچھ پرخاش نہ تھی' شکایت یا بیگانگی نہ تھی اور وہ مجھ سے لپٹے جاتے تھے.. میرے رخسار گیلے ہو جاتے اور اس گیلاہٹ کا سبب اُن کے بوسے بھی تھے اور آنسو بھی..

آخر ایسی شدت جذبات کی دیوانگی کیوں؟

بے شک وہ باہر کی دنیا سے آئے ہوئے مسافروں کے چہروں کو زندگی میں پہلی بار دیکھنے سے جذباتی ہو رہے تھے لیکن سبب صرف یہ نہ تھا.. وہ امن کے لیے آئے تھے..

یہ وہ زمانے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کے بارود کی بُو ابھی ہواؤں میں تھی..

جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی قبروں کی مٹی اگر انہیں قبریں نصیب ہوئیں تو.. ابھی تازہ تھی اور اُن کے غم بھی تازہ تھے۔ ابھی کچھ برس ہی تو گزرے تھے اور یہ لوگ سب کے سب جنگ کے مارے ہوئے تھے' یہ سب نامکمل تھے۔ اس لیے کہ جنگ اُن کے بیٹوں' بھائیوں اور باپوں کو کھا گئی تھی۔ کوئی ایک خاندان ایسا نہ تھا جو اُجڑا نہ ہو.. اور وہ یہ اظہار کرنے کی خاطر آئے تھے کہ ہمارے تین کروڑ پیارے جنگ میں خاک ہوئے تو ہم جانتے ہیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے تو تم نوجوان ہو' آئندہ کے فیصلے تم نے کرنے ہیں تو جنگ دوبارہ نہ ہونے دینا.. اس دنیا میں امن قائم رکھنا۔

سٹیشنوں پر منتظر ہجوم ہمیں یہی پیغام دینے آئے تھے.. اب جنگ نہ ہونے دینا..

ہم پاکستانیوں کو ایک اصل جنگ کی ہولناکیوں' وحشتوں اور ہلاکتوں کا کچھ شائبہ نہیں کہ ہم نے ایک نہایت رومانوی 1965ء کی جنگ لڑی.. جو ہوا سرحدوں کے آس پاس دس میل اِدھر دس میل اُدھر ہوا اور جنگ نے شہری آبادیوں کا رُخ نہ کیا۔ اس لیے تو لاہور کے آسمان پر جب ڈوگ فائٹس ہو رہی تھی تو "زندہ دلان" اپنے کوٹھوں پر کھڑے اُن کو داد دے رہے تھے کہ اُن کے لیے یہ ایک کھیل تھا۔ اُن کے صحن میں اگر کوئی ایک ہزار پاؤنڈ وزنی بم گرتا تو وہ جان جاتے کہ یہ ایک کھیل نہیں ہے..

ذرا تصور میں لائیے کہ اگر لاہور کے قدیم شہر پر ہزاروں بم گرائے جاتے.. پشاور۔ کراچی۔ اسلام آباد کھنڈر ہو جاتے اور کل آبادی کا تیس فیصد حصہ ہلاک ہو جاتا اور یہ جنگ صرف سترہ دن نہیں برسوں چلتی اور بھوک اور پیاس بھی ہلاک کرتی تو کیا کچھ رومان باقی رہ جاتا اور

1971ء کی جنگ تو یوں بھی بہت دور ہندوستان کے پار جانے کس جہان میں لڑی جا رہی تھی اور نظریہ پاکستان کی سربلندی اور اسلام کے دفاع کی خاطر لڑی جا رہی تھی اور اس دوران معمول کی زندگی جاری وساری رہی.. ہمارے ٹائیگر یہ کہتے رہے کہ ڈھاکہ میں داخل ہونے والے ہندوستانی ٹینک میری لاش پر سے گزریں گے.. اور پھر پلٹن میدان میں مسکراتے ہوئے جنرل اروڑا کی خدمت میں اپنا ریوالور پیش کر دیا اور یوں نوے ہزار غازیوں کو بچا لیا۔ چنانچہ ہم پاکستانی جان ہی نہیں سکتے کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔

یہ صرف ملی ترانے نہیں ہوتی..

جنگ کو صرف روسی جان سکتے تھے.. جن کے تین کروڑ افراد ملیامیٹ ہو گئے اور جن کے بیشتر شہر کھنڈر ہو گئے..

اس سفر کے دوران منسک کے سٹیشن پر مجھے ایک آبدیدہ بوڑھا ملا تھا.. منسک وہ شہر ہے جس کا ایک مکان بھی جرمن بمباری سے سلامت نہ رہا تھا۔ سارا شہر کھنڈر ہو گیا تھا اور پورے روس میں کہا جاتا تھا کہ اگر منسک میں رہنے والے کسی ایک خاندان کا اگر صرف ایک فرد زندہ رہ گیا ہے تو اُسے دیکھنا چاہیے۔

"اچانک میری نگاہ ہجوم سے پرے ایک باریش کھڑے بوڑھے پر پڑی جو لکڑی کی کھڑکی کا سہارا لیے ٹکٹکی باندھے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہماری نظریں ملیں' وہ تیزی سے چلا اور لوگوں کو چیرتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا.. وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا اور پھر یکلخت مجھے گلے لگا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ میرے گالوں اور پیشانی پر شفقت سے بوسے دیتا اور پھر لپٹ کر رونے لگتا.. پاس کھڑی لڑکی نے رُوسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا... میرے پانچ نوجوان بیٹے تھے' بلند ترین پہاڑوں سے بھی قد میں نکلتے ہوئے' اُن کے سینے مادرِ وطن رُوس سے بھی وسیع تھے.. کاکیشیا کی حسیناؤں سے بڑھ کر خوبصورت.. وہ پانچوں دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے ہاتھوں مارے گئے.. تم ہو بہو میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی مانند ہو۔ تم ہی میرے بیٹے ہو۔ بیٹے' دنیا کی باگ ڈور اب تمہارے جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے.. یاد رکھنا جنگ سے آج تک کوئی مسئلہ طے نہیں ہوا صرف لاکھوں کروڑوں نوجوان لاشے بن جاتے ہیں.. نوجوان بیٹے جو برسوں کی محنت اور محبت سے پلتے ہیں اور لاشے جو دو دن میں گل سڑ جاتے ہیں' میرے بیٹے جنگ بہت ہولناک چیز ہوتی ہے۔ میں نے اس

کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔ میری ایک درخواست ہے.. میں تمہارا باپ ہوں.. کبھی جنگ نہ ہونے دینا۔ اپنے ہونے والے بیٹوں کی خاطر دنیا کو ہمیشہ جنگ سے بچائے رکھنا۔"

("فاختہ")

ماسکو... آج سے پچاس برس پیشتر کا ماسکو.. ہم انگلستان سے آنے والوں کے لیے ایک عجیب اجڑا اجڑا ویران سا شہر تھا.. اگرچہ بہت کھلا اور وسیع سا لگتا تھا..

بیکار سا لگتا تھا..

پورے شہر میں کہیں بھی.. کسی گلی کوچے کسی در و دیوار پر.. یہاں تک کہ زیر زمین ریلوے کے شاہانہ سٹیشنوں پر بھی کوئی ایک بھی اشتہار نہ تھا.. کوئی بل بورڈ کوئی بجھتا بجھتا نیون سائن نہ تھا..

نہ کہیں شراب خانوں کی رونق تھی اور نہ کسی نائٹ کلب کی رنگینیاں..

پھر یہ بھی خبر ملی کہ بدن فروشی کا بھی رواج نہیں بلکہ یہ ایک بڑا جرم ہے..

خاصا شرعی اور مذہبی قسم کا ماحول تھا اگرچہ.. وہاں مذہب کو افیون گردانا جاتا تھا..

اُدھر اہل ماسکو کے لباس بھی نہایت ڈھیلے ڈھالے بے رُوح اور دیہاتی قسم کے تھے..

ہم قدرے مایوس ہوئے کہ کمیونسٹ جنت یہ ہے..

کہ ہم مغرب کی سرمایہ دارانہ جس جنت سے آئے تھے وہاں تو یہ تمام بہشتی زیور موجود تھے.. ہر جانب کھیل تماشا اور ہلا گلا تھا اور کیسی کیسی رُوح پرور رونقیں تھیں..

ہم قدرے نہیں بہت مایوس ہوئے..

ماسکو پہنچتے ہی برطانوی وفد میں شامل پاکستانیوں نے اپنے راستے الگ کر لیے.. فیصلہ ہوا کہ ہم ایک پاکستانی وفد کے طور پر اپنی شناخت کروائیں گے.. پاکستان کی نمائندگی کریں گے بے شک پاکستان کے وزیراعظم نے ہم ماسکو جانے والوں کو غدار قرار دیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ پاکستان واپسی پر ہمیں کراچی ایئرپورٹ سے سیدھا میانوالی جیل لے جایا جائے گا لیکن اس کے باوجود ہم ایک پاکستانی وفد کی صورت یوتھ فیسٹیول میں شرکت کریں گے..

ان بے راہرو نوجوانوں میں میاں افتخار الدین کا بیٹا عارف افتخار بھی شامل تھا جو اُن دنوں شاید کیمبرج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا.. آئی آئی چندریگر کا ایک بیٹا تھا یا کوئی عزیز.. فیروز خان

نون کا بھتیجا خالق داد نون تھا.. گورا چٹا دراز قد ملک سعید حسن تھا جو بعد میں ہائی کورٹ کا جج ہوا اور جس کی ہمشیرہ سے میرے شفیق الرحمٰن نے شادی کی۔ مانچسٹر کا ایک کٹر کمیونسٹ آزاد تھا.. مشرقی جرمنی سے آنے والا اسد اللہ تھا جس نے بعد میں منٹو پر تحقیقی کام کیا.. یہ سب انقلاب کے ڈسے ہوئے لوگ تھے.. اور میں ان سب میں سے کم عمر تھا اور ابھی ڈسے جانے کے لائق نہ تھا' اگرچہ مجھ پر اثر ہو چکا تھا..

قابل فہم طور پر ابھی ایک نیا اور بنگالیوں سے پاک اسلامی پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا اور وہاں کچھ مشرقی پاکستانی لڑکے بھی تھے.. اور ایک لڑکی تھی.. یہ بہت دھان پان سی ایک ساڑھی میں ملبوس لڑکی تھی جو سحر بنگال کی نمائندہ تو نہ تھی پھر بھی غنیمت تھی کہ ایک لڑکی تھی جو پاکستانی خواتین کی نمائندگی کرتی تھی.. ہم اُسے بینت بینت کر رکھتے اور اُس کی مدارات میں کچھ کسر اُٹھا نہ رکھتے.. اور دعوتوں میں استقبالی تقاریر کے بعد جوابی تقریر کے لیے اُسے ہی سٹیج پر بھیجتے.. جانے اب وہ کہاں ہوگی.. اگر 71ء میں ہلاک نہ کر دی گئی ہو تو وہ ایک بنگلہ دیشی کے طور پر اُن دنوں کو کیسے یاد کرتی ہوگی جب وہ رُوس میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے اُس وطن کے گیت گایا کرتی تھی..

اس دوران میری دوستی طارق علی سے ہوگئی جو کراچی کا باسی تھا۔ اُس کی والدہ امریکی تھیں اور والد صاحب ٹھیٹھ پنجابی.. ایک فرنچ کٹ شرارتی سی داڑھی میں.. قد کاٹھ' شکل وصورت اور رنگت سے وہ عام امریکیوں سے زیادہ امریکی دکھائی دیتا تھا اور جب رُوسی اُسے حیرت سے پوچھتے کہ آپ پاکستانی ہو.. تو وہ مسکرانے لگتا "ہاں تو اور کیا.. ہم سب پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہیں.. یہ جو میرا دوست ہے مستنصر تو اس کی رنگت کے لوگ تو ہمارے ہاں کم کم ہوتے ہیں ورنہ سب پاکستانیوں کی آنکھیں میری طرح نیلی ہوتی ہیں.."

ہم دونوں کا گٹھ جوڑ ہو گیا..

اگرچہ وہ مجھ سے عمر میں خاصا بڑا تھا اور کہیں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا لیکن ہمارے درمیان دوستی کا ایک ایسا رشتہ استوار ہو گیا کہ ہم بقیہ وفد سے ذرا الگ تھلگ ہو گئے..

یعنی جب وفد کے دیگر اراکین جو کمیونزم کے بارے میں بہت پر جوش تھے' کسی سٹیل مل یا کسی اجتماعی فارم کو دیکھنے اور سوویت یونین کی ترقی کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے نکل جاتے ہم دونوں ہوٹل ذولوتوی کولس میں سوتے رہتے..

اور ہم تب تک سوتے رہتے جب تک کوئی ہمیں جگانے نہ آتا..

اور ہمیں جگانے کون آتا..

کم از کم تین رُوسی دوشیزائیں..

دو نوجوانوں کو جگانے کے لیے تین دوشیزائیں کیسے آ سکتی ہیں..

طارق ایک مسحُور کر لینے والی ایسی شخصیت کا مالک تھا جس نے اپنی خوش شکلی اور رکھ رکھاؤ اور زندہ دلی سے آکسفورڈ یونیورسٹی کی اکثر کنیاؤں کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی..اگرچہ بنیادی طور پر وہ ایک شریف نوجوان تھا..اب اگر وہ ماسکو میں آ گیا تھا تو یہاں تسخیر کے امکانات کا کچھ حساب نہ تھا.. بے شک اس میں تجسس اور میزبانی کے عوامل شامل تھے..تو ایک اُسی کے قد وقامت کی..یعنی دراز قد اور میری عمر کے مطابق کچھ زیادہ ہی بھری بھری روسی لڑکی اُس کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی اور روسی لڑکیاں جب بھرتی ہیں تو بہت ہی بھرتی ہیں اور پھر چار پانچ برسوں میں اپنی بھرت کے باعث بدہیئت اور موٹی ہو جاتی ہیں۔

اب رہا میں..میں تو کسی شمار قطار میں نہ تھا لیکن ایک اجنبی تو تھا..اور ماسکو میں یہی کافی تھا..ایک شام جب میں ہوٹل لوٹتا تھا تو دریائے ماسکو کے ایک پُل پر دو لڑکیوں سے راستہ پوچھا تو وہ بخوشی میرے ساتھ چل دیں کہ ہم آپ کو چھوڑ آتی ہیں..وہ بھی تجسس کی ڈور میں بندھ گئیں اور میں اُن کی زندگی میں پہلا پاکستانی تھا..وہ قریب آئیں اور پھر دور نہ ہوئیں..

اور وہ دونوں انگریزی کا ایک حرف نہ جانتی تھیں..

جب کہ میں رُوسی کے بہت سے حرف جانتا تھا..میں نے یہاں آنے سے پیشتر چھ ہفتوں کا رُوسی زبان کا ایک کریش کورس کیا تھا جس کے نتیجے میں میں نہایت آسانی سے رُوسی پڑھ تو سکتا تھا بے شک زیادہ سمجھ نہ سکتا تھا..اور کم از کم اس قابل ہو گیا تھا کہ رُوسی زبان میں ''رُوس پاکستان دوستی زندہ باد'' کے نعرے لگا سکوں اور نزدیک ترین ٹائلٹ کا راستہ دریافت کر سکوں..

چنانچہ یہ تینوں لڑکیاں..اور یاد رہے کہ ہم بھی لڑکے ہی تھے..تو یہ تینوں ہم دونوں کو تقریباً گیارہ بجے صبح جگانے کے لیے پہنچ جاتیں..

اور ان تینوں میں سے کم از کم دو تو ایسی تھیں جو ہر خوابیدہ شے کو جگانے پر قادر تھیں..ہم ہمہ تن بیدار ہو جاتے..

تانیا ایک گھنگھریالے بالوں والی لَم ڈھینگ سی لڑکی تھی اور اُسے کارل مارکس ازبر تھا..

اُدھر لینا ایک مختصر قد کی جسے ذرا رومانوی ہو کر بُوٹا سا قد کہا جا سکتا ہے..لڑکی تھی اور اُسے کچھ بھی ازبر نہ تھا' پر وہ یہ جانتی تھی کہ کوئی بھی لڑکا جو اس پر ایک نظر ڈال لے گا تو وہ اُسے ازبر ہو جائے گی..

لینا کی قامت اگر صرف ایک بالشت اور ہوتی تو وہ قیامت ہوتی..

قیامت تو وہ اب بھی تھی پر ذرا ٹھگنی سی قیامت تھی..وہ کسی دودھیا گنج کی زمین میں پیوستہ وہ جھاڑی لگتی تھی جس نے بلند ہونے کی بجائے اِدھر اُدھر پھیل جانا اور بھرا بھرا ہونا زیادہ پسند کیا تھا..شاید اسی وجہ سے وہ مختصر قد کی لگتی تھی اگرچہ وہ اتنی مختصر نہ تھی..اُن زمانوں کی بے ڈھب روسی لڑکیوں کی نسبت اُس کے بدنی خدوخال میں ایک ایسی کوملتا اور کشش تھی جو اُس کے پاس سے گزرتے لوگوں کو مُڑ کر اُسے دیکھنے پر مجبور کر دیتی..

اُدھر تانیا نے بھرنے بھرانے پر کچھ دھیان نہ دیا تھا اور بڑھتی گئی تھی..

وہ ایک دانش مند رُوح تھی اور پہلے دن سے یہ جان گئی تھی کہ مجھے پس منظر میں چلے جانا چاہیے..لینا کی موجودگی میں کوئی نظر مجھ پر تادیر نہ ٹھہرے گی۔

ویسے لینا ایک خاموش طبع لڑکی تھی اور وہ میری جانب دیکھتی رہتی تھی اور پھر میرا ہاتھ تھام کر روسی میں جانے کیا کیا کہتی رہتی..

میں اُسے رات گئے اُس کے سٹوڈنٹ ہوسٹل چھوڑنے جاتا..

اُس کے اندر روسی کردار کی ایک خاص آزردگی اور اداسی تھی..اور اس کے اظہار کے لیے کسی زبان کی نہیں صرف جذبوں کی ضرورت ہوتی ہے

اگرچہ میں اب بھی بہت کچھ نہیں جانتا لیکن اُن دنوں انگلستان میں قیام کے باوجود میں شراب کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ ام الخبائث ہے اور اسے پی کر انسان ''داغ'' فلم کے دلیپ کمار کی مانند ''اے مرے دل کہیں اور چل'' گانے لگتا ہے یا سلیم رضا کی آواز میں ''یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں'' الاپتا ہوا کسی گندی نالی میں گر جاتا ہے..

باقاعدہ شراب سے میرا پہلا تعارف پروفیسر جی ایم اثر کے بیٹے جاوید اثر نے کروایا..وہ میرے ایسے چند بھولے بھالے بچوں کو اپنے والد صاحب کے کمرے میں لے گیا اور بہت خفیہ طریقے سے..ایک الماری میں پوشیدہ بوتل نکال کر اُس کا ڈھکن کھولا اور اُسے سونگھا اور ایک بُرا سا منہ بنایا اور پھر اپنی ہتھیلی پر چند قطرے گرا کر اُنہیں دوبارہ سونگھا' پھر چکھا اور پھر بہت ہی بُرا سا منہ بنا لیا..

یار یہ تو بہت کڑوی ہے.. کون چکھے گا.. پر کسی نے ہامی نہ بھری اور وہ اپنی ہتھیلی پر لرزاں چند سرخ قطروں کو خود ہی چاٹ گیا اور کہنے لگا کہ یار یہ تو بہت ہی کڑوی ہے.. اور پھر غسل خانے میں جا کر دیر تک غرارے کرتا رہا..

انگلستان میں وارد ہوا تو وہاں دائیں بائیں ہر جانب شراب خانہ خراب اور شراب خانے تھے.. معلوم ہوا کہ صرف ایک شراب نہیں ہوتی' شرابیں بہت سی ہوتی ہیں..

لیکن اصل آگہی سوویت یونین جا کر ہوئی کہ وہاں واڈ کا نام کی ایک سفید شراب تھی جو ہر مرد و زن کی محبوب تھی اور جسے سب روسی اُن ہولناک سردیوں کو جنہیں نپولین اور ہٹلر بھی نہ جھیل سکے' اُنہیں جھیلنے کے لیے اور زندگی کی سختیوں' ازلی مایوسیوں اور اداسیوں کو سہہ جانے کے لیے دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں..

شراب سے.. الکوحل سے دل کو بھی اور جان کو بھی بہت سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اور وہ پھر بھی اسے جان و دل سے عزیز رکھتے ہیں..

ہم جہاں جاتے وہاں واڈ کا کا سفید جن بوتل سے باہر آ جاتا کہ آؤ بھگت کے لیے یہی طور طریقے تھے.. جو شغف رکھتے تھے اُنہیں یہ جن ایک پری دکھائی دیتا یہاں تک کہ اُنہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا.. مجھے بھی مائل کیا جاتا کہ تم جو ابھی تک ایک کچے بچے ہو واڈ کا کی آگ میں فوراً پک جاؤ گے' پر میں تب تو اجتناب کرتا رہا کہ کچے پکے سو میٹھا.. یوں یکدم پک جانے سے تو کڑوا ہو جانے کا خدشہ ہے..

ہم جب کبھی ماسکو سے باہر جاتے.. دریائے ماسکو میں رواں ایک سٹیمر پر سوار ہو کر شہر کے باہر برچ کے کسی جنگل میں جاتے یا کسی اجتماعی فارم میں دن گزارتے تو پیداواری اعداد و شمار کی اُکتا دینے والی تفصیل سنتے' کسانوں کی اکتوبر انقلاب کے بعد بہتر حالت پر لیکچر سنتے اور پھر کسی کھلی فضا میں کھانے پینے کا اہتمام ہوتا.. بلکہ اہتمام دراصل پینے کا ہوتا' کھانا محض سجاوٹ کے لیے ہوتا..

روسی تو واڈ کا کو آمیزش کے بغیر جیسا کہ دستور ہے' اپنے حلق میں اُنڈیلتے جاتے اور اُن پر کچھ خاص اثر نہ ہوتا جب کہ ہمارے وفد کے کچھ ارکان دنیا بھر کے مزدوروں سے یک جہتی اور کمیونسٹ نظام کی برکتوں کے جام مسلسل پیتے پہلے تو عمودی حالت میں ہوتے اور پھر متوازی ہو جاتے۔ ایک خود کار نظام کے تحت.. ایک دو تو نروان کی اُس مدہوشی میں چلے جاتے کہ اُنہیں

کندھوں پر اُٹھا کر جنازے کی صورت کوچ تک لے جایا جاتا.. اور وہ وہاں پہنچتے ہی ہوشیار ہو جاتے اور اپنی اپنی زبان میں کہ وہاں اردو' پنجابی' سندھی اور بنگالی بولنے والے موجود تھے' گانے گاتے جاتے.. اور پھر سب کی زبان ایک ہو جاتی کہ کچھ پلے نہ پڑتا کہ کیا گا رہے ہیں۔ واڈ کا سے مخموران نوجوانوں کے ساتھ روسی میزبان بے حد اُلفت کے ساتھ پیش آتے اور ہنستے ہوئے اُن کی مدد کرتے جب کہ کچھ صرف مدہوش نہ ہوتے پچھلے روز کا کھایا پیا بھی اُگل دیتے.. تو ہمیں.. ہم جو ابھی کچے تھے پکے نہ تھے.. ہم جو ناواقف آداب شراب نوشی تھے ہمیں عجیب سا محسوس ہوتا کہ یہ روسی ایسی حرکتوں کا برا کیوں نہیں مانتے..

لیکن یہ تو اُن کی روایت تھی' اُن کی شناخت تھی کہ اگر واڈ کا پی کر ایک انسان لڑھک جائے تو کیا ہی خوش بخت ہے اُسے لڑھک جانے دو کہ یہی زندگی ہے..

کسی نے کہا تھا کہ روسی اپنے موسموں کی شدت اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم صرف اس لیے سہار گئے کہ اُن کے پاس واڈ کا تھی اگر یہ شراب نہ ہوتی تو روسی نہ ہوتے..

ہوٹل زولوتوئی کولس کے آس پاس جو سبزہ زار تھا وہاں وسیع سفید خیموں کے اندر سوویت یونین کی درجنوں ریاستوں کے خصوصی قومی کھانے سجے ہوتے.. اور ہم ظاہر ہے ازبکستان' تاجکستان' تاتارستان اور قزاقستان وغیرہ کے طعام کی خواہش کرتے.. اور وہاں درجنوں خوراکیں' ایسی تھیں کہ ہر خوراک پہ دم نکلے.. میں نے زندگی میں شاید ہی مسلسل اتنی بہتریں خوراکیں کھائی ہوں جتنی اُن دنوں کھائی تھیں.. اگرچہ بعد میں ایک احساس جرم نے پکڑ لی کہ ایک عام روسی کے نصیب میں تو ایک ڈبل روٹی' کچھ آلو اور کبھی کبھار گوشت کا ایک پارچہ ہے تو یہ ساری شاہانہ اور وافر خوراکیں اُس کا پیٹ کاٹ کر ہمیں مہیا کی گئی ہیں..

اگرچہ سارے بندوبست کمال کے اور بے مثال تھے پر غسل خانے حسب آرزو نہ تھے..

وہ کمروں سے منسلک نہ تھے.. برآمدوں میں تھے اور اگر غسل کرنے کا خیال ہو تو غسل خانے گراؤنڈ فلور پر تھے اور اجتماعی تھے..

پہلے روز ہی سفر کی تھکاوٹ اُتارنے کی خاطر غسل کا خیال آیا.. تولیہ کندھے پر ڈال کر

جانے کتنی منزلیں طے کر کے نیچے پہنچے.. ایک روسی خاتون سے پوچھا کہ بی بی غسل کی خواہش ہے تو کدھر جانا ہے.. اُس نے ایک مبہم سا اشارہ کیا کہ اُدھر جانا ہے۔ اُدھر پہنچے تو کچھ پہچان نہ ہوئی کہ دروازے پر کیا لکھا ہے۔ چنانچہ بے دریغ اندر چلے گئے اور وہاں ہر سُو وہ زمانے تھے جب بدن ڈھکنے کا رواج نہ تھا اور ہر کوئی قدرتی حالت میں زندگی کرتا تھا.. بلکہ کرتی تھی کہ میں خواتین کے حصے میں چلا آیا تھا.. اور وہ نہایت اطمینان سے درجنوں کی تعداد میں میرے نظریئے کے مطابق نہایت بے حیائی اور عریانی سے شاور فرما رہی تھیں.. اس منظر نے میرے کچے بدن اور جذبات پر نہایت ہی نامناسب اور ہیجان خیز اثر ڈالا.. میں نے تو تب تک کچی بات ہے لڑکیوں کا کچھ بھی نہ دیکھا تھا.. یہ وہ زمانے تھے کہ اگر شلوار ذرا سی اُٹھی ہوتی تو ہم ٹخنوں پر ہی عاشق ہو جاتے تھے۔ پوری لڑکی پر عاشق ہونے کا چنداں رواج نہ تھا.. اور اس اجتماعی عریانی پر مستزاد یہ کہ اُن روسی اور یورپی خواتین نے مجھ موئے مرد کو اپنے درمیان پا کر کچھ حیا نہ کی.. نہ ہاؤ ہو کی اور نہ ہی مجھے دفع دور ہونے کو کہا کہ گھر میں ماں بہن نہیں ہے بلکہ مجھے دیکھ کر چہلیں کرنے لگیں.. شکر ہے کہ میں نے ایک نیکر پہن رکھی تھی ورنہ اُن کی چہلیں جانے کہاں تک جاتیں..

بہر طور میں نے وہاں سے ایک ذلت آمیز پسپائی اختیار کی اور برابر کے اُس غسل خانے میں آ گیا جو مردوں کے لیے مخصوص تھا.. اور یہاں پاکستانی وفد کے کچھ معزز اراکین بھی اُسی حالت میں تھے کہ جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی کہ وہ سب بھی سرمد منصور کی مانند اپنے بدن کو نہ ڈھکتے تھے.. میں اُن میں شامل تو ہو گیا پر اپنی نیکر کو تھامتا ہوا شامل ہوا کہ کہیں کوئی اسے زبردستی اُتار نہ دے.. تو اُس حمام میں سب ننگے نہ تھے..

اسی نوعیت کا ایک اور دھچکا مجھے صنعتی نمائش کی سیر کے دوران لگا... وہاں ایک بار جب کچھ دباؤ بڑھا تو معلوم ہوا کہ ایسی حاجت کے لیے ٹریلرز کی صورت میں کچھ گشتی ٹائلٹ موجود ہیں.. اور جب میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ قطار اندر قطار درجنوں کموڈ ہیں جن پر براجمان روسی فراغت بھی فرما رہے ہیں اور مارکس اور لینن کا فلسفہ بھی زیرِ بحث ہے..

ایک ایسا دن تھا کہ ہم دریائے ماسکو کے وسیع اور ہموار پانیوں پر ایک قدیم وضع کے سٹیمر پر سوار شہر سے دور آ گئے جہاں آس پاس خاموشی تھی اور برچ کے سفید جنگل دریا میں

عکس ہوتے سٹیمر کے گزرنے سے پانیوں میں جو ارتعاش جنم لیتا تھا' اُس میں ہولے ہولے ڈولتے تھے..

کسی مقام پر ہم سٹیمر سے اُترے اور برچ کے جنگل میں دور تک چلے گئے.. برچ جو بلندیوں پر اُگنے والا ایک درخت ہے.. ماسکو کی ایک علامت ایک پہچان ہے..

جنگل کے اندر.. اگر ایک یبوست زدہ محاورہ استعمال کیا جائے تو وہاں جنگل میں منگل تھا۔ ایک پکنک کا اہتمام تھا اور اُس میں ہمارے علاوہ مختلف ممالک سے آئے ہوئے وفود بھی شرکت کر رہے تھے..

اور وہ دن فراموش کر دینے والا نہ تھا..

اگرچہ وہاں ہماری تفریحِ طبع کے لیے والی بال اور ٹیبل ٹینس کا بھی اہتمام تھا اور ہم میں سے جو کھیلوں میں دلچسپی رکھتے تھے اُنہوں نے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا لیکن تفریحِ طبع کے دیگر سامان بھی وافر مقدار میں تھے.. یہاں بھی حسبِ روایت دریائے ماسکو کے پانی تو کم تھے اور واڈ کا زیادہ تھی..

اور بہک جانے والے بہکتے بہکتے کسی ساتھی کے ہمراہ جنگل کے اندر چلے جاتے تھے..

اگرچہ میں نہ بہکا تھا پر ایک قدرے بے وقوف لگتی سنہری بالوں والی ڈینش لڑکی قدرے بہک گئی تھی.. مجبوراً اُس کی دیکھ بھال کرنی پڑی۔

اس بیان سے شاید یہ گمان گزرے کہ ہم ماسکو میں صرف تعیش کے دن گزارتے تھے اور ہمیں مخمور رنگینیوں میں ہی مبتلا رکھا گیا تھا. ایسا ہرگز نہیں ہے..

روسی عوام نے ہمارے دل موہ لیے.. ہم اُن کی معصومیت اور خلوص کے مداح ہو گئے..

ہم کمیونسٹ نظام کے تحت اُن کی اجتماعی ترقی، دوسری جنگِ عظیم کی بربادیوں میں سے سرخرو ہو کر نکلنے اور تقریباً پورے روس کو دوبارہ تعمیر کرنے کے معجزے سے آگاہ ہوئے.. اور اقوامِ عالم میں وہ جو ایک عزتِ نفس اور فخر رکھتے تھے' اُس سے شناسا ہوئے.. دنیا بھر کے نوجوانوں کو ماسکو میں مدعو کر کے اُن کی مدارات کر کے اُنہیں کمیونزم سے مرعوب کرنے کا منصوبہ روسی لیڈروں.. خروشچوف' بلگانن اور مکویان کا تو ہو سکتا تھا لیکن ایک عام روسی اس نوعیت کی سیاست سے بے خبر ہم پر صدقِ دل سے نچھاور ہوتا تھا..

اور یہ فراموش نہ کیجیے کہ اُن زمانوں کا سوویت یونین دنیا کی طاقتور ترین سرمایہ دارانہ قوتوں کے مدمقابل تھا۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود افریقہ اور ایشیا اور جنوبی امریکہ میں جہاں کہیں پسے ہوئے محکوم لوگ اپنی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھے تو یہ سوویت یونین اُن کی مدد کو پہنچتا تھا۔۔ بے شک کمیونزم کی ترویج کے لیے پہنچتا تھا لیکن مدد کو پہنچتا تھا۔۔ غلامی کے زخموں پر پھاہے رکھتا تھا۔۔

ایک محکوم اور خاک نشیں جس کے خون نے رزق خاک ہونا ہے اسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہاں سوویت یونین میں سٹالن اور دیگر لیڈر کیسے ہزاروں لاکھوں مخالفین کو سائبیریا بھیج رہے ہیں۔ چیچنیا کی کل آبادی کو ملک بدر کر رہے ہیں اور روسی عوام کو بمشکل ایک وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ اُسے تو صرف یہ تسلی تھی کہ اُس کی پشت پر ایک ہاتھ ہے۔۔ اور وہ اپنی جدوجہد میں تنہا نہیں ہے۔۔

ماسکو میں شاید وہ ہماری آخری شب تھی جب ادھیڑ عمر تمارا خانم نے ہمیں اپنے فلیٹ پر مدعو کیا۔ تمارا اُن زمانوں میں رقص کی ایک لیجنڈ تھیں۔۔ اُزبک ہونے کے ناطے سے وہ ہمیں عزیز رکھتی تھیں اور اردو سے بھی شناسا تھیں۔۔ اُن سے ملاقات تو کیا جب بھی وہ کسی تھیٹر میں رقص پیش کرتی تھیں تو اُس کے ٹکٹ کا حصول ناممکن ہو جاتا تھا۔ اُس شب اُنہوں نے پہلے تو ہمیں اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ازبک کھانے کھلائے اور پھر روایتی ازبک لباس پہن کر صرف ہمارے لیے کلاسیکی ازبک رقص پیش کیا۔ بیلے رقاصہ گالینا اولانووا کے بعد اگر میں کسی کے کمال فن سے متاثر ہوا تو وہ تمارا خانم تھیں۔۔

ایک عرصے تک ہمارے درمیان خط و کتابت رہی اور اردو میں رہی جس میں پاکستان کے بارے میں کیسی بے مثال چاہت تھی اور پھر یہ سلسلہ یکدم منقطع ہو گیا۔ وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔۔

میں لینا کو آخری بار ہوسٹل چھوڑنے گیا تو اُس نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ یہ رُوسی ان معاملوں میں سراسر مشرقی اور جذباتی تھے۔۔

ماسکو کے ریلوے سٹیشن پر رخصت ہوتے ہوئے ہمارے دونوں مترجم بھی ہم سے لپٹتے تھے اور بھوں بھوں کرتے روتے چلے جاتے تھے۔۔ اور وہاں بے شمار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہمیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے اور اُنہوں نے ہمارے ڈبے کو پھولوں سے بھر دیا۔۔

ہم جب ماسکو سے جدا ہو کر منسک اور مشرقی برلن میں چند روز گزارنے کے بعد بالآخر لنڈن کے وکٹوریہ سٹیشن پر اُترے تو ہم نے یکدم مغرب کی ٹھنڈک اور بے مہر موسموں کو محسوس کیا۔ ہم ایک مدت تک رنجیدہ اور کھوئے کھوئے سے رہے۔۔ روسیوں کی جاں نثار محبت اور خلوص نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا اور ہم اُنہیں یاد کرتے اداس ہوتے رہے۔۔

ہم آہنی پردے کے پار ہو کر آئے تھے اور یہ گواہی دے سکتے تھے کہ اس پردے کے پار مغرب کی تشہیر کے مطابق خوفناک اور ظالم روسی ریچھ نہیں بستے بلکہ اس مغرب کی نسبت کہیں زیادہ امن کے تمنائی اور محبت بھرے جذباتی لوگ بستے ہیں۔۔

اُن دنوں ایک نوجوان مجید نظامی لنڈن کی کسی سیون سسٹرز روڈ پر قیام پذیر روزنامہ ''نوائے وقت'' کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اُنہیں بھی خبر ہو گئی کہ برطانیہ سے کچھ پاکستانی نوجوان قدرے غیر قانونی طریقے سے یعنی روسی پاسپورٹوں کے ذریعے آہنی پردے کے اندر جا کر اب واپس آ چکے ہیں تو اُن کی جانب سے پیشکش ہوئی کہ آپ سوویت یونین کا کچھ آنکھوں دیکھا حال لکھیے۔ اپنے سفر کی روئیداد بیان کیجیے تاکہ پاکستان کے عوام آگاہ ہو سکیں کہ اس آہنی پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں اور کمیونزم کا نظام کن مراحل پر ہے۔۔

اس غیر متوقع پیشکش سے میں ذرا گڑبڑا گیا کہ میری کتابوں میں کہیں لکھاری بننا لکھا تھا اگرچہ پڑھا تو بہت کچھ تھا لیکن ابھی دو چار برس پہلے بچوں کے رسالوں میں ایک دو کہانیوں اور لطیفوں وغیرہ کے سوا لکھا کچھ نہ تھا۔ تو میں نے اپنے ٹین ایجر ہونے اور اس معاملے میں ناتجربہ کار ہونے کے دلائل پیش کیے جو نظامی صاحب نے رد کر دیے۔۔ آپ جو لکھ سکتے ہیں لکھیے ہم اصلاح کر لیں گے۔۔ میرے جی میں جو آیا لکھ دیا اور وہ سفرنامہ چار اقساط میں اُن زمانوں کے نہایت مؤقر ہفتہ وار ''قندیل'' میں ''لنڈن سے ماسکو تک'' کے عنوان سے شائع ہو گیا۔۔ یہ میری اولین ادبی تحریر تھی۔۔ اور یہ 1958ء تھا۔۔

اس سفرنامے کے ادبی مرتبے کے بارے میں تو خیر کیا بات ہونی تھی لیکن اسے سوویت یونین کے سب سے پہلے سفرنامے کے طور پر نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا اور اس کی مناسب توصیف ہوئی لیکن اس کے ساتھ چند اعتراضات بھی ہوئے جواب بھی ہوتے ہیں کہ یہ نوجوان چونکہ کچی عمر کا ہے اس لیے خواہ مخواہ روسیوں ایسی خونخوار اور پاکستان دشمن قوم سے متاثر ہو

گیا ہے اور اُنہیں نہایت محبت والے اور پُر خلوص لوگ قرار دے رہا ہے.. یقیناً یہ ایک عدد مُر خا ہو چکا ہے.. اور یہ بھی کہ سوویت یونین کے اندر جانا تو ممکن ہی نہیں اس نے ادھر اُدھر سے سن سنا کر گھر بیٹھ کر یہ سفرنامہ لکھا ہے.. ایسے معترضین نے اس سفرنامے کے ہمراہ سوویت یونین میں اُتاری ہوئی میری تصاویر کی جانب کچھ دھیان نہ دیا اُنہیں گول کر گئے..

میری یہ پہلی ادبی تحریر "لنڈن سے ماسکو تک" صرف ہفتہ وار "قندیل" میں شائع ہوئی اور بہت بعد میں میں نے اس سفر کے تجربات کو بنیاد بنا کر اپنا ناولٹ "فاختہ" تحریر کیا جس کے کرداروں میں وہ تین نقاب پوش لڑکیاں بھی تھیں جو جشن کی رات میں مجھے سُرخ چوک میں ملی تھیں..

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "لنڈن سے ماسکو تک" کے حوالے سے ماسکو گویا میرے ادب کی جنم بھومی ہے.. میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اس کا آغاز ماسکو سے ہوا.. یہ شہر میرے لیے مبارک ثابت ہوا تھا..

تب بھی جشن کی رات تھی..

پچاس برس گزر چکے تھے جب اسی سرخ چوک کے کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں کے اوپر جو انار چھوٹتے تھے اُن کی روشنی ایک اٹھارہ برس کے گھنگھریالے بالوں اور سیاہ آنکھوں والے خواہ مخواہ اداس ہوتے لڑکے کے چہرے کو بھی زرد کرتی تھی اور تین نقاب پوش لڑکیاں اُسے گھیرے کھڑی تھیں..

اور آج بھی جشن کی رات تھی..

اور سرخ چوک کے کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں کے اوپر جو انار چھوٹتے تھے اُن کی روشنی ایک ایسے شخص کے چہرے پر پڑتی تھی جو اگر زندہ رہتا ہے تو دو برس بعد ستر برس کا ہو جائے گا.. اُس کے گھنے بال گہنا چکے تھے اتنے چھدرے ہو چکے تھے کہ الگ الگ گنے جا سکتے تھے.. اور وہ اُنہیں صرف اس لیے رنگتا تھا کہ ٹیلی ویژن سے متعلق ہونے کے باعث یہ اُس کی معاشی مجبوری تھی ورنہ اُن بالوں پر برسوں کی برف پڑ چکی تھی.. اُس کا ماتھا مزید کشادہ ہو چکا تھا اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں اُس کے باپ کی بجھتی ہوئی آنکھوں کی نیلاہٹ ظاہر ہونے لگی تھی.. وہ آئینہ دیکھتا تو اُس میں اُسے اپنے والد کا شائبہ ہوتا اور وہ نانا

اور دادا بن چکا تھا..

آتش بازی کے اُن اناروں کی زرد روشنی اُس کے چہرے کی جھریوں اور جب وہ مسکراتا تھا تو اُس کے بچے کھچے لرزیدہ دانتوں کو مزید زرد کرتی تھی اور نقاب پوش لڑکیوں کی بجائے اُس کے برابر میں.. اُس کی چھتیس برس سے منکوحہ میمونہ ایک معصوم سی حیرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ آتش بازی کے اس عظیم مظاہرے کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے تکتی جاتی تھی..

تب.. نصف صدی پیشتر میں مغرب کی جانب سے ماسکو آیا تھا.. نپولین کی مانند اور اب میں مشرق کی جانب سے ماسکو آیا تھا.. کسی حد تک امیر تیمور کی طرح..

یہ دونوں عظیم فاتح ماسکو تک پہنچ تو گئے.. نپولین تو کچھ عرصہ اس شہر پر قابض بھی رہا اور روسیوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب شہر کو آگ لگا دی.. لیکن یہ دونوں اس شہر کو اور روس کو تسخیر نہ کر سکے.. ناکام اور نامراد ہوئے..

روسیوں نے اُنہیں خوش آمدید تو نہ کہا..

پر میں نپولین اور امیر تیمور کی نسبت زیادہ خوش قسمت رہا تھا کہ جب میں مغرب سے آیا تھا اور اب میں مشرق کی جانب سے آیا ہوں تو روسیوں نے اپنی محبت کے تمام تر دروازے کھول کر مجھے خوش آمدید کہا..

یوں بھی ایک ادیب فتح کرنے نہیں مفتوح ہونے جاتا ہے..

یہ دنیا ایک عجیب کھیل تماشا ہے.. اس لیے بھی ہے کہ قرآن پاک میں اس دنیا کو کھیل تماشا کہا گیا ہے.. شاہ حسین اچھے بھلے شرعی بزرگ تھے لیکن جب نماز کے دوران اس آیت تک پہنچے تو قہقہے لگانے لگے' نماز توڑ دی' داڑھی منڈا کر سرخ چوغہ پہنا اور گلیوں میں رقص کرنے لگے کہ یہ سب تو یہی کھیل تماشا ہے..

کیسا نہ سمجھ میں آنے والا کھیل تماشا ہے.. کہ ایک کچی عمر کا ایک اجنبی بے نشان کبھی ماسکو آتا ہے اور پھر پورے پچاس برس بعد روسی حکومت اور ماسکو یونیورسٹی اُسے اپنے ہاں لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتی ہے.. اس لیے کہ اُس کی تحریریں تقریباً پینتیس برس سے اردو کے نصاب میں شامل ہیں اور وہ طالب علم جو کبھی اُسے نصاب میں پڑھتے تھے اور اب ادھیڑ عمر ہونے کو آتے تھے اور اُس یونیورسٹی میں سینئر اساتذہ ہو چکے تھے وہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ آئے اور ہم سے باتیں کرے.. ایسے کھیل تماشوں میں اہلیت اور قابلیت کا چنداں دخل نہیں ہوتا کہ وہ تو ہزاروں

افراد میں آپ سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے..اس میں صرف نصیب کا اور ایک خاص عنایت کا عمل دخل ہوتا ہے۔

ہمارے پاکستان میں ایک قصبہ جڑانوالہ نام کا ہے کہ وہاں قدیم زمانوں میں ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں والا کنواں ہوا کرتا تھا' اُدھر سے جو بھی مسافر گزرتے وہ اپنی پیاس بجھا کر ویرانوں کا سفر اختیار کرتے..اس کنویں کے اندر چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کردہ گولائی میں سے مسلسل نمی کے باعث بہت سے پودے پھوٹ پڑے تھے اور اُن کی جڑوں نے اس کنویں کی اینٹوں کو ڈھک دیا تھا تو یہ مقام جڑانوالہ کھوہ کے نام سے مشہور ہو گیا..کچھ اسی طور میری حیات کے کنویں کی دیواروں میں سے ادب کا جو پہلا بوٹا پھوٹا تھا اور جس نے جڑیں پکڑ لی تھیں' اُس کا بیج ماسکو تھا..مجھے تب کچھ گمان نہ تھا کہ جوں جوں سفر حیات کا طویل ہو گا یہ جڑیں پورے کنویں کو ڈھانپ لیں گی..اور مجھے ایک ادیب کے طور پر قبولیت حاصل ہو جائے گی.. اس شہر سے میری اولین تحریر کا آغاز ہوا تھا اور مجھے اُمید ہے کہ اگر آج میں ماسکو کتھا لکھ رہا ہوں تو یہ میری آخری تحریر نہیں ہو گی..اگر ہو گئی تو پھر بھی کچھ غم نہیں کہ کسی نہ کسی تحریر نے تو آخری ہونا ہی ہے۔

ہنگری کا ایک نامور کلاسیکی پیانو نواز فرانز لزٹ نام کا تھا..اُس کی انگلیوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ پیانو کی کیز اُن کے لمس سے گویا زندہ ہو کر ایسے نغمے الاپنے لگتی تھیں جو اس کائنات میں پہلی بار سنائی دیتے تھے..فرانز کے کمال فن کی شہرت روس تک پہنچی اور روسی زار نے اسے شاہی دربار میں پیانو بجانے کے لیے ذاتی طور پر دعوت دی..اس کی بگھی روس کے وسیع میدانوں میں چلی جا رہی ہے' گھوڑوں کے نتھنوں سے خارج ہونے والی بھاپ سردی سے منجمد ہو رہی ہے تو اُس کا ساتھی منیجر قدرے متکبر اور اپنے فن پر نازاں فرانز لزٹ کو کہتا ہے "فرانز یہ یاد رکھو کہ نپولین بھی روس کو فتح نہیں کر سکا تھا۔"

اس پر فرانز اپنے سیاہ چوغے کو حرکت دے کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے "اور تم بھی یہ یاد رکھو کہ نپولین پیانو نہیں بجا سکتا تھا۔"

روس اپنی تاریخ میں قوت اور جبر سے کم ہی مغلوب ہوا ہے.. ہاں وہ ادب عالیہ... ناول نگاری' شاعری' موسیقی' رقص اور ووڈکا کے سامنے اپنا سر بخوشی جھکا دیتا ہے۔

نپولین ناول اور سفرنامے بھی تو نہیں لکھ سکتا تھا..

پچھلی بار تو میں برطانوی وفد میں شامل یوتھ فیسٹیول میں شرکت کی خاطر مغرب سے آ گیا تھا تو اب نصف صدی کے بعد مشرق سے کیسے آ گیا تھا؟

ٹوکیو' نیویارک' پیرس یا ٹورنٹو میں ہوتا تو کچھ عجوبہ نہیں کہ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن ماسکو میں ہونا..اور کیوں ہونا یہ سمجھ میں نہیں آتا..میں نے یہاں آنے کے لیے کچھ تگ و دو نہ کی تھی نہ کبھی خواہش کی تھی اور نہ سفارش تو اس کے باوجود یہ پیغام کیسے آ گیا..کہاں سے آ گیا؟

دوسرا باب

”ژوگینی ذاخاروف.. مجھے تلاش کرتا ہے“

رات گئے حسب معمول میں اپنی سٹڈی میں ٹیبل لیمپ کی گرم روشنی میں سفید کاغذوں پر جھکا جو لکھنا چاہ رہا تھا لکھ نہیں پا رہا تھا۔ جب میرے موبائل کی گھنٹی مجھے بیزار کرنے لگی.. میں اس واہیات آلے کو عام طور پر بجا کر لکھنے بیٹھتا تھا لیکن آج غفلت ہو گئی تھی..

”جی...“

”آر یو مسٹر مستنصر..“ ایک نامانوس لہجے کی انگریزی میں پوچھا گیا۔

”یس آئی ایم..“

اُس نامانوس لہجے کی آواز نے اٹک اٹک کر انگریزی میں جو کچھ کہا' وہ یہ تھا کہ میرا نام ژوگینی.....ذخاروف ہے اور میں روس سے آیا ہوں.. پاکستان میں بجلی فراہم کرنے والے ایک منصوبے پر کام کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں..

میں نے سوچا اس روسی حضرت سے مل لیا جائے تو شاید وہ ہر شب کی لوڈشیڈنگ کا کچھ مداوا کر سکیں..

اگلی شام ایک نوخیز دکھائی دیتے روسی صدر پیوٹن سے ملتے جلتے ایک خوش شکل صاحب.. ایک کھلنڈرے سے پاکستانی نوجوان کی رفاقت میں نازل ہو گئے..

”تارڑ صاحب.. میں تنویر بُھٹہ ہوں“ پاکستانی نوجوان نے نہایت مؤدب ہو کر اپنا تعارف کروایا۔

”اور یہ ژوگینی.......ذاخاروف ہیں.. آپ سے ملنا چاہتے تھے۔“

”مسٹر مستنصر..“ ذاخاروف نے اپنے ہاتھ اونچے کیے اور فوری طور پر گفتگو کا آغاز کر دیا۔

”میں آپ کو تلاش کر رہا تھا..“

”جی مجھے؟“ اب ایک روسی بھلا کس سلسلے میں مجھے تلاش کرتا پھرتا تھا..

”بالکل آپ کو.. میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیوں.. میری چھوٹی بیٹا آنیا ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں زیر تعلیم ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اردو کے نصاب میں آپ کی تحریریں بھی شامل ہیں.. اور ہاں میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی بیٹیوں سے بے حد محبت کرتا ہوں اور وہ میری بہترین پروڈکشن ہیں.. میں نے بھی ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے بعد گولڈ میڈل حاصل کیا تھا اور روسی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز رہا ہوں.. ہاں آنیا نے بھی تعلیم کے حوالے سے گولڈ میڈل لیا تھا اور جو بڑی بیٹی ہے ساشا اس نے سلور میڈل حاصل کیا تھا اس لیے میں کہتا ہوں کہ میری بیٹیاں میری بہترین پروڈکشن ہیں۔“ اُس نے نہایت معصوم مگر داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر جاری ہو گیا' ”بہر حال آنیا کے شعبے میں اردو کے جو اساتذہ ہیں جب اُن کو معلوم ہوا کہ اُس کا باپ.. یعنی میں ژوگینی ذخاروف کاروبار کے سلسلے میں پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں.. اور ہاں مجھے آپ ایک روسی بزنس مین نہیں کہہ سکتے بلکہ میں ایک پاکستانی بزنس مین ہوں جو کہ ایک روسی ہے۔“ وہ پھر معصومیت سے مسکرایا۔ ”بہر حال اُنہوں نے.. ماسکو یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ آپ کو ماسکو میں مدعو کیا جائے اور آپ سے درخواست کی جائے کہ آپ وہاں کچھ لیکچر دیں.. مدعو کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے تو کیا آپ یہ درخواست مان لیں گے؟“

میرے چہرے پر بھی ایک خوشگوار حیرتی مسکراہٹ پھیل گئی' ”میں اس درخواست کو کیسے نہیں مان سکتا مسٹر ذوخوف..“

”نہیں نہیں میں مارشل ذوخوف نہیں ہوں.. ذخاروف.. ژوگینی ذاخاروف..“

صرف یہ کہہ دینا کہ بیشتر روسی نام مشکل ہوتے ہیں' حقیقتِ حال کی ترجمانی نہیں ہو سکتی کہ روسی نام بہت مشکل ہوتے ہیں اور اُنہیں یاد رکھنا قطعی طور پر ناممکن ہوتا ہے.. روسی ادب پڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ کرداروں کے پیچیدہ اور زبان کو مروڑ دینے والے نام ہوتے ہیں.. اس کا حل میں نے یہ نکالا تھا کہ ناول پڑھتے ہوئے ہر کردار کا نام اور اُس کا دوسرے کرداروں کے ساتھ جو رشتہ ہوتا تھا اُسے الگ سے نوٹ کرتا جاتا تھا۔ چنانچہ ناول تو کم پڑھا جاتا تھا اور کرداروں کے ناموں کا تعین کرنے میں زیادہ وقت گزرتا تھا.. مثلاً ”وار اینڈ پیس“ کے کردار

ملاحظہ کیجیے... کاؤنٹ، کرل ولادی مروچ بزوخوف... پرنس کاترنیا سمیونونا ماموتتووا کاتش.. پرنس ہیلین واسیلونا کوراگینا.. پرنس آندرے نکولائیوچ بلکونسکی.. پرنس لسا کارلوونا بلکونسکا یا مت میتھن... کیا مجھے مزید مثالیں دینے کی حاجت ہے.. البتہ جب آپ اس کی ہیروئن کا نام پڑھتے ہیں جو صرف کاؤنٹس نتالیہ رستوف ہے تو آپ سکھ کا ایک گہرا سانس لیتے ہیں.. تو یہ بے چارہ روسی تو محض ژوگینی ذاخاروف تھا..

"جی تو مسٹر ذخاروف.. میں بھلا کیسے اس درخواست کو نہیں مان سکتا.. لیکن میں اتنا متمول نہیں ہوں کہ روس آنے جانے کے اخراجات برداشت کر سکوں.."

"نو نو مسٹر مستنصر.. یہ سب بندوبست میں کروں گا.. آپ کا ٹکٹ.. ماسکو میں رہائش اور وہاں کے روزانہ اخراجات ان سب کا اہتمام ہو جائے گا.."

"بہت بہت شکریہ لیکن شاید میں یہ دعوت قبول نہ کر سکوں.. آپ.. آپ میرے لیے اجنبی ہیں اور میں آپ کو اتنی زحمت نہیں دے سکتا۔"

"نو نو.. مسٹر مستنصر.." ذخاروف بچوں کی طرح مسکرانے لگا "میں خود اتنا امیر نہیں ہوں' کاش کہ میں ہوتا.. ہو سکتا ہے کبھی ہو جاؤں.. لیکن میرے اور تانویر کے کچھ رابطے ہیں.. یونیورسٹی بھی لیکچرز کے لیے آپ کو معقول معاوضہ پیش کرے گی.. آپ صرف ہاں کر دیجیے باقی سب کچھ میں کر لوں گا.."

بھلا میں "ناں" کیسے کر سکتا تھا..

جونہی میں نے "ہاں" کی۔ ذاخاروف نے پر مسرت ہو کر اپنے موبائل پر ایک نمبر ملایا اور اُسے میری جانب بڑھا دیا.. "آپ میری بیٹی کو پلیز بتائیں کہ آپ کون بول رہے ہیں' وہ بہت خوش ہوگی.. اور یہ بھی بتا دیں کہ آپ ماسکو آ رہے ہیں تو وہ بہت ہی خوش ہوگی۔"

آنیا کی آواز ایک تو بہت مدھم سنائی دے رہی تھی' پھر وہ اردو بھی بولنے کی کوشش کر رہی تھی اور جب وہاں رکاوٹ پیش آتی تو انگریزی کا سہارا لیتی' وہاں بھی پھسل جاتی تو روسی بولنے لگتی لیکن ان تمام زبانوں میں اُس کا نوخیز اشتیاق اور مسرت چھپائے نہ چھپتی تھی.. اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ان دنوں میرا ناولٹ "فاختہ" پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے..

ذاخاروف فوری طور پر اجازت کا خواہاں ہوا "مجھے بزنس کے سلسلے میں کوٹ ادو جانا ہے.. اور وہاں سے اگلے روز اسلام آباد میں ایک میٹنگ کے لیے پہنچنا ہے اور پھر فوری طور پر

ماسکو.. میں دو چار روز میں لوٹ آؤں گا.."

"سپاسی با" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا..

"اوہو آپ تو روسی بھی جانتے ہیں۔"

"بس اتنی سی.."

"گڈ بائے مسٹر مستنصر.."

"داس وے دانیا.."

"اوہو آپ تو بہت روسی جانتے ہیں.. داس وے دانیا۔"

ذاخاروف کا آنا جانا لگ گیا..

جس روز وہ ذاتی طور پر نہ آ سکتا اُس کا فون آ جاتا..

اگرچہ ذاخاروف ایک بے حد منظم اور ہر شے اور منصوبے کی تفصیل میں جانے والا شخص تھا لیکن مجھے کچھ یقین نہ تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی..

"میرے مستنصر پروجیکٹ کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے ہیں" وہ مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتا "پرسوں ماسکو میں یونیورسٹی کے ڈین کے ساتھ میری ایک طویل ملاقات ہوئی.. وہ آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں اور ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اُنہوں نے یونیورسٹی کی جانب سے ایک معقول رقم کی منظوری حاصل کر لی ہے تا کہ آپ اپنے قیام کے دوران روسی ثقافت اور روزمرہ کی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں' آرٹ گیلریز' عجائب گھر اور تھیٹر وغیرہ دیکھ سکیں.. علاوہ ازیں جیسا کہ میں پہلے بھی آپ کو اطلاع کر چکا ہوں' لیکچرز کے لیے الگ سے ادائیگی ہوگی.. اب صرف آپ کے آنے جانے کے ٹکٹ اور ماسکو میں آپ کی رہائش کا بندوبست کیا جا رہا ہے جو ہو جائے گا.."

وہ مجھے رپورٹ دیتا اور پھر دو چار روز کے لیے غائب ہو جاتا..

ذخاروف جس طور تنویر کے ہمراہ میری ماسکو یاترا کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا تھا مجھے سچی بات ہے اُس کے بارے میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ اگرچہ روس کی خفیہ پولیس کے جی بی کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا لیکن ہر ملک کی طرح روس کا کوئی نہ کوئی خفیہ محکمہ تو ہوگا.. تو شاید یہ شخص اُس کا ایجنٹ ہے جو مجھ ایسے معمولی ادیب کو ماسکو لے جانے کے لیے دن رات ایک کر رہا ہے.. صرف

اس لیے کررہا ہے کہ روسیوں نے میرے بارے میں کوئی پرانا بغض پال رکھا تھا اور وہ مجھے وہاں بلا کر کسی عقوبت خانے میں ڈالنا چاہتے تھے' ہوسکتا ہے سائبیریا بھیجنے کے منصوبے بھی زیرِ غور ہوں کیونکہ ذاخاروف بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر آپ مئی جون میں آئیں گے تو روس میں ''سفید راتیں'' ہوں گی.. رات گیارہ بجے تک سورج چمکے گا اور پھر سویر تک بھی تیز روشنی رہے گی..

مجھے ان سفید راتوں سے کچھ خدشہ تھا.. دوستوفسکی نے اسی نام کا ایک مشہور ناولٹ لکھا تھا اور وہ سائبیریا کی راتوں کے بارے میں تھا جہاں زار نے اُسے سزا کے طور پر بھیج دیا تھا..

لیکن یہ تو میرے کبھی کبھار کے واہمے تھے جو ذاخاروف کو سامنے پا کر اُس کی چوڑی اور دوستانہ مسکراہٹ دیکھ کر شرمندہ ہوجاتے..

وہ ہر ملاقات پر ایک فائل کھول کر بیٹھ جاتا.. ماسکو میں قیام کے دوران آپ فلاں روز صبح کے وقت فلاں تاریخی مقام پر جائیں گے.. کھانا فلاں ریستوران میں کھائیں گے اور شام کو.. ابھی آنیا چیک کر رہی ہے کہ ان دنوں ماسکو کے تھیٹرز میں کون سے کھیل دکھائے جا رہے ہیں تو شام کو آپ اپنی پسند کا کھیل دیکھیں گے.. اور اگلے روز... اور ہاں اگر آپ سینٹ پیٹرزبرگ جاتے ہیں تو کم از کم دو دن تو ہرمتاژ میوزیم اور محلات دیکھنے کے لیے درکار ہوں گے.. وہاں روس میں واڈکا کی سب سے قدیم فیکٹری ہے اُسے دیکھنا تو لازمی ہے اور..

اُس کی منصوبہ بندی اتنی تفصیلی اتنی شدید تھی کہ میں نے اُسے روسی خفیہ پولیس کا ایجنٹ سمجھنا چھوڑ دیا اور اب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ماسکو میں میرے قیام کا بندوبست نہیں کر رہا بلکہ مجھے کسی روسی خلائی شٹل میں بٹھا کر خلا میں فائر کر دینے کے انتظامات کو آخری شکل دے رہا ہے..

ویسے ان انتظامات کی دوڑ دھوپ مجھے ایک خاص سرخوشی سے ہمکنار کرتی تھی' وہ یہ کہ یہ کیسا کھیل تماشا ہے کہ جس سرزمین پر میں ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے بے نام گیا تھا' اب وہیں وہاں کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں مجھے لیکچر دینے کے لیے بلایا جا رہا ہے..

بے شک مجھے متعدد بین الاقوامی سیمینارز میں شرکت کا اتفاق ہوچکا تھا لیکن ماسکو میں مدعو کیے جانے کے تو لطف ہی جدا تھے.. ان میں میری پہلی ادبی تحریر کا کیف تھا.. نصاب میں شامل میری تحریروں کی کشش تھی اور حیات کے پچاس برس تھے.. نصف صدی کا قصہ تھا..

ایک اور شام ذاخاروف پھر سے نازل ہوگیا..

وہ اتنی باقاعدگی سے نازل ہوتا تھا کہ اہلِ محلہ بھی اُس کی شکل سے واقف ہوگئے کہ

ایک گورا ہر دوسرے روز تارڑ صاحب کے گیٹ پر کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے..

ذاخاروف کا معمول تھا کہ وہ میری سٹڈی میں داخل ہو کر مجھے اپنی دل پذیر اور معصوم مسکراہٹ سے صرف ایک بار نوازتا اور پھر شدید سنجیدہ ہو کر رپورٹ پیش کرنے لگتا. تنویر بھٹہ جو اس ماسکو سازش میں برابر کا شریک تھا' خاموش بیٹھا زیرِ مونچھ مسکراتا رہتا. اگرچہ اُس کی مونچھیں نہیں تھیں.. جہاں کہیں بھی ذاخاروف کے انگریزی اظہار میں رکاوٹ پیش آتی تو تنویر اُس کے ساتھ ٹھیٹھ روسی میں مذاکرات کرتا اور پھر اُنہیں ٹھیٹھ پنجابی میں مجھ تک پہنچا دیتا..

''مسٹر مستنصر..'' اُس نے اپنی مستنصر فائل کھولی اور اُس میں سے دو سرکاری نوعیت کے ڈاکومنٹ نکالے جو روسی زبان میں تھے ''یہ ماسکو یونیورسٹی کی جانب سے آپ کے لیے اور آپ کی بیگم کے لیے دعوت نامے ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو روسی ویزا فوراً جاری کر دیا جائے گا..''

مجھے یقین ہے کہ اگر میمونہ کو دعوت نہ ملتی تو بھی وہ میرے ہمراہ ماسکو جانے پر اصرار کرتی.. عجیب بے وجہ بے وقوف سی بیوی تھی کہ جن زمانوں میں بے راہروی کے خدشات ہوسکتے تھے تب تو مجھے وہ تنہا جانے دیتی تھی اور ان زمانوں میں جب میں تقریباً بے ضرر ہوچکا تھا وہ میرے ہمراہ جانے پر اصرار کرتی تھی..

ویزوں کی درخواست کے جواب میں روسی سفارت خانے کی جانب سے ایک مؤدب درخواست موصول ہوئی کہ بے شک ہمارے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ آپ ماسکو یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے جا رہے ہیں لیکن ویزا قوانین کے تحت براہِ کرام ایک تو مقامی پولیس سے سرٹیفکیٹ حاصل کیجیے کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں اور ماضی میں مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں رہے.. علاوہ ازیں ایک ایسا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی درکار ہے جو یہ گواہی دے سکے کہ آپ ''ایڈز'' کی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں..

تُمیر نے اپنے ایک سول سروس کے کولیگ سے جو کہ ایس پی وغیرہ تھا' ہم دونوں کے لیے کریکٹر سرٹیفکیٹ تو حاصل کر لیے کہ یار تم تو جانتے ہی ہو کہ ابا جی اور امی جی جرائم پیشہ نہیں ہیں لیکن 'ایڈز' سے پاک ہونے کے سرٹیفکیٹ کے لیے باقاعدہ بلڈ ٹیسٹ کی ضرورت تھی..

ہم دونوں اپنا خون لیبارٹری میں پیش کر کے آئے تو میمونہ نارمل تھی اور میں قدرے تشویش میں مبتلا تھا بلکہ اُس شب مجھے نیند میں جانے میں دشواری پیش آئی کہ جانے اس ٹیسٹ کا نتیجہ کیا نکلتا ہے..

مونا نے بھانپ لیا اور کہنے لگی.. آپ کو کچھ شبہ ہے.. کیوں پریشان ہو رہے ہیں..

''مونا بیگم بدقسمتی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کس صورت میں نازل ہو جائے.. بس ڈرتے رہنا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' اُس نے تیوری چڑھا کر پوچھا..

''اب جو یہ موذی 'ایڈز' ہے.. یہ صرف غیر اخلاقی سرگرمیوں کی وجہ سے ہی نہیں ہوتی.. کیا جانئے کسی سرنج یا کسی اور طریقے سے کچھ لاحق ہو گیا ہو.. اس لیے ڈرتے رہنا چاہیے..''

بہرطور بلڈ ٹیسٹ کا نتیجہ آیا تو میں نے فوراً اپنا نام دیکھا اور پھر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ میں 'ایڈز فری' تھا..

ویزوں کی چھاپ لگ گئی تو دیگر امور طے ہونے لگے..

ایک فیکس موصول ہوئی کہ آرس کانگرس ہوٹل ماسکو میں دو ہفتوں کے لیے آپ کے نام پر 'پریذیڈنشل سویٹ' بک ہو چکی ہے' اپنی آمد کی مصدقہ اطلاع کیجیے..

یہ فیکس پتہ نہیں کہاں جانی تھی اور آ کہاں گئی ہے.. بھلا میرا کسی صدارتی رہائش گاہ سے کیا تعلق.. میں نے فوراً ذاخاروف سے رابطہ کیا..

''یہ رہائشی بندوبست ڈاکٹر طارق چوہدری کی جانب سے ہے جو آپ کے مداحوں میں سے ہیں اور یہ ہوٹل اُن کی ملکیت ہے..''

''اور اس.. صدارتی سویٹ کا کرایہ کتنا ہے؟''

''آپ کو کیا.. یہ بس آپ کے لیے مخصوص ہے..''

میں نے سوچا چاچا رفیق تارڑ کے عہد صدارت میں اُن کی بزرگانہ دعوت کے باوجود قصر صدارت میں قیام کے لیے نہ جا سکے تو چلیے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے..

اُدھر ماسکو یونیورسٹی میں امتحانوں کے دن قریب آ رہے تھے' طلباء اور اساتذہ کی خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح اُن سے پیشتر وہاں پہنچ جاؤں ورنہ اُن کی مصروفیت آڑے آ جائے گی..

یعنی وقت کم تھا اور مقابلہ سخت..

ذاخاروف اور تنویر بھٹہ کی بھاگ دوڑ جاری تھی اور جب میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ میں اب وہاں وقت پر نہیں پہنچ پاؤں گا تو وہ 7 مئی کی شام کو ازبکستان ایئر لائن کے ٹکٹ ہاتھوں میں

تھامے ہوئے ہانپتے ہوئے آ گئے کہ آپ نے کل دوپہر کی پرواز پر روانہ ہونا ہے..

البتہ مجھے اس سلسلے میں تھوڑی سی قربانی دینی پڑی..

اُن دنوں ماسکو جانے والی تمام پروازیں لبریز تھیں.. اور یہ صرف ازبکستان ایئر لائن تھی جس میں اکانومی کلاس میں تو کچھ گنجائش نہ تھی البتہ بزنس کلاس میں چند نشستیں میسر تھیں.. میرے خیر خواہوں نے ظاہر ہے اکانومی کلاس کا بندوبست کیا تھا اور اگر اب میں بزنس کلاس میں سفر کرتا تھا تو اضافی رقم جو چوبیس ہزار روپے کے لگ بھگ تھی' مجھے ادا کرنی تھی جو میں نے کر دی کہ میں یونیورسٹی کے امتحانوں سے پیشتر وہاں پہنچنا چاہتا تھا.. ویزے کے حصول کے لیے بھی تقریباً اتنی ہی رقم میرے پلّے سے چلی گئی تھی.. لیکن جب آخری حساب کتاب ہوا تو میرے پلّے سے کچھ بھی نہ گیا تھا..

ذاخاروف کی بے پایاں مسرت اور مسکراہٹ دیدنی تھی ''میں سمجھتا ہوں کہ میرا مستنصر پروجیکٹ کامیابی سے ہمکنار ہونے کو ہے.. آپ کل ماسکو جا رہے ہیں..''

''تو پھر ماسکو میں ملاقات ہو گی..''

''شاید نہیں.. میں فی الحال مظفر گڑھ جا رہا ہوں.. پھر شاید یوکرین چلا جاؤں.. میرا کچھ پتہ نہیں لیکن آپ فکر نہ کیجیے' ایئر پورٹ پر آنیا موجود ہو گی.. اور اگر اس دوران میرا ماسکو آنا ہو گیا تو آپ سے ملاقات ہو جائے گی ورنہ یہیں.. لاہور میں واپسی پر آپ کے سٹڈی روم میں ملیں گے..''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''مسٹر مستنصر.. ماسکو میں میری اور آپ کی ملاقات ضروری نہیں' وہاں آنیا کے علاوہ بہت سے لوگ آپ کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہوں گے.. ذاتی طور پر میرے لیے یہ مستنصر پروجیکٹ ایک چیلنج تھا جو پورا ہو گیا.. اور اب میں بے حد مطمئن اور پرسکون ہوں.. انجائے یور سیلف اِن ماسکو..''

عجیب قسم کا ذاخاروف تھا!

تیسرا باب

"کوہِ ہندوکش کے پار.. دریائے جیہوں کے پار"

گھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا..

بے شک گھر والی ساتھ ہو تو بھی گھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا..

اُس کی ایک ایک شے لپٹتی ہے.. تمہارا تکیہ' غسل خانے کا آئینہ' کموڈ' دیواروں پر آویزاں تصویریں.. باورچی خانے کی مہک' پورچ میں پھیلتی بیل' صبح سویرے گیٹ کے اوپر سے پھینکے جانے والے اخباروں کے پلندے کی دھپ سے گرنے والی آواز' بک شیلف اور مجسمے.. غرض کہ ہر شے ایک ایک شے آپ کے وجود سے لپٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور آپ اُس کے لیے اور وہ آپ کے لیے اداس ہونے لگتی ہے اور آپ ایک نیم سوگوار کیفیت میں اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ دیکھو تو سہی سفر کس دیار کا ہے.. کیسی سرزمین پر تمہارا قیام ہوگا.. اور پھر بھی گھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا..

ازبکستان ایئر لائن کا ٹوکر تما جیٹ طیارہ جونہی لاہور ایئر پورٹ سے بلند ہوا تو گھر کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑنے لگی اور پورچ میں پھیلتی بیل کی گلابی لڑیاں بدن سے جھڑنے لگیں اور آئندہ دنوں کی متوقع تصویریں اُس پر نقش ہونے لگیں..

گئے زمانوں میں جب بھی ہم بال بچوں سمیت شمال کے سفر کے لیے گھر سے نکلتے تو مونا کہا کرتی تھی کہ دریائے راوی کے پار ہوتے ہی سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے.. منقطع ہو جاتا ہے.. آپ فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر ہماری موجودگی میں بارشیں بہت اُتریں تو کمروں میں شاید پانی آ جائے.. مالی وعدے کے باوجود روزانہ پودوں کو پانی دینے نہ آیا تو کیا ہوگا.. بلیوں نے سٹور میں بچے نہ دے دیے ہوں.. سب کچھ بھول جاتا ہے.. اور جب یہ سفر مثلاً درہ خنجراب کی برفیلی بلندی پر

اختتام کو پہنچتا ہے اور وہاں سے گھر کی جانب واپسی ہوتی ہے تو فوراً خدشات کا آغاز ہو جاتا ہے کہ اگر اس دوران مالی باقاعدگی سے نہیں آیا تو پودے سوکھ گئے ہوں گے.. بجلی اور پانی کے بل جانے کتنے آئے ہوں گے.. اور جانے ہماری غیر حاضری کے دوران کتنے اہم ٹیلی فون آئے ہوں گے.. اور کیا پتہ واپسی پر کوئی ناخوشگوار خبر منتظر ہو..

چونکہ کُوچ کے احکام صرف ایک شب پیشتر ملے تھے.. اس لیے روایتی اور ترتیب شدہ تیاری کا موقع ہی نہ ملا.. گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی مونا بیگم نے سردیوں کے تمام کپڑوں کو فینائل کی گولیاں کھلا کر اُن کی گٹھڑیاں باندھ کر انہیں وارڈ روبوں کے بالائی خانوں میں سٹور کر دیا تھا اور اب وہ ایک آہنی سیڑھی پر ڈولتی ہوئی انہیں اُتار رہی تھی..

وہ گٹھڑی سے کوئی گرم کپڑا کھینچ نکالتی اور میں جو نیچے تھی اوپر کیے سیڑھی کو تھامے کھڑا تھا' مجھ سے پوچھتی "یہ سُرخ مفلر چاہیے؟"

"نہیں.."

"اور یہ.. یہ کینیڈا والی بھاری جیکٹ.."

"نہیں.."

"کیوں رُوس میں سردی نہیں ہوگی.."

"نہیں.. کیونکہ ہم گرمیوں میں جا رہے ہیں.. سردی سردیوں میں ہوتی ہے۔"

"اور یہ فلیس کی وکٹوریا والی جیکٹ.."

"ہاں یہ چاہیے.."

اور وہ دھم سے اُسے میرے اوپر پھینک دیتی..

چنانچہ جو نظر آیا جو جی میں آیا پیک کر لیا..

اور ہاں.. وہاں جو میزبان ہوں گے.. دوست ہوں گے اُن کے لیے کوئی خصوصی پاکستانی تحفے وغیرہ..

میں نے فوراً نذیر احمد کو فون کیا کہ اپنے سامنے جو کینوس ہے اُس پر برش لگانا چھوڑو مصوری بعد میں کر لینا.. یہ پرابلم ہے.. وہ سارے کام کاج ترک کر کے جانے کہاں سے درجن بھر شالیں لے آیا جن پر ہماری روایتی کڑھائی کے گل بوٹے بہاریں تھے اور یہ شالیں ماسکو میں ایک کرشمہ ثابت ہوئیں..

اور ہم نے بہ امر مجبوری بزنس کلاس کے حصول کے لیے مبلغ چوبیس ہزار روپے کا جو زرِ کثیر خرچ کیا تھا تو اُس کے نتیجے میں ہم اکانومی کلاس میں براجمان غریب غربا مسافروں سے کیسے برتر اور معزز ہو گئے تھے.. اول تو یہ کہ یہ جیٹ سے زیادہ فوکر جہاز تھا سوائے اس کے کہ پنکھوں کی جگہ جیٹ سے اُڑان کرتا تھا.. اندر سے بھی ذرا مسکین تھا.. اور بزنس کلاس کیا تھی؟.. کاک پٹ کے قریب نشستوں کی جو چار پانچ قطاریں تھیں اور ویسی ہی تھیں جیسی بقیہ جہاز میں تھیں تو اُن کے آگے ایک پردہ تان کر انہیں بزنس کلاس ڈکلیئر کر دیا گیا تھا..

یہاں ہم دونوں کے علاوہ صرف ایک اور باقاعدہ مسافر تھا.. بقیہ نشستوں پر جہاز کے عملے کے حضرات اپنی وردیوں کے بٹن کھولے استراحت فرما رہے تھے..

البتہ ہمیں بیڈروم سلیپر زپیک شدہ حالت میں عطا کیے گئے کہ آپ تو بزنس کلاس کے مسافر ہیں..

تھوڑی سی اشک شوئی ہوئی..

کھانے کا وقت ہوا تو اُزبک ایئر ہوسٹس ٹرے میں پیک شدہ خوراک کے تین پیکٹ سجائے چلی آئی..

"آپ چکن پسند کریں گے.. یا بیف.. یا مچھلی.."

"مچھلی پلیز.."

اُدھر سے مونا بولی "مجھے بھی مچھلی ہی دے دیجیے.."

ایئر ہوسٹس نے نہایت پرتپاک لہجے میں کہا "وہ تو آپ کے خاوند نے پسند کر لی.. اب میرے پاس چکن اور بیف ہے.."

مُونا کی میز پر چکن کا پیکٹ رکھنے کے بعد وہ تیسرے مسافر کی طرف متوجہ ہوئی "اب تو میرے پاس بیف ہی بچا ہے.. کیا آپ بیف پسند کریں گے؟"

بہت نیچے.. اور ہم تو وہاں تھے جہاں باہر کا درجہ منفی سے کئی درجے نیچے گر چکا تھا.. ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی پر تھے.. اور بہت نیچے بے آب و گیاہ وسعتوں میں ایک سرخ بخار تھا شاید بلا کی گرمی تھی.. افغانستان کے بے انت صحرا اور ویرانے ساکت لگتے تھے پر ہولے ہولے پیچھے رہتے جاتے تھے..

ان ویرانوں اور میدانوں کے پہلو میں یکدم سیاہ پہاڑوں کا ایک سلسلہ بلند ہونے لگا اور پھر دھیرے دھیرے برف سے ڈھکتا گیا.. وہ ایک دیوار کی صورت برف کی عرش تک دیوار کی صورت جہاز کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگا.. اُنہیں چھونے لگا..

اور میں جانتا تھا کہ یہ ہندوکش ہی ہو سکتے ہیں..

جو شہرِ کابل کا ایک سفید گہنا ہیں.. اُس کے گرد سفید ہوتے ہیں..

وہی ناقابلِ عبور ہندوکش جنہیں غزنی کا محمود ہر برس اپنے ہزاروں ہاتھیوں اور سپاہ کے ساتھ عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو جاتا تھا..

ہم نے تاریخ سے روگردانی کر کے محمود غزنوی کو ایک بُت شکن اور بنیاد پرست مسلمان ثابت کر کے کتنی زیادتی کی ہے بلکہ اُس کی مٹی پلید کر دی ہے.. اُسے ایک لٹیرا اور دولت کی ہوس رکھنے والا سلطان ہم نے خود ثابت کیا جب کہ وہ ایک سراسر مختلف انسان تھا.. علم و ادب کا رسیا اور فلسفیوں کا مداح.. جس کے دربار میں فردوسی جیسے شاعر اور البیرونی جیسے جینئس سر جھکاتے تھے اور جس کا رفیق ایاز کیسا گوہرِ نایاب تھا اور جو لاہور کا گورنر ہوا اور آج اُس کی قبر شاہ عالم کے اندر گمنامی میں دفن ہے.. اگر آپ اصل محمود غزنوی کو جاننا چاہتے ہیں تو کسی مسلمان کی فاتح سومناتی قسم کی تاریخ نہ پڑھیے جس میں محمود کا ایک مسخ شدہ چہرہ نظر آتا ہے اور نہ ہی کسی ہندو تاریخ دان کی جو اُسے ایک لٹیرا ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور جو ہندوستان صرف ہندوؤں کی سرکوبی کرنے کی خاطر اور مندر لوٹنے کے لیے آتا تھا.. دنیا کا ہر بادشاہ چاہے اُس کا تذکرہ مقدس صحیفوں میں ہی کیوں نہ ہو اپنی فوجی قوت اپنی سلطنت کے خزانے بھرنے کے لیے استعمال کرتا ہے.. وہ کوئی خلیفہ ہو یا سلطان وہ کسی نہ کسی بہانے کمزور ہمسایوں کو زیر کرنے اور اُن کے مال و اسباب کو لوٹنے کو جائز سمجھتا ہے.. یہاں فسادِ خلق کے باعث کچھ نام درج نہیں کیے جا سکتے لیکن وہ کوئی فرعون یا جولیس سیزر شارلیمان ہو یا نپولین اور بابر ہو یا امیر تیمور.. محض پکنک منانے کی خاطر گھر سے نہیں نکلتے.. امن کے پرچم لہراتے ہوئے دوسرے ملکوں میں نہیں جاتے.. فتح کرنے اور اپنے آپ کو ثروت مند کرنے کے لیے جاتے ہیں.. محمود نے بھی کچھ نیا نہیں کیا وہی کیا جو سلطان اور بادشاہ کرتے ہیں لیکن ہم نے اسلام کے نام پر اُس کے ڈنکے بجا دیے اور مخالفین کو جواز مہیا کر دیا کہ وہ اُسے محض ایک لٹیرا ثابت کر دیں..

اُس نے افغانستان میں ایک ایسا شہر آباد کیا جہاں کے موسم ہاتھیوں کے لیے خوشگوار

تھے.. گویا یہ ایک ہاتھیوں کی پرورش گاہ تھی ایک ہاتھی گھر تھا.. صرف اس لیے کہ وہ ہندوکش عبور کر کے اپنے ان افغانی ہاتھیوں کو ہندوستانی ہاتھیوں کے مقابل کر دے.. وہ کہیں اور جا بھی نہیں سکتا تھا کہ ہندوستان ایک سجی ہوئی سونے کی چڑیا تھی جس کے معبد اور محلات ہیرے جواہرات سے اٹے ہوئے تھے.. تاریخ میں جس کسی کو بھی کچھ آسان دولت درکار ہوتی تھی وہ ہندوستان کا رُخ کرتا تھا.. اُدھر بخارا اور سمرقند یا یورپ کے برف زاروں کا کون رُخ کرتا تھا..

تو محمود نے کیا برا کیا اگر ہندوستان کا رُخ کیا.. اور بار بار کیا..

اصل محمود کی شخصیت پرکھنے کے لیے ہمیں ہمیشہ کی طرح مغرب کے تاریخ دانوں پر انحصار کرنا پڑے گا.. شہرۂ آفاق تاریخ دان ایڈورڈ گبنز کی ضخیم تصنیف ''ڈیکلائن اینڈ فال آف دے رومن ایمپائر'' کی متعدد جلدوں میں سے صرف وہ جلد پڑھ لیجیے جو عربوں اور مسلمانوں سے متعلق ہے.. اس انگریز تاریخ دان نے جس طور تاریخ کو بھی ادب بنا دیا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں.. وہ سلطان محمود کو میدان حرب میں ایک بے مثال قائد قرار دیتا ہے.. اُس کی عظمت اور بڑائی اور علم دوستی کے گُن گاتا ہے.. اور وہ کہتا ہے کہ ہر برس اپنے ہزاروں ہاتھیوں اور لاکھوں سپاہ کے ساتھ کوہ ہندوکش ایسے قاتل اور ناقابل عبور سلسلۂ کوہ کو پار کر کے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہونا ایک محیرالعقول کارنامہ ہے.. ہنی بال نے تو نہایت کمتر بلندی والے الپس عبور کیے تھے اور صرف محدودے چند ہاتھیوں کے ساتھ صرف ایک بار عبور کیے تھے اور اس کے باوجود اُسے ایک عظیم سپہ سالار اور فاتح کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے.. ایڈورڈ گبنز مُبہم نہیں نہایت واضح الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ... غزنی کا سلطان محمود.. مقدونیہ کے سکندر سے کہیں بڑا اور عظیم فاتح تھا..

محمود غزنوی ایک ایسا جائنٹ تھا جسے ہم نے اپنی مذہبی تعصب میں رنگ کر ایک بونا بنا دیا ہے..

جہاز کے نیچے سے گزرتے ہندوکش کی ازلی برفیں ہماری کھڑکیوں کو چھونے کو آتی تھیں.. محمود کی وفات پر اُس کا دانش ور اور علم دوست بیٹا مسعود تخت نشین ہوا.. اور وہ ایک اور دارا شکوہ تھا.. ترک گڈریوں کے ایک اجتماع نے اُسے شکست دے کر غزنی کو نذر آتش کر دیا..

ان گڈریوں کی سربراہی سلجوق کا پوتا الپ ارسلان کر رہا تھا..

اگرچہ میں سلجوق کا والد صاحب ہو چکا تھا لیکن میری تمام تر ہمدردیاں مسعود غزنوی

کے ساتھ تھیں۔

جنگیں اکثر اُجڈ اور گنوار اور خانہ بدوش جیتتے ہیں..

ذوق جمال رکھنے والے اور تہذیب یافتہ ہمیشہ ہارتے ہیں..

ہندوکش کے برفیلے معبد نیچے ہونے لگے.. اُن کی بلندی کم ہوتی گئی اور پھر کچھ وادیاں اور میدان نظر آنے لگے..

ان میدانوں میں ایک پہلو بدلتا بے چین کوبرا سرسراتا تھا.. ایک دریا بل کھاتا تھا..

ہماری نشست کے آگے اُزبک ایئر کا ایک اہلکار جو اپنی وردی کے بٹن کھولے نیم خوابیدہ ساتھا میں نے اُس کو متوجہ کیا.. ''برادر یہ دریا کونسا ہے؟''

اُس نے بے رُخی سے نہیں اُزبک خوش رُخی سے کہا ''برادر یہ دریائے آمو ہے۔''

دو عظیم تہذیبوں کی حد بندی.. افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے درمیان ایک ازلی سرحد.. دریائے آمو... یا.. جیحوں..

روسی افواج کے ٹینک پسپائی اختیار کر کے اسی دریائے آمو پر ایستادہ پل کو پار کر کے ازبکستان کی عافیت میں گئے تھے..

ذرا غور کیجیے کہ دریائے آمو کا حوالہ کسی طور دجلہ اور فرات اور نیل کے آبی حوالوں سے کم نہیں کہ ان ناموں کے ساتھ تاریخ کے تانتے بندھے چلے آتے ہیں اور یہ میرے لیے کیا ہی سنہری اور چمکدار موقع ہو سکتا ہے کہ میں تاریخ کے پرت در پرت کھولتا چلا جاؤں اور اپنی تحقیق سے آپ کو ششدر کرتا چلا جاؤں.. ایک زمانے میں ایسے ہی کیا کرتا تھا پر اُن زمانوں میں یہ لعنتی کمپیوٹر ایجاد نہ ہوا تھا.. یہ گوگل بیہودہ نہ تھا کہ آپ اپنے آبائی گاؤں کا نام ٹائپ کر دیں تو آپ کی سکرین پر نہ صرف گاؤں کا ہر کچا مکان ظاہر ہونے لگے گا بلکہ وہ ایک جوہڑ ہے اُس میں جو مینڈک ٹرا رہا ہے اُس کا کلوز اپ بھی نمودار ہو جائے گا تو ان زمانوں کے سفر ناموں میں اس نوعیت کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنا وقت کا زیاں ہے۔ تاریخ میں ڈبکیاں لگانے کے زمانے گزر گئے.. اگر کسی نے ڈبکی لگانی ہے تو اپنے ذاتی کمپیوٹر کے کی بورڈ پر اُنگلیاں چلا کر ڈبکی لگا لے.. یا ڈوب جائے.. ان دنوں تو تاج محل.. صحرائے گوبی.. اہرام مصر یا مسجد قرطبہ کو اگر دیکھیے تو اُس کا تاریخ جغرافیہ بیان نہ کیجیے کہ وہ کمپیوٹر پر ایک کلک کرنے سے آپ کے سامنے آ جائے گا.. اور آپ کی عمر بھر کی تحقیق پر حاوی ہو جائے گا... البتہ آپ اپنی کیفیت بیان کیجیے اس تاریخ کی اثر انگیزی کا تذکرہ کیجیے.. آپ

پر جو گزری وہ تحریر کر دیجیے.. کسی دجلہ و فرات یا دریائے آمو کا جو سحر آپ کے بدن میں سرایت ہوا اُس کی کتھا لکھ دیجیے کہ یہ سب کچھ کسی بھی کمپیوٹر کی کلک کے بس میں نہیں ہے.. یہ صرف آپ کے بس میں ہے..

نیچے کہیں.. براوراز بک نے مطلع کیا.. وادیٔ فرغانہ گزر رہی تھی..

اس کے بارے میں جاننے کے لیے کلک کیجیے "بابر".. مجھے زحمت نہ دیجیے..

اب ہم تاریخ سے قطع تعلق کر کے ذاتی معیشت کی جانب آتے ہیں.. یعنی اُن مبلغ چوبیس ہزار روپوں کی جانب جو ہم نے اپنے پلے سے خرچ کر کے بزنس کلاس کی مجبوری خریدی تھی.. طے یہ ہوا کہ ماسکو تک کے سفر کے دوران ہم نے یہ پیسے پورے کرنے ہیں چنانچہ تاشقند تک یہ سلسلہ کچھ یوں چلتا رہا کہ ایئر ہوسٹس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک میکانکی اور بوسیدہ مسکراہٹ بکھیر دی تو سو روپے پورے ہو گئے.. ازبک ایئر کی جانب سے سلیپر پیش کیے گئے تو یہ تصور کر لیں کہ یہ چاندی کے تاروں سے کاڑھے ہوئے ہیں اس لیے ایک ہزار مزید پورے ہو گئے۔ کھڑکی کے ساتھ ہندوکش کی برفوں کے سفید رخسار چھو گئے تو یہ منظر پانچ سو روپوں کا تو ہوگا.. یقیناً کوئی نادان قاری ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ بھئی ہندوکش تو پچھلے حصے میں اکانومی کلاس کی کھڑکیوں سے بھی تو نظر آ رہے ہوں گے تو آپ کس سلسلے میں پیسے پورے کیے جا رہے ہیں لیکن ایسا نادان قاری ہرگز یہ نہیں جانتا کہ جب آپ اتنی رقم اجاڑ کر بزنس کلاس میں براجمان ہوتے ہیں تو آپ خود بھی تھوڑے سے ہندوکش ہو جاتے ہیں یعنی سربلند اور پُر تکبر.. یوں آپ کی کھڑکی سے جب ہندوکش نظر آتے ہیں تو آپ نہیں وہ آپ سے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ دیکھو جہاز کے اندر بھی ایک چھوٹا سا ہندوکش بیٹھا ہے..

دریائے آمو کو دیکھا تو اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے پندرہ سو کے برابر قرار دے دیا..

ایک عجیب غیر حقیقی سی وادی نظر آنے لگی جس کے درمیان میں سُرخ چٹانوں کی ایک دراز دور تک چلی جا رہی تھی.. ان چٹانوں کی سُرخی وادیٔ رَم سے مشابہ تھی جہاں گلابی شہر پیٹرا کے کھنڈر پوشیدہ ہیں.. کہیں کوئی سبزہ تھا نہ ہریاول اور نہ ہی پانی کا کچھ سراغ ملتا تھا اور اس کے باوجود اس سُرخ ویرانے میں متعدد چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آ رہے تھے.. میں نے دل ہی دل میں اس وادیٔ سُرخ میں کوہ نوردی کی اور وہ کیسی سُرخ آوارگی تھی.. ان گاؤں میں کیسے لوگ زندگی کرتے ہوں گے اور کب سے کرتے ہوں گے اور کون ہوں گے..

میں نے مزید ایک ہزار روپے کی ڈھارس بندھوالی..

کھڑکی سے نظر ہٹا کر میں نے اونگھتی ہوئی مُوٹا پر ایک نظر ڈالی اور ظاہر ہے ایک منکوحہ پر ایک نظر ہی ڈالی جا سکتی ہے.. دوسری نظر ڈالنا جائز ہی نہیں ہے.. یہ دوسری نظر غیر منکوحہ پر ڈالنے سے ہی ثواب ہوتا ہے.. تھوڑی دیر بعد جب میں نے دوبارہ اپنا چہرہ کھڑکی کے قریب کیا تو لینڈ سکیپ یکسر بدل چکی تھی.. ایک بہت وسیع پھیلاؤ والا میدان تھا جس کے چاروں اور برفیلی بلندیاں تھیں اور میدان میں گھنی ہریاول کے ساون بھادوں بنے تھے.. اس منظر میں عجب یہ تھا کہ میدان کی وسعت کے عین درمیان میں صرف ایک عمودی چٹان کا وجود اُٹھتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ میدان کو گھیرے ہوئے پہاڑوں کی بلندی تک آ جاتا تھا اور اُس چٹان کی چوٹی برف سے ڈھک جاتی تھی.. ایک بے انت میدان کے درمیان میں سے ایک یادگار کی مانند اُٹھتی چٹان اور اُس پر برف کی دستار.. ادھر تو تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے پورے ہو گئے..

تاشقند تک پہنچتے پہنچتے بہت کھینچ تان کر صرف پانچ ہزار ایک سو روپے پورے ہوئے لیکن اُن کے ساتھ بھی ایک ٹریجڈی ہوگئی..

میں نے پرواز کے آغاز میں یہ نوٹ کیا تھا کہ ازبک ایئر کے ایک صاحب جو وردی سے کپتان لگتے تھے کاک پٹ میں سے برآمد ہوئے' اپنا کوٹ اُتار کر ایک نشست پر براجمان ہوئے اور فوراً خواب میں چلے گئے.. ٹریجڈی یہ ہوئی کہ تاشقند کی قربت میں اُنہوں نے یکدم اتنے گرجدار خراٹے لینے شروع کر دیے کہ جہاز بھی اُن کے ارتعاش سے ڈولتا ہوا محسوس ہوا.. چنانچہ جتنے بھی پیسے پورے کیے تھے وہ اُن کے خراٹوں نے ہوا کر دیے.. ایک اور وسوسہ تھا جو دل کو بری طرح دھڑکا تا تھا کہ اگر یہ پائلٹ ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ جہاز کو خودکار گیئر میں ڈال کر.. اس کشتی کو خدا پہ چھوڑ کر کہ ازبک بھی تو مسلمان بھائی ہیں کاک پٹ میں سے نکل کر یہاں اپنی نیند پوری کر رہے ہوں.. بہر طور یکدم اُن کے خراٹے سناٹے میں چلے گئے' وہ اطمینان سے اُٹھے.. اپنا کوٹ زیب تن کیا' بالوں میں کنگھی کی اور کاک پٹ کے اندر چلے گئے.. پائلٹ ہی ہوں گے.. نہ ہوتے تو ہمارا جہاز تاشقند ایئرپورٹ پر کیسے لینڈ کر جاتا..

چوتھا باب

"تاشقند میں انتظار اور کبڈی کبڈی"

جہاز جب اُترنے کے لیے بلندی کم کر رہا تھا تو نیچے جتنا بھی تاشقند دکھائی دے رہا تھا وہ ایک ایسا میدانی شہر لگتا تھا جس میں کہیں کہیں ہریاول کے آثار ہویدا تھے اور دور کے پہاڑوں پر کہیں کہیں برف تھی.. انجن خاموش ہوئے تو اُن مسافروں کو جو صرف تاشقند کے مسافر تھے انہیں جہاز سے ملحقہ پلاسٹک کی سونڈ نما سرنگ کے راستے رخصت کر دیا گیا اور ہم جو وہاں ایک عارضی قیام کرنے والے تھے' ہمیں ایک بس میں بٹھا کر ذرا گھما پھرا کر ایک ٹرانزٹ لاؤنج میں جمع کروا دیا گیا..

تاشقند ایئرپورٹ پر خالد بشیر تارڑ کی طرح یہ میرے مشاہدے میں بھی آیا کہ وہاں جہازوں کی اتنی بڑی تعداد سکوت میں کھڑی تھی کہ کھوے سے کھوا کی بجائے پَر سے پَر چھلتا تھا.. کم از کم ساٹھ ستر تو ہوں گے.. اور اُن پر جلی حروف میں UZBIKISTAN لکھا دیکھ کر لمحے بھر کے لیے تو دل رُکتا تھا کہ UZBI کی بجائے PA ہوتا تو اسے کیسے PAKISTAN پڑھا جا سکتا تھا.. یہ تارڑ صاحب جو میرے نہایت عزیز دوست ہیں' اپنے کسی ہم ذوق دوست کے ہمراہ اُزبک تہذیب و ثقافت پر کوئی تحقیق کرنے کے لیے یہاں آئے تھے جس میں سرفہرست مقامی حُسن اور مشروبات کا خصوصی مطالعہ تھا.. انہوں نے بھی تاشقند ایئرپورٹ پر جیٹ ہوائی جہازوں کا ایک ہجوم دور دور تک دیکھا تو ایک مقامی دوست نے اس کا سبب یہ بتایا کہ سوویت یونین جب منتشر ہوا تو یہ اتنی ڈھیر ساری بلائیں ہمارے حصے میں آ گئیں' تو اب ان کو چلائے کون' پائلٹ تو زیادہ تر روسی ہوا کرتے تھے' وہ رخصت ہو گئے تو اب ان کو چلائے کون.. میرا خیال ہے کہ یہ قصہ خالد بشیر کی روایتی شگفتہ مزاجی کی اختراع ہے اور اسے

زیادہ سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے..

تاشقند پہنچنے پر ایک تو میں نے ہوا کی فرحت آمیز تازگی کو چہرے پر محسوس کیا اور اس کے بعد ایئرپورٹ پر تعینات اُزبکوں کی آہستہ خرامی اور اطمینان کو محسوس کیا' اس کے باوجود اُن کا رویہ بہت مددگار اور خوشگوار تھا.. اُن کے چہروں پر یا مسافروں کے ساتھ برتاؤ میں یورپ یا مشرق وسطیٰ کے ایئرپورٹوں کے سٹاف ایسی لاپروائی اور بیگانگی نہ تھی.. اگرچہ وہ قدرے سست سے لگتے تھے پر اُن کے ذمے جو کام تھے وہ سب خوش اسلوبی سے ہوتے چلے جاتے تھے..

تاشقند کا یہ ٹرانزٹ لاؤنج جہاں اگلی پروازوں کے منتظر مسافروں کو لے جایا گیا سوویت زمانوں کے خصوصی فن تعمیر کا ایک نمونہ تھا.. یعنی محل نما بلند اور منقش چھتیں' سنگ مرمر کے پرشکوہ ستون.. آرائش کے سنہری گل بوٹے.. نچلی منزل تک اُترتے شاندار زینے اور قالین اگرچہ بوسیدہ.. اور ایک شاہانہ فرانسیسی طرز کا وسیع ریستوران جس کا کل مینیو ڈل سوپ اور ازبک پلاؤ پر اختتام کو پہنچ جاتا تھا.. البتہ مشروبات کی خاصی خمار آور ورائٹی تھی..

اگرچہ اکلوتا واش رُوم نہایت معمولی تھا لیکن اُس کی کھڑکی میں سے شہتوت کا ایک درخت نظر آ رہا تھا اور وہ صاف ستھرا تھا..

ہمیں یہاں پورے پانچ گھنٹے منتظر رہنا تھا..

اس انتظار گاہ میں بھانت بھانت کے مسافر چلے آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے.. ازبک ایئرلائن کی ایک پرواز براہ راست امرتسر سے تاشقند تک چلی آئی اور اُس میں ظاہر ہے سردار اور سردارنیاں تھے اور اُن کے بچے تھے جو کہ ظاہر ہے سکھ بچے تھے' اُن کی منزل لنڈن تھی..

کچھ چپٹی ناکوں والی حجاب میں پردہ پوش خواتین تھیں جن کی منزل کوالالمپور تھی.. کچھ گورا لوگ بھی ٹہل رہے تھے جانے کہاں سے آئے تھے اور کہاں جا رہے تھے..

اُزبک ایئرلائن اور دنیا کی دیگر فضائی کمپنیوں کے کرایوں میں زمین آسمان کا فرق تو نہ تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ اگر ایک پورا خاندان سفر کرے تو مناسب بچت ہو جاتی تھی..

اور وہاں جتنے بھی پاکستانی منتظر تھے وہ ہم دونوں کے سوا سب کے سب بشکک جا رہے تھے.. قازقستان کے مسافر تھے..

ایئرپورٹوں پر مجبوراً وقت گزارنا دنیا کا سب سے کٹھن کام ہے۔۔ایک مسلسل جھنجھناہٹ مسافروں کی اُن کے قدموں کی۔۔ بار بار سپیکرز پر گونجتے بے رُوح اور میکانکی پروازوں کے اعلان۔۔ایک تھکا دینے والی اجنبیت اور ایک گھٹن اور قید کا احساس جو صرف بیٹھے رہنے سے دوچند ہو جاتا ہے۔۔ مجھے ایک عرصے سے تجربہ تو نہیں ہوا لیکن میرے خیال میں ریلوے سٹیشنوں پر انتظار کی کوفت اتنی نہیں ہوتی۔۔خاص طور پر پاکستانی ریلوے سٹیشنوں پر۔۔میں اور مُونا نہایت بے آرام کرسیوں پر بے زار پہلو بدلتے تھے کہ دو پاکستانی لڑکیاں آ گئیں۔۔اُن میں سے ایک نہایت پُراعتماد' باتونی اور ذرا چربیلی لڑکی تھی اور دوسری ذرا چپ' ذرا ناتواں سی لپٹی لپٹائی تھی۔

اُن دونوں کی رفاقت سے کچھ وقت اچھا کٹ گیا۔۔

پُراعتماد اور صحت مند لڑکی بشکک میں میڈیکل کی طالبہ تھی اور یہ جو ناتواں چُپ تھی یہ پہلی بار گھر چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہی تھی جو اس کے لیے کیسی انوکھی' اجنبی اور کیسی حیاسوز ہو گی۔۔

"میں آپ کی کتابوں سے جانتی ہوں کہ آپ کی اکلوتی بیٹی بھی ڈاکٹر ہے۔۔مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا جنون تھا' پر ایف ایس سی میں میرے نمبر ذرا کم آئے۔ادھر جب سوویت یونین منتشر ہوا تو بشکک میں ایک بہت بڑا میڈیکل کالج تھا۔قزاق یوں بھی تعداد میں بہت کم ہیں اور اُن میں کتنے ڈاکٹر بن جانے کے تمنائی ہوں گے اور اتنی محنت اور پڑھائی کرنے کے قابل بھی ہوں گے چنانچہ اُنہوں نے غیر ملکیوں کے لیے دروازے کھول دیئے۔۔اس وقت بشکک کے مختلف تعلیمی اداروں میں سینکڑوں پاکستانی زیر تعلیم ہیں۔۔"

"یہ جو بشکک ہے' یہ کیسا ہے؟"

"لوگ بہت سادہ اور اچھے ہیں۔۔خوراک بھی وافر ہے اور معاشرہ پُرامن ہے۔۔میری یہ سہیلی ایف ایس سی میں نمبر کم آنے پر خودکشی کے بارے میں سوچ رہی تھی تو میں نے اسے بھی ایک ایجنٹ کے ذریعے بشکک میں میڈیکل میں ہی داخلہ لے دیا۔۔ذرا ڈری ہوئی ہے۔۔"

"ایک ایجنٹ۔۔کس قسم کے ایجنٹ کے ذریعے؟"

"پاکستان میں مختلف سفری ادارے اور ایجنٹ جن میں سے اکثر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے' سنٹرل ایشیا کی ریاستوں میں روسیوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں پاکستانی طالب علموں کے

لیے داخلے کا بندوبست کرتے ہیں اور ویزے کے حصول میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔۔اگرچہ پاکستان کی نسبت اس تعلیم پر اخراجات تو بہت اٹھتے ہیں اور پھر گھر چھوڑ کر قازقستان میں چھ برس کے لیے جا آباد ہونے کو بھی جی نہیں چاہتا پر۔۔ڈاکٹر بننے کی کشش اتنی شدید ہوتی ہے کہ بھلی ایسی گھریلو لڑکیاں بھی ملک بدر ہونے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔۔"

"کیا لڑکیوں کے لیے بشکک ایک محفوظ مقام ہے خاص طور پر جب وہ تنہا ہوں۔۔"

"بالکل محفوظ ہے۔۔" وہ ہنسنے لگی "سر پاکستان کی نسبت کہیں بڑھ کر محفوظ ہے۔۔اور وہاں تنہائی کا قطعی طور پر احساس نہیں ہوتا اتنے پاکستانی ہیں کہ پاکستان ہی لگتا ہے۔۔ایک بہتر پاکستان۔۔آپ کچھ پئیں گے؟"

"نہیں۔۔شکریہ"

"پلیز۔۔میں آپ کے لیے جُوس لے کر آتی ہوں۔۔"

"کہاں سے۔۔میں نے تو یہاں اس نوعیت کی کوئی شاپ وغیرہ نہیں دیکھی"

"ریستوران سے۔۔اور کیا آپ جانتے ہیں کہ وہاں ہر چیز تین ڈالر میں ملتی ہے۔۔ کافی۔۔چائے۔۔بیئر۔سُوپ اور اُزبک پلاؤ۔سب کچھ تین ڈالر۔شنید ہے کہ اُزبکوں کو ابھی ڈالروں کا حساب کتاب نہیں آتا۔۔قیمتوں کا تعین نہیں کر سکتے اس لیے اُنہوں نے اپنی آسانی کے لیے تین ڈالر کا فلیٹ ریٹ مقرر کر دیا ہے۔۔"

جب ہم اس انتظارگاہ میں داخل ہونے سے پیشتر ایک کاؤنٹر پر ماسکو کی پرواز کے لیے بورڈنگ کارڈ حاصل کر رہے تھے تو ہال میں ایک پاکستانی برقعہ پوش خاتون وارد ہوئیں جن کے جلو میں تین اُچھلتے کودتے نہایت بدتمیز بچے بھی داخل ہوئے۔۔اُن میں سے ایک بچہ جو ایسا بچہ بھی نہ تھا ہمارے کاؤنٹر پر آ کر کبھی ہمیں دیکھتا اور کبھی کاؤنٹر کے ساتھ لٹک کر جھولنے لگتا۔۔اور ہمہ وقت دانت نکالتا کہ سب دیکھو میں کیسا کارنامہ سرانجام دے رہا ہوں۔۔ازبک افسر ہمارے پاسپورٹ چیک کر رہا تھا اور نشست کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ کہاں بیٹھنا پسند کریں گے تو وہ بچہ غُل کرتا ہمیں بات نہ کرنے دیتا اور ازبک افسر کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔۔ہم بہت تھکے ہوئے تھے اور اس قسم کی چُہلوں کے تمنائی نہ تھے۔۔میں نے ایک بار تو مسکراتے ہوئے اُسے پیار سے پرے کیا۔۔دوسری بار وہ پھر منڈلانے لگا تو مسکراہٹ کے بغیر پرے کرتے ہوئے ذرا

دھکیلا اور تیسری مرتبہ جب وہ پھر اُمڈ آیا تو میرا جی چاہا کہ میں اُسے زدوکوب کروں.. اور میں نے ذرا پوشیدہ طور پر کچھ کیا بھی.. بچوں کا اُچھلنا کودنا ایک معمول کی کارکردگی ہے اور اُن کا بدتمیز ہونا بھی کچھ ایسا قابل شکایت نہیں لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ وہ نقاب اوڑھے برقعہ پوش خاتون سب سرگرمیاں ملاحظہ کر رہی ہیں' پر مجال ہے کہ اُنہوں نے ایک بار بھی کسی بچے کو روکا ٹوکا ہو.. کچھ سرزنش کی ہو..

ان خاتون کے تینوں بچوں نے اگلے چار گھنٹے تاشقند ایئرپورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں اودھم مچائے رکھا. کبھی کسی ازبک اہلکار کا پیچھا کرتے.. اور اس دوران انہوں نے ایک سردار جی کی داڑھی میں بھی ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا.. کبھی وہ گیلری پر یوں اُمڈتے کہ میں دعائیں کرنے لگتا کہ یااللہ یہ کہیں نیچے نہ گر جائیں.. کبھی وہ زینوں پر قلابازیاں لگاتے اور کبھی واش روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے.. اور اُسے زور سے بند کر کے خوش ہوتے.. اور اس دوران اُن کی والدہ ماجدہ ایک کرسی پر براجمان نہایت گہرے سکون میں ایک کیلے کے علاوہ کچھ پھل فروٹ بھی نقاب کے پیچھے نوش کرتی رہیں..

جب وہ پُراعتماد لڑکی ہمارے لیے جوس لے کر آئی تو میں نے کہا ''جانے یہ خاتون کون ہے اور کہاں جا رہی ہے.. اگر علم ہو جائے تو اُس ملک کے باسیوں کو ان کے بچوں کے بارے میں خبردار کر دیا جائے..''

''تارڑ صاحب میں انہیں جانتی ہوں..'' اُس نے پیپر کپس میں ہمیں جُوس پیش کرتے ہوئے کہا.. ''پرواز کے دوران ان سے ملاقات ہوئی تھی.. انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے خاوند جماعت کی جانب سے قازقستان میں تبلیغ کے لیے مُقیم ہیں اور یہ اُن کے پاس جا رہی ہیں..''

''جماعت کی جانب سے؟''

''جی ہاں.. ان کے میاں بشکک میں ایک احمدی مبلغ ہیں جنہیں ہم لوگ تو مرزائی کہتے ہیں..''

ایک تو مبلغ اور وہ بھی مرزائی.. نہایت ہی کاری متحدہ عمل.. جسے انگریزی میں لیتھل کمبی نیشن کہتے ہیں.. یعنی وہ قازقستان میں اپنے مرزا صاحب کی ''روشنی'' پھیلانے کا مقدس فریضہ سرانجام دے رہے تھے..

مجھے ذاتی طور پر کسی بھی عقیدے یا فرقے پر کچھ اعتراض نہیں' ایک انسان کچھ بھی ہو سکتا ہے.. ہندو' سکھ' عیسائی' یہودی' مسلمان یا مرزائی بھی ہو سکتا ہے.. مجھے اس سے کچھ غرض نہیں.. لیکن وہ کیوں اس بات پر تُل جاتا ہے کہ صرف میرے عقیدے کی جنت ہی جنت ہے.. اور تم قائل ہو جاؤ ورنہ جہنم کا ایندھن بن جاؤ گے..

مسلمانوں میں براہ راست تبلیغ کا رواج کم کم ہے.. ہمارے صوفی بزرگان اپنے اخلاق' محبت اور انسان دوستی کی اقدار پر عمل کرتے' لوگوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہوتے تھے لیکن عیسائیت میں تو پادری حضرات نے اپنے تئیں غیر تہذیب یافتہ افریقہ اور ایشیا میں سامراجی قوتوں کی پُشت پناہی سے لوگوں کو حضرت عیسیٰ کی بھیڑیں بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا.. دلّی میں میری ملاقات ایک اچھے بھلے خوشگوار سردار جی سے ہوئی' تفصیلی تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ موصوف ایک سکھ مبلغ ہیں..

جیسے ایک برگشتہ ہی سمجھ لیجیے ایک جاٹ عزیز کا کہنا ہے کہ وہ ابھی تک اس صدمے سے سنبھل نہیں سکے کہ اُن کے بزرگ اچھے بھلے سکھ سردار ہوا کرتے تھے پھر اُن کے جی میں جانے کیا آئی کہ مسلمان ہو گئے.. اپنی طویل داڑھیاں منڈوا دیں اور پھر کچھ عرصے کے بعد اتنی ہی طویل داڑھیاں پھر سے بڑھا لیں تو پھر فائدہ..

میری صبح کی سیر کے ایک دوست سردار سمیع صاحب ہیں' نہایت ہی دھیمے اور محبت بھرے انسان ہیں.. اُن کے سگے دادا جان باقاعدہ سکھ تھے جن کی تصویر اُنہوں نے ڈرائنگ روم میں سجا رکھی ہے کہ بزرگوں کا احترام کرنا چاہیے جیسے کیسے بھی ہوں.. پھر وہ مسلمان ہو گئے.. اور پھر وہ قادیان پر ایمان لے آئے تو میں اُنہیں کبھی کبھار چھیڑتا ہوں کہ سردار صاحب اس سے بہتر نہیں تھا کہ آپ سردار ہی رہتے.. بہرحال مجھے کسی احمدی مبلغ پر اعتراض نہیں بلکہ کسی بھی مبلغ پر اعتراض ہے کہ آپ کیوں لوگوں کی زندگیاں اجیرن کرتے ہیں' وہ جہاں ہیں جیسے بھی ہیں اُنہیں خوش رہنے دیجیے..

بہرحال اُن احمدی یا مرزائی مبلغ کو سب سے پہلے اپنے تینوں بچوں کو تمیز کی تبلیغ کرنی چاہیے اور پھر قازقوں کی جانب دھیان کرنا چاہیے..

ویسے یہ کیا ہی پُرسوز منظر ہو گا کہ قازقستان کے وسیع گھاس بھرے میدانوں میں سرشام ایک چنگیزی نین نقش والا قازق اپنا گھوڑا سرپٹ بھگاتا چلا جا رہا ہے اور یہ مبلغ اپنے پرائیویٹ

جذبۂ ایمانی میں سرشار اُسے روک کر کہتے ہیں کہ اے قازق کیا تم جانتے ہو کہ اُدھر قادیان میں آخری "مسیحا" کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ غریب سنانے میں آ جاتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے کہ سوری یہ خبر ادھر قازقستان میں مجھے ابھی ابھی پہنچی ہے.. ہزاروں برسوں سے محض مسلمان رہا ہوں تو اب کیا کروں.. گھوڑے کا رُخ کدھر کو کرلوں.. قادیان کی جانب کرلوں.. اور وہ ہے کدھر..

مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ کیا آپ مرزائیوں کو مسلمان مانتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ میرے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے یہ تو روزِ حشر فیصلہ ہو جائے گا لیکن فی الحال اگر وہ مجھے مسلمان مانتے ہیں تو میں بھی اُنہیں مسلمان کسی حد تک مان سکتا ہوں لیکن وہ نہیں مانتے تو میں اُنہیں کیسے مان لوں.. مجبوری ہے.. یوں بھی روضۂ رسولؐ پر حاضری کے بعد یہ مجبوری شدید ہو جاتی ہے.. مجھ سے اپنے بابا کا کوئی بھی شریک برداشت نہیں ہو سکتا..

بہر طور پر مجھے ان کے احمدی مبلغ ہونے پر کچھ اعتراض نہیں.. صرف مبلغ ہونے پر ہے..

قازق جیسے جی رہے ہیں اُن کو جیتے رہنے دیں..

اس انتظار گاہ کی محل نما عمارت میں سے جو زینے اُترتے تھے تو وہ سیدھے ایک مختصر ڈیوٹی فری شاپ میں اُترتے تھے جس میں حسبِ معمول کانچ کا سامان بہت تھا..

گلزار کی ٹیلی فلم میں غالب ایک ٹھیلے کو دھکیلتے اپنے گھر کی جانب چلے آتے ہیں اور یہ ٹھیلہ لبریز ہے تو کوئی واقف کار پوچھتے ہیں کہ غالب یہ کیا ہے؟

تو وہ کہتے ہیں "احتیاط سے ہاتھ لگایئے گا.. کانچ کا سامان ہے۔"

تو بس اسی نوعیت کا کانچ کا سامان ڈیوٹی فری شاپ میں بھی سجا تھا جہاں سے غالب اگر ہوتے تو ٹھیلے کے ٹھیلے لبریز کر کے لے جاتے..

میں نیچے اُترا ہوں تو وہاں مزید پاکستانیوں سے ملاقات ہوگئی اور وہ بھی بشکک کے مسافر تھے.. وہاں ایک خوش بدن درمیانی عمر کے حضرت تھے اور میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ قازقستان کیا کرنے جا رہے ہیں تو سینہ پھلا کر بولے "میں قزاقوں کو کبڈی سکھانے جا رہا ہوں۔"

میں نے یہی جانا کہ ٹیلی ویژن کے حوالے سے مجھے شناسا پا کر ذرا فرینک اور تخولیے ہو رہے ہیں۔

"آپ قزاق حضرات کو کوڈی کرنا سکھانے جا رہے ہیں؟"

"ہاں جی.. اگر آج کبڈی بین الاقوامی سطح پر ایک کھیل تسلیم کیا جا چکا ہے اور اولمپک میں شامل کیا جا چکا ہے تو اس میں مجھ ایسے پاکستانیوں کی کوششوں کا عمل دخل بھی ہے۔ میں ایک عرصے سے کبڈی کا کوچ ہوں.. ایک عرصے سے ایرانیوں کو کبڈی سکھائی اور اب قزاقوں کو کوچ کر رہا ہوں۔"

"یہ قزاق حضرات.. کبڈی کھیلتے ہوئے کیا کوڈی کوڈی بھی کرتے ہیں؟"

"ہاں جی.. باقاعدہ پنجابی میں کوڈی کوڈی کرتے ہیں۔"

"گھوڑوں پر سوار ہو کر کوڈی کرتے ہیں؟"

تنومند پاکستانی کبڈی کے بارے میں میرے غیر سنجیدہ رویے پر ذرا دُکھی سے ہو گئے۔ "تارڑ صاحب آپ یقین نہیں کر رہے لیکن قزاق باقاعدہ بدن پر تیل مل کر ہمارے پنجاب کی کبڈی کھیلتے ہیں اور کمال کی کھیلتے ہیں۔"

یہ صاحب جن کا نام میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہ سکا بین الاقوامی سطح کے کبڈی کے کھلاڑی رہے ہیں اور مجھے ایک طمانیت کا احساس ہوا کہ ہم ہر شے میں دوسروں کی پیروی کرتے ہیں تو کوئی ایک شے ایسی ہے جو ہم دوسروں کو سکھا رہے ہیں' بے شک وہ کبڈی ہی کیوں نہ ہو..

کوڈی کوڈی!

ٹرانزٹ لاؤنج آہستہ آہستہ پُر ہجوم ہونے لگا..

نہ یہاں ایئرپورٹوں والی گہما گہمی تھی اور نہ ہی اعلانات کا شور وغل' یہ ایک شاندار اگرچہ اُجڑتے ہوئے رُوسی محل کی طرح خاموش اور اپنے نیم شاہانہ سنہرے پن میں گم تھا.. یہاں منتظر مسافر منتظر ہی رہتے تھے کہ فلائٹ کی معلومات فراہم کرنے کا کچھ رواج نہ تھا.. مسافر اللہ توکل بیٹھے بار بار اپنے ایئر ٹکٹ چیک کرتے تھے کہ کیا پتہ ہماری فلائٹ نکل چکی ہو اور ہم یہاں لاعلم بیٹھے رہیں.. اور پھر وہ بے مقصد ادھر اُدھر گھومنے لگتے.. اُنہیں دوسرے مسافروں کے چہرے یاد ہو چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ کس مسافر نے واش روم کا کتنی بار چکر لگایا ہے.. پانچ گھنٹے کا مسافتی انتظار ایک عذاب ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے آپ کی "بیٹھک" پتھر ہو جاتی ہے.. وہی چہرے.. فرش کے پتھروں کی سجاوٹ اور ستون دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں..

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر معلومات حاصل کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا.. نہ سپیکرز پر کوئی اعلان' نہ ٹیلی ویژن سکرینوں پر کوئی اوقات تو جو مسافر آتے تھے' وہ جاتے کیسے تھے.. وہ آتے تو تاشقند انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر تھے لیکن جاتے لاہور کے لاری اڈے سے تھے.. یعنی ازبک ایئرلائن کی ایک پستہ قد خاتون نمودار ہوتی ہے اور بس کنڈکٹروں کی مانند پکارنے لگتی ہے ''کوالالمپور.. کوالالمپور''.. ہے کوئی کوالالمپور کا مسافر.. وہ سیڑھیاں اُترتی ہے پھر چڑھتی ہے' ریستوران اور واش روم میں جھانکتی ہے اور اونگھتے ہوئے مسافروں کے کانوں کے قریب منہ لے جا کر پکارتی ہے اور پکارتی چلی جاتی ہے..

پھر کسی صاحب کو پیرس جانے والوں کا خیال ستانے لگتا ہے اور وہ ''پیرس۔ پیرس'' پکارتے پورے لاؤنج میں بھاگ دوڑ کرنے لگتے ہیں.. ویسے ان لوگوں کو داد دینی چاہیے کہ وہ تاشقند سے روانہ ہونے والی اُس پرواز کی منزل اتنی بار پکارتے ہیں کہ جو لوگ پیرس نہیں جا رہے ہوتے اُنہیں اتنا رحم آتا ہے کہ یہ غریب کا بال ''پیرس پیرس'' کو کتا جاتا ہے تو کیوں نہ لندن کی بجائے پیرس ہی چلے جائیں.. اور یہ طریقہ اگرچہ ابتدائی اور سادہ ہے لیکن بے حد موثر ہے.. ٹیلی ویژن سکرین پر اوقات پرواز پڑھنے میں غلطی ہو سکتی ہے.. سپیکر پر جو اعلان ہوتے ہیں تو اکثر اُن میں اتنی گونج ہوتی ہے کہ پلے نہیں پڑتے لیکن جب ایئرلائن کے اہلکار آپ کے سر پر سوار ہو کر نعرے لگانے لگتا ہے تو سب کچھ نہایت آسانی سے پلے پڑ جاتا ہے..

ماسکو سے واپسی پر بھی ہم اس لاؤنج میں پانچ گھنٹے گوشہ گیر رہے تھے اور جب بالآخر ایک خاتون ''لاہور۔ لاہور'' پکارتی چلی آئی ہے تو جی چاہا کہ اُس کا منہ چوم لوں.. اور یہ میں محاورتاً کہہ رہا ہوں کہ اُن کا منہ اس لائق نہ تھا.. ایک تو اُنہوں نے یہ نوید تھی کہ اب ہم جس جہاز پر سوار ہوں گے وہ ہمیں سیدھا اپنے شہر اپنے گھر لے جائے گا لیکن اس سے سہانا جو تیر دل میں لگا وہ اُس خاتون کے اُزبک لہجے کا تھا جس میں لاہور اتنی خوبصورتی سے ادا ہو رہا تھا کہ..

بہرطور یہ ''لاہور لاہور'' کی نوبت تو ابھی پندرہ سولہ روز بعد آنی تھی' لمحہ موجود میں ''ماسکو ماسکو'' شروع ہو گیا.. گیٹ نمبر ایک پر معمولی سی چیکنگ ہوئی پھر ہم ماسکو کے مسافروں کو ایک بس میں بٹھا کر تاشقند ایئرپورٹ کی حال ہی میں تعمیر کردہ نہایت جدید ترین عمارت تک لے جایا گیا..

اب یہ ایک اور ہی جہان تھا..

کسی بھی بین الاقوامی جدید ایئرپورٹ کے ہم پلہ ایک اور جہان.. یہاں آرام بہت تھا اور لوگ بھی کم تھے.. ہم ایک نویں نکور راہداری کے لشکتے فرش پر چلتے گئے اور.. چلتے ہی گئے اور بالآخر ایک اور لاؤنج میں جا پہنچے..

یہ ماسکو جانے والوں کی آخری انتظارگاہ تھی..

اور یہاں بھی ایک طویل انتظار تھا..

اور یہاں بھی ایک ڈیوٹی فری شاپ تھی جس کا میمونہ بیگم نے تفصیلی دورہ کیا کہ کرنے کو اور کچھ نہ تھا.. یہ نہیں کہ وہ کانچ کے سامان اور مہنگے پرفیومز میں دلچسپی رکھتی تھیں کیونکہ اس کے پاس یہ سب کچھ پہلے سے ہی وافر تعداد میں موجود تھا.. کانچ کا سامان نہیں' مہنگے پرفیومز وغیرہ.. اُس کی خصوصی دلچسپی ازبکستان کی دستکاریاں تھیں.. اُس نے اُنہیں الٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھا.. سلائی کڑھائی کے نمونوں کو پرکھا.. کسی شال کے ٹانکے دیکھنے لگی کہ کون سے ڈیزائن کے ہیں.. ہاتھ کے کاڑھے ہوئے ایک دو کُشن دیکھے اور پھر رکھ دیئے ''یہاں ہمیں برصغیر کی تاریخ سمجھنے میں مدد ملتی ہے..'' اُس نے سر ہلا کر کہا..

''مونا بیگم.. خدا کے لیے ان تکیوں اور شالوں وغیرہ کا برصغیر کی تاریخ سے کیا سمبندھ ہو سکتا ہے؟''

''ذرا دیکھو یہاں ازبکستان کی دستکاریوں کے بہترین نمونے نمائش پر ہیں.. ان میں سے کوئی ایک ہے جس پر تمہارا دل ٹھہرتا ہو.. یاد ہے جب لوک ورثہ کے میلے میں سندھی دستکاریوں کے سٹالوں پر جاتے تھے تو کیسے ہر شال ہر رلی پر دل کے باقاعدہ ٹھہر جانے کے امکان پیدا ہو جاتے تھے.. اُن کے مقابلے میں یہ کتنے معمولی ہیں.. میری درزن ان سے کہیں بہتر سلائی کڑھائی کرتی ہے اور وہ کیسی خوش نما ہوتی ہے.. رنگوں کی پرکھ جیسے اُس کے خون میں رچی بسی ہو.. میں تو ان میں سے کوئی بھی دستکاری.. شال یا چادر وغیرہ اپنے گھر میں نہ رکھوں..''

''لیکن.. اس موازنے کا برصغیر کی تاریخ سے کیا تعلق ہے؟''

''یہ سنٹرل ایشیا والے اسی لیے تو بار بار ہم پر حملہ آور ہوتے تھے کہ ان کے پاس بس یہی کچھ تھا اور ہمارے پاس بہت کچھ تھا.. یہ لوگ اُدھر چین یا یورپ کا رُخ کیوں نہیں کرتے تھے' ہمیشہ ہماری جانب ہی چلے آتے تھے۔''

مُونا بیگم اپنے خطّے کے بارے میں ایک بنیاد پرست عورت تھی اور اُس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی..

وہ لاہور سے تاشقند تک کی پرواز کے دوران بھی کھڑکی سے جھانکتی بڑبڑاتی رہی "ذرا دیکھو کیسی ویرانی اور کیسا اُجاڑ پن ہے.. افغانستان ہے ناں.. اور یہ ازبکستان بھی کچھ ہرا بھرا نہیں ہے.. تبھی جو اٹھتا تھا ہماری جانب چلا آتا تھا.. اور پھر بابر کی طرح اپنے فرغانہ کی یاد میں آہیں تو بھرتا تھا' ہندوستان اور ہندوستانیوں کو جی بھر کے کوستا تھا' پر مجال ہے واپس جانے کا نام لیتا ہو.. پنجاب کی ہریاول دیکھ کر کون واپس جاتا ہے۔"

وہ یقیناً تاریخی حقیقتوں سے یکسر نابلد عورت تھی.. راجپوت ہونے کے ناطے سے یوں بھی غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے اُس کے دل میں میرے علاوہ اُن کے لیے بھی کوئی نرم گوشہ نہ تھا.. ایسی جاہل تھی کہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لوگ تو محض اسلام کی سربلندی کے پھریرے لہراتے ہندوکش عبور کر کے اتنے کشت کاٹ کر آتے تھے ورنہ وہ اپنے اپنے فرغانہ اور غزنہ وغیرہ میں چین کی زندگی بسر کرتے تھے..

اب جس نئی انتظار گاہ میں ہم محوِ انتظار تھے یہاں بھی کھانے وغیرہ کا کچھ رواج نہ تھا.. صرف پینے کا تھا..

ایک جانب ایک نہایت ستھرا اور پُرکشش بار کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک اچھی شباہت والا نوجوان ہر چار پانچ منٹ بعد کافی بناتا تھا اور خود ہی پی جاتا تھا کہ گاہکوں کی شدید کمی تھی.. البتہ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے ایک اونچے سٹول پر براجمان ایک زہریلی نشیلی آنکھوں والی نہایت بھدے بدن والی عورت اگر کچھ پیتی تھی تو صرف سگریٹ پیتی تھی.. مسلسل دھواں اُگلتی جا رہی تھی..

دو چار اور لوگ بھی آئے' کھایا پیا کچھ نہیں' نوجوان کے ساتھ گپیں لگائیں' چند سگریٹ پھونکے اور چلے گئے..

یہ لوگ.. اُزبک اور رُوسی.. چمنیوں کی مانند دھواں اُگلنے کی فیکٹریاں ہیں.. اُن تک مغرب کی پھیلائی ہوئی.. خبردار سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے.. والی خبر ابھی تک نہیں پہنچی.. وہ بے دریغ دھواں دیتے ہیں.. ان خطوں میں آس پاس کہیں نگاہ کریں تو کہیں نہ کہیں دھواں اُٹھ رہا ہو گا اور آپ کو یہ دریافت کرنے کی چنداں حاجت نہیں کہ یہ دھواں کہاں سے اُٹھتا ہے' یہ یقیناً کسی ازبک یا رُوسی سے اٹھتا ہے.. ماسکو میں بھی واڈکا کی مرغوبیت کے ہمراہ سگریٹ کی محبوبیت بھی

ہے.. امریکہ اور یورپ کی مانند ایک سگریٹ پینے والے کو شودر اور اچھوت نہیں سمجھا جاتا.. ایک مجرم نہیں گردانا جاتا بلکہ جو سگریٹ نہ پیئے تو اُس پر شک کیا جاتا ہے کہ اگر یہ ایک انسان ہے تو اس کے نتھنوں سے دھواں کیوں خارج نہیں ہو رہا..

اس جدید انتظار گاہ میں ٹرانزٹ لاؤنج والی بے خبری نہ تھی' ہر لمحے کی خبر ٹیلی ویژن سکرین پر چل رہی تھی اور بالآخر ماسکو جانے والی پرواز کے لیے درخواستیں شروع ہو گئیں کہ خواتین و حضرات اب چلے آیئے' ہم چشم بہ راہ ہیں..

پانچواں باب

”ایک مخمور جہاز ماسکو چلا جا رہا ہے“

لاہور سے تاشقند آنے والا جہاز بمشکل اور تقریباً ایک جہاز تھا‘ اتنا چھوٹا تھا..

اور تاشقند سے ماسکو کے لیے روانہ ہونے والا جہاز بہت ہی جہاز تھا.. جہاز بھی نہ تھا ایک بس تھا اگرچہ یہ ہوائی تھی یعنی ایئر بس تھی نہایت وسیع و عریض ایک چھوٹی سی شاہانہ دنیا تھی.. اور یہ دنیا از حد شاہانہ اس لیے بھی تھی کہ ہم پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے سینکڑوں مسافروں کی مانند اکانومی کلاس کے کمی کمین نہ تھے بلکہ بزنس کلاس کے چوہدری تھے جہاں ہم دونوں کے علاوہ دیگر تمام مسافر روسی تھے جن کی ثروت مندی نہایت عیاں تھی.. آپ انہیں تازہ ترین سرمایہ دارانہ نظام کے نودولتیے بھی کہہ سکتے ہیں.. وہ بے حد مہنگے لباسوں میں تھے جن کے پرائس ٹیگ اگرچہ اُتار دیے گئے تھے لیکن اُن کی مہک سے قیمت کا اندازہ ہو جاتا تھا.. اُن کی عورتوں کے سینوں پر جواہرات کی چکا چوند تھی اور کلائیوں پر ایسی گھڑیاں بندھی تھیں جن کی قیمت سے کامریڈ لینن سو زندگیاں آسانی سے گزار سکتا تھا اور پھر بھی کچھ پس انداز کر سکتا تھا‘ وہ نہایت نازک اندامی سے گفتگو کرتی تھیں اگرچہ نازک اندام نہ تھیں..

پرواز کے آغاز میں ہمیں ایک مرتبہ پھر جوتوں سے نوازا گیا..

یعنی بیڈ روم سلیپرز سے.. اتنے نرم جیسے خرگوشوں پر پاؤں آ گئے ہوں..

ہم سے درخواست کی گئی کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ نے جو جیکٹ پہن رکھی ہے اُسے اُتار دیں تو ہم اُسے ہینگر پر لٹکا کر وارڈ روب میں محفوظ کر دیں تاکہ آپ پُرسکون ہو کر استراحت فرمائیں..

میں تو وہی اپنی من موہنی چاہت بھری فلیس کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس نے کینیڈا

کی راکی چٹانوں‘ یوکان وادی اور الاسکا کے برف زاروں میں میرا ساتھ دیا تھا.. جسے بینش سید نے مجھے تحفے کے طور پر دیا تھا.. اور مونا ایک نہایت فیشن ایبل.. ففتھ ایونیو کے کسی فیشن گھر کی نہایت مہنگی بھورے رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے تھی جو اس نے عینی سے مستعار لی تھی اور وہ اس میں قدرے نوخیز لگ رہی تھی.. اتنی نوخیز تو نہیں کہ میں پھر سے رجوع کر لیتا لیکن پہلے سے بہتر لگ رہی تھی..

چنانچہ ہم سے پہلے ہماری جیکٹوں کی عزت افزائی کی گئی اور پھر ہماری آؤ بھگت شروع ہو گئی.. ہم ایئر ہوسٹس کی جانب اتفاقاً بھی دیکھ لیتے تو وہ وائن یا شیمپین کے جام چھلکاتی چلی آتی کہ سَر.. میمونہ ناک چڑھا کر اورنج جوس کی فرمائش کرتی اور میں ناک تو نہ چڑھا سکتا لیکن بامر مجبوری اور بزدلی جوس کی ہی فرمائش کرتا.. ہم دونوں کے علاوہ کسی اور نشست سے وہ جام خالی نہ گئے.. ادھر سے بھی گئے تو بامر مجبوری ہی گئے..

اور کبھی یہ میزبان خواتین مہربان خواتین خواہ مخواہ ہمارے سر تلے رکھے تکیے سہلانے لگتیں.... اور کبھی ہمارے گھٹنوں پر کمبل پھیلا کر تھپکتیں اور اس تھپک سے مجھے قدرے پریشانی ہوتی اور کبھی مجھ سے دریافت کرتیں کہ سَر میں ریڈنگ لائٹ جلا دوں اور اگر آپ پسند کریں تو بوٹ اُتار کر یہ نرم سلیپر پہن لیں‘ میں آپ کی مدد کرتی ہوں..

مونا کہنے لگی.. بے شکر صبر اور قناعت کا اپنا ثواب ہے لیکن بندے کے پلّے میں کچھ ہو تو ہمیشہ اکانومی کی بجائے بزنس کلاس میں سفر کرے.. ورنہ نہ کرے..

کہتے ہیں کہ جاٹ ملوک بھی شتابی سے ہو جاتا ہے یعنی اگر جاٹ کو آسائش حاصل ہو جائے تو وہ فوراً اُس کا عادی ہو جاتا ہے.. تو ہم بھی ملوک ہو گئے تھے‘ ہماری آنکھوں کے لیے ایئر بس کا اندرون تھا کہ وہاں اُس وسیع پُرآسائش ماحول میں کیسی مہک تھی.. اور باہر رات ہو چکی تھی اور ہم ایک تاریک خلا میں پرواز کرتے چلے جا رہے تھے..

کھانا سرو ہونے لگا تو اُس کے ڈھنگ بھی نرالے تھے..

اکانومی کلاس میں تو ایئر ہوسٹس کھانا پیش نہیں کرتی.. منہ پر تو نہیں دے مارتی۔ آپ کی میز پر مارتی ہے کہ لو.. اور کیا چاہتے ہو.. کھانا ہے تو کھاؤ.. ورنہ..

اور یہاں ایئر ہوسٹس منت سماجت کر رہی ہے‘ بچھی جا رہی ہے کہ سَر.. میڈم..

کھانے کی جو طشتریاں ہمارے سامنے آئیں اُن میں خوراک کی سجاوٹ اتنی انوکھی اور ترتیب شدہ تھی کہ اس میں سے اگر کھیرے کی ایک پھانک اُٹھا لیں تو پوری کمپوزیشن خراب ہو جاتی تھی..

میں نے مونا سے کہا "ذرا غور سے اس خوراک کو دیکھو بیگم.. یہ لوگ اسی لیے صحت مند اور چاق و چوبند رہتے ہیں کہ اس نوعیت کی خوراک کھاتے ہیں.. قدرتی اور وٹامن سے بھرپور.. یہ ذرا پنیر کی مختلف اقسام ملاحظہ کرو.. سلاد کے سو رنگ دیکھو.. سرکے میں بھگوئے ہوئے زیتون جو آسمانی صحیفوں کے پسندیدہ ہیں.. اور یہ جاپانی شوشی.. کچی مچھلی.. ٹماٹر.. آڑو.. اور گرم قیمہ بھری روٹیاں.. گوشت کے سو طرح کے قتلے جنہیں بے فکر ہو کر کھایا جا سکتا ہے کہ ایئر ازبک ہے اور گوشت حلال ہے.. بلکہ یہ جھینگے بھی حلال ہیں اور چقندر بھی.."

"ویسے جتنا کچھ بھی ہے ایسا تازہ ہے کہ.. لیکن مجھے ایک شکایت ہے کہ سب کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا رہے.. بہرحال بہت ہی ذائقے دار ہے.."

ابھی ہم نبرد آزما تھے کہ ایئر ہوسٹس نے وہ طشتریاں اٹھالیں اور اُن کی جگہ بھاپ اُڑاتی.. ذائقے کی مہک کی دھوم مچاتی خوراک کی مزید طشتریاں رکھ دیں..

ہم انجان مڈل کلاسیے کہاں جانتے تھے کہ طشتریٔ اوّل تو محض بھوک کو اشتہا دینے کا ایک بہانہ تھا.. ایک اپے ٹائزر تھا اور اصل کھانا تو اب پیش کیا جا رہا تھا.. اور اس میں شامل گائے کے گوشت کے قتلے تو ایسے تھے کہ ایک براہمن بھی برگشتہ ہو جائے..

اور ہاں دوسری خوراک کے ہمراہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایئر ہوسٹس باریک اور نازک کانچ کے گلاس بھی لیے چلی آ رہی ہے جن کے پیراہن رنگین ہو رہے ہیں تو میں نے مونا سے کہا: "تم دعا کرو کہ یہ خاتون مجھے آزمائش میں نہ ڈال دے.. ویسے تو تم جانتی ہو کہ مجھے اس شے سے مکمل پرہیز ہے لیکن بندے پرندے کا کیا پتہ.. کب بدل جائے.. کب اُڑ جائے.. یعنی اگر ایئر ہوسٹس عین پوچھے خوراک کے ہمراہ ایک لبریز کانچ دھری جاتی ہے تو پھر میں کیا کروں گا.. ظاہر ہے کہیں تو انڈیل دوں گا' حلق میں تو نہیں تو پھر کہاں انڈیلوں گا.. جہاز کی کھڑکی بھی کھل نہیں سکتی تو پھر.. بس تم دعا کرو.."

پتہ نہیں مونا نے دعا کی بھی یا نہیں اور اگر کی تو اُس کا کچھ اثر ہوا بھی یا نہیں.. مونا کی ناک پھر چڑھ گئی "یہ ازبک ایئر والے گوشت تو حلال سرو کرتے ہیں تو اس کے ساتھ شراب کیوں پیش کرتے ہیں.."

"مونا بیگم یہ ابھی ابھی ملحدانہ کمیونزم کے چنگل سے نکلے ہیں.. معصوم لوگ ہیں۔ ان تک ابھی ہمارا اسلام نہیں پہنچا.. کمیونزم نے انہیں شراب کی لت لگا دی ہے اور یہ دین کے بارے

میں نادان ہو گئے ہیں.. میں نے تمہیں وہ قصہ نہیں سنایا کہ ایک پاکستانی عالم دین بخارا پہنچے اور وہاں کے ایک فقیہہ سے کوئی دینی مسئلہ پوچھا.. فقیہہ نے علم و فضل کے دریا بہا دیے کہ اسلام انہی خطوں سے ہی تو برصغیر میں داخل ہوا تھا.. ہم تو ہر بخاری کو صحیح سمجھتے ہیں.. دینی مسئلہ حل کرنے کے بعد وہ فقیہہ اپنا لبادہ اور دستار سنبھالتے اپنے حجرے میں گئے اور وہاں سے کانچ کا کچھ سامان لا کر پاکستانی عالم کے سامنے رکھ دیا کہ مولانا.. آپ واڈکا پسند کریں گے یا بخارا کے انگوروں کی شراب.. تو یہ لوگ ابھی راہِ راست پر نہیں آئے.. یوں بھی تجارتی مجبوریاں ہیں۔ اگر یہ پرواز کے دوران شراب سرو نہ کریں تو ان کا کاروبار ٹھپ ہو جائے.. تم دیکھ رہی ہو کہ سب مسافر روسی ہیں اور کوئی ایک مسافر ایسا ہے جس نے اجتناب کیا ہو.."

بزنس کلاس کے اندر ایک پُر مسرّت پارٹی کا سا سماں تھا.. امیر ہو چکے روسی اپنے کوٹ ایئر ہوسٹس کے حوالے کر کے آستینیں چڑھائے دیگر روسیوں کے ساتھ مخموری ملاقاتیں کر رہے تھے.. اُن کی عورتوں کے ہیرے جواہرات بھی خمار میں لگتے تھے کہ کبھی بھڑک اٹھتے تھے اور کبھی بجھ جاتے تھے.. ایک تنومند اور خوش شباہت روسی جو میری عمر کا ہوگا' اُس نے ازبک ایئر لائن پر اعتماد نہ کیا تھا اور اپنی ذاتی سپلائی ساتھ لے کر آیا تھا.. وہ شیواز ریگل کی ایک بوتل کو ایک محبوبہ کی مانند تھامے ہوئے نشستوں کے درمیان چہل قدمی کرتا تھا' بلند آواز میں پُر لطف باتیں کرتا تھا اور جس کسی کا بھی گلاس خالی ہونے لگتا تھا اُسے بھر دیتا تھا.. شراب نے اُن تمام اجنبیوں کو وقتی طور پر خمار کے ایک رشتے میں باندھ دیا تھا..

ہمارے برابر میں جہاز کی مرکزی نشستوں پر ایک صاحب ٹائی کی گرہ کھولے.. نہایت مدبّر اور خوش شکل صاحب تنہا بیٹھے تھے اور صرف سلاد اور پنیر پر گزارہ کر رہے تھے اور وہی شغل کر رہے تھے جو شغل کہلانے کا مستحق ہے.. وہ ہر پانچ دس منٹ بعد ایئر ہوسٹس سے مسکراتے ہوئے کسی شراب کی ایک ننھی منی یعنی منی ایچر بوتل طلب کرتے اُسے اپنے گلاس میں اُنڈیلتے اور رغبت کے ساتھ نہیں قدرے بیزاری کے عالم میں دو چار گھونٹوں میں ختم کر دیتے.. ماسکو پہنچنے تک اُن کی میز پر اور برابر کی خالی نشست پر درجنوں کی تعداد میں یہ مختصر بوتلیں بکھری ہوئی تھیں.. آغاز میں جب ایئر ہوسٹس ان خالی بوتلوں کو اُٹھانے کے لیے آئی تو اُنہوں نے اُسے سختی سے منع کر دیا کہ میں کچھ حساب رکھنا چاہتا ہوں اور یوں بھی رونق لگی ہوئی ہے اسے نہ اجاڑو.. مونا بھی اُن صاحب کو ذرا اچنبھے سے تکتی تھی کہ یہ چپ سے صاحب اتنی ڈھیر ساری مختلف نوعیتوں کی شرابیں پی جانے کے

بعد بھی.. کہ نشہ بڑھتا ہے جو شرابوں میں شرابیں ملیں تو اُن کا نشہ ابھی تک کیوں نہیں بڑھا.. نہ انہوں نے کوئی غل غپاڑہ کیا ہے اور نہ ہی خمار آلود ہو کر جہاز کی راہداری میں کھڑے ہو کر ٹھمکے لگائے ہیں.. بلکہ یہ کیا ہے کہ وہ اس دوران نہایت انہماک سے اپنے آپ میں مگن کوئی انگریزی ناول مسلسل پڑھتے رہے..

میں تو یہی تصور کر سکتا تھا کہ اگرچہ وہ ناول انگریزی زبان میں تھا لیکن اتنے خمار کے بعد وہ اُسے روسی زبان میں ہی پڑھ رہے تھے..

لیکن یہ ایک خیال خام تھا.. روسی شراب کے اتنے عادی ہیں کہ وہ اپنے ہاں کی مانند دو گھونٹ پی کر حواس نہیں کھو بیٹھتے.. غل غپاڑہ مچاتے بونگیں نہیں لگانے لگتے.. وہ ناول جو انگریزی میں تھا وہ اُسے نہایت انہماک سے انگریزی میں ہی پڑھ رہے تھے.. اور سانس کم لیتے تھے اور گھونٹ زیادہ بھرتے جاتے تھے.. وہ شراب پینے کی تہذیب سے واقف تھے..

وہ دو ڈھائی گھنٹے لاہور سے تاشقند تک کے گزرتے نہ تھے اور یہ ساڑھے چار گھنٹے تاشقند سے ماسکو تک پل بھر میں گزر گئے..

اور ہاں ہمارے سارے پیسے پورے ہو گئے بلکہ کچھ اُدھار بھی ہمارے ذمے ہو گیا..

چھٹا باب

"سنہری آنیا' برچ کے جنگل اور شیمپئن کی بوتل"

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب تاشقند سے آنے والا یہ مخمور شدہ جہاز ماسکو میں اُتر گیا۔

حسب اوقات اور حسب شہرت و ناموری ہر کوئی بے خطر بلا کسی روک ٹوک کے پار ہو گیا لیکن ہم دونوں میاں بیوی کو پاکستانی ہونے کے جرم میں روک لیا گیا.. ہمارے ویزے تادیر ملاحظہ کیے گئے.. خورد بینوں اور دوربینوں سے چیک کیے گئے.. ہمیں نہایت خشونت آمیز نظروں سے دیکھا گیا کہ کہیں یہ چیچنیا میں جہاد کرنے تو نہیں جا رہے.. ہم دونوں کی شکلوں کو غور سے دیکھ کر اُنہیں پاسپورٹوں پر چسپاں تصویروں سے ملایا گیا اور پھر کسی بہت بڑے افسر کو بلا کر مشورہ کیا گیا کہ انہیں جانے دیں یا روک لیں.. اس کے باوجود کہ ہم ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کے اور اس ناطے سے حکومت روس کے مدعو کردہ مہمان تھے.. پر ہم ان کو دوش نہیں دے سکتے تھے..

تو رات کے گیارہ بج رہے تھے..

ایک تو سفر کی تھکاوٹ بدن میں بسیرا کرتی تھی اور اُس میں عمر کی بوسیدگی اور زوال کی آمیزش ہوتی تھی تو ہمارا حال اتنا اچھا نہ تھا.. جیسی میری حالت اب ہے.. کبھی ایسی تو نہ تھی..

میری بیٹی ڈاکٹر عینی کی ایک نہایت ہی دل خراش عادت ہوا کرتی تھی.. جب بھی امتحانوں کے دن آتے تو وہ ہر امتحان سے پیشتر.. جب وہ سکول یا کالج کے لیے گھر سے نکلنے کو ہوتی تھی تو یکدم دھاڑیں مار مار کر بے حد دردناک آواز میں رونا شروع کر دیتی تھی اور جب مُونا اُسے دلاسے دیتی کہ ماشاءاللہ تم اتنی لائق ہو.. دن رات محنت کی ہے اور تمہیں سب کچھ آتا ہے تو کیوں روتی ہو تو وہ ہچکیاں بھر بھر کر کہا کرتی تھی.. امی اب تو سب کچھ آتا ہے لیکن کمرۂ امتحان میں نہ آیا تو...

ہم لاکھ ڈھارس بندھاتے پر وہ چپ نہ ہوتی کہ.. وہاں نہ آیا تو..

وہ یقیناً مجھ پر گئی تھی کیونکہ میں بھی اس.. نہ آیا تو.. سنڈروم کا شکار تھا..

بے شک یہ ایک بین الاقوامی سیمینار ہے.. ادبی کانفرنس ہے.. اُنہیں میری آمد کی اطلاع ہو چکی ہے' وہاں کھنڈ ڈوتی یا برلن ایئرپورٹ پر کوئی نہ کوئی تو مجھے لینے آئے گا... لیکن.. نہ آیا تو... بے شک روانگی سے پیشتر اُنہوں نے کنفرم کیا تھا کہ اُن کے نمائندے ایئرپورٹ کے باہر موجود ہوں گے.. نہ موجود ہوئے تو..

کوئی نہ آیا تو... نہ موجود ہوئے تو.. کیا کروں گا' کدھر جاؤں گا..

تو یہاں بھی بے شک ڈوگینی نے بار بار یقین دہانی کروائی تھی کہ آنیا بہر صورت ماسکو ایئرپورٹ پر آپ کو لینے آئے گی.. وہاں موجود ہوگی.. لیکن یہ خدشہ یہاں بھی دامنگیر تھا کہ نہ موجود ہوئی تو.. ایئرپورٹ سے باہر آئے.. سامان کے لیے ٹرالی میسر نہ تھی اس لیے اُسے ہم دونوں گھسیٹتے ہوئے جب باہر آئے تو وہاں نہ کوئی آنیا اور نہ کوئی جانیا..

حیران پریشان جنگل بیابان کہ ہم نہ کہتے تھے.. کہ نہ موجود ہوئی تو..

اور تب لوگوں کے ہجوم میں ایک بورڈ پر جلی حروف میں ''تارڑ'' لکھا دکھائی دیا.. اور یہ بورڈ آنیا نے بلند کر رکھا تھا..

آنیا کی جو تصویر میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی اُس میں وہ ایک موٹی تازی ہنس مکھ باتونی ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس دہقان سی لڑکی تھی پر وہ اس کے برعکس ایک نازک ملوک نفیس لباس میں سجی ایک بلند قامت سنہری سی لڑکی تھی اور خاموش طبع تھی..

ڈیمز ماسکو یونیورسٹی کا تفویض کردہ ڈرائیور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے چلا جا رہا تھا اور چلا جا رہا تھا..

اور باہر ایک گھُپ اندھیارے میں بارش گرتی چلی جاتی تھی..

ڈیمز مناسب انگریزی بول سکتا تھا ''ہمارا ہوٹل یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''جب وہاں پہنچیں گے تب معلوم ہوگا کہ کتنی دور ہے..''

''پھر بھی..''

''کافی سے ذرا زیادہ دور ہے..''

آنیا بات کم کرتی اور مسکراتی زیادہ.. رُک رُک کر کندھے سکیڑ کر اردو میں کچھ کہتی.. پھر

وہی کچھ انگریزی میں کہنے کی کوشش میں اٹک جاتی اور تب وہ بے بسی میں ہاتھ اونچے کر کے مسکرانے لگتی.. اور پھر دیر تک چپ رہتی.. وہ رات کے اس پہر اتنی دور سے.. کافی سے ذرا زیادہ دور سے اس بارش میں ہمیں ایئرپورٹ پر لینے پہنچ گئی تھی.. دل ہی دل میں ہم بہت شکر گزار ہوئے کہ نہ پہنچتی تو.. ماسکو حسب توقع سرد تھا اور ایئرپورٹ سے نکلتے ہی ہم اپنی جیکٹوں کے بھی شکر گزار ہوئے..

کچھ ویرانی سی تھی اور شاہراہ کے دونوں جانب برچ کے سفید تنوں کے جنگل بھیگتے چلے جاتے تھے..

اُن زمانوں میں پچاس برس پیشتر ہم دریائے ماسکو کے کنارے برچ کے ایسے ہی گھنے جنگلوں کے اندر پکنک منانے گئے تھے..

میں نے زندگی میں پہلی بار برچ کے قد آور سفید تنوں والے درخت نیلے آسمان کے اندر تک سرایت کرتے ہوئے دیکھے تھے.. اور وہاں ایک ڈینش لڑکی تھی جس کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے سے برچ کے جنگلوں کی سفیدی نیلاہٹ کے سمندر میں ڈوبتی نظر آتی تھی..

''مونا..'' میرا خیال تھا کہ وہ اونگھ رہی ہوگی لیکن وہ آنکھیں پھڑپھڑاتی کار سے باہر دیکھے چلی جا رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر اُس کے چہرے پر سفر کی تھکاوٹ کے آثار اگر تھے تو کم تھے ''دیکھو.. یہ جنگل برچ کے ہیں جو گزرتے جا رہے ہیں..''

''کیا میں برچ کے جنگلوں کو نہیں جانتی..'' شاید وہ مسکرائی ''میں نے انہیں فیئری میڈوز کے جنگل سے پرے نانگا پربت کے بیس کیمپ کی قربت میں دیکھا تھا.. یاد ہے جب تم مجھے اور عینی کو بیال کیمپ میں ایک ندی کے کنارے چھوڑ کر اوپر چلے گئے تھے تب دیکھا تھا.. یاد ہے؟''

ہمیں بتایا تو یہی گیا تھا کہ بیال کیمپ سے نانگا پربت کے بلند بیس کیمپ تک آنے جانے میں صرف دو تین گھنٹے لگیں گے اور ہم مونا اور عینی کو ایک ندی کے کنارے چھوڑ کر ''ابھی ہم آتے ہیں'' کی تسلی دے کر اوپر چلے گئے تھے.. اور واپسی پر رات ہو گئی تھی اور سلجوق پر بلندی کا اثر ہو گیا تھا اور ہم اُسے تقریباً اُٹھاتے ہوئے نیچے اُس ندی تک آئے تھے اور وہاں ظاہر ہے نہ مونا تھی اور نہ عینی.. پھر ہم شاید برچ کی شاخوں کو آگ دکھا کر اُن کی شمعیں بنا کر واپس فیئری میڈو پہنچے تھے اور ماں بیٹی نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا کہ ہر کوئی کہتا تھا کہ بیگم صاحب وہاں برفانی بلندیوں پر کوئی حادثہ ہو گیا ہوگا.. رات کے وقت نانگا پربت بیس کیمپ سے فیئری میڈو واپس پہنچنا

ممکن ہی نہیں۔ مُوتا ایک عرصے تک مجھ سے خفا رہی اور اس کے بعد جو سیاح فیری میڈو پہنچتے تھے انہیں سرخ بالوں والا شکور ہمیشہ یہ بتاتا تھا کہ تارڑ صاحب کا کیمپ ادھر تھا اور اُن کا بیگم اُن سے بولتا نہ تھا۔ مجھے خوب یاد تھا۔

"برچ کے درخت ہمیشہ سرد موسموں میں پنپتے ہیں۔ ماسکو میں نہ ہوں گے تو اور کہاں ہوں گے۔" میمونہ کہہ رہی تھی اور پھر اُس نے آنیا سے رجوع کیا اور نہایت آسان اردو میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا "آپ اردو پڑھتی ہیں؟"

"ہاں۔ میں ماسکو یونیورسٹی میں اردو پڑھتی ہوں۔" اُس نے فر فر سنا دیا۔

"آپ کیا پڑھتی ہیں؟"

"میں مستنصر کی "فاختہ" پڑھتی ہوں۔"

میں نے آئندہ دنوں میں بھی نوٹ کیا کہ یہ آنیا اگرچہ ابھی انیس برس کی ہونے کو ہے لیکن یہ کبھی مجھے مستنصر انکل یا مستنصر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کرتی بلکہ نہایت بے تکلفی سے صرف مستنصر کہہ کر بلاتی ہے جیسے میں اُس کا کوئی ہم عمر ہوں۔

مستنصر ادھر دیکھو یہ سرخ چوک ہے۔ مستنصر کھانا کھاؤ گے۔ مستنصر کیا تم ٹائلٹ جانا چاہتے ہو۔ شاید یہ اُس کے کلاس روم کا تسلسل تھا اور نصابی کتاب کا اثر تھا کہ طالب علم بیان کریں کہ مستنصر کو ماسکو کیوں پسند آیا تھا۔ مستنصر کیوں پاسکل کو پیرس کے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور مستنصر... وغیرہ وغیرہ۔ ورنہ وہ اتنی بدتمیز بچی نہ تھی۔

بارش سے بھیگتا، کسی حد تک سردی میں ٹھٹھرتا ماسکو جو سفری تکان کے باعث لگتا تھا کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے گزر رہا تھا جب کہ محض ڈیڑھ گھنٹے میں گزر رہا تھا بہت تاریک اور بجھا بجھا سا شہر لگتا تھا۔ اُس کی جانب سے اُلفت کا کوئی سندیسہ نہ آتا تھا اور نہ ہی وہ یہ وعدہ کرتا تھا کہ میں کبھی پُرکشش اور دل پذیر بھی ہو سکتا ہوں۔

ایک مدت کے بعد جب ہم اس یقین کے اسیر ہو چلے تھے کہ اس بھیگتی سرد رات میں یہ کار برچ کے جنگلوں کے درمیان میں ابد تک سفر کرتی رہے گی۔ تو یہ کار دھیمی ہوئی اور ایک روشن پُرآسائش دکھائی دیتے کثیر المنزلہ ہوٹل کے اندر داخل ہو گئی۔

ڈیمر نے اپنا آخری سگریٹ پھونک کر خالی ڈبیا باہر پھینک دی "یاتا دور تھا۔"

ہم کار سے باہر آ کر اپنا سامان سمیٹنے کو تھے کہ متعدد چوبدار حاضر ہو گئے۔ سامان کے

علاوہ اُنہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ میرا ذاتی بیگ اور سگریٹ کا پیکٹ بھی اُٹھا لیں۔

ہوٹل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پُرلطف اور پُرآسائش دکھائی پڑتا تھا۔ میں نے آنیا کی مدد سے استقبالیہ کاؤنٹر پر کھڑی خاتون سے استفسار کیا "یہاں۔ اس نام سے۔ ہمارے لیے ایک کمرہ مختص ہونا چاہیے۔"

مسکراہٹ سے عاری روسی خاتون نے کاؤنٹر کے پیچھے پوشیدہ کمپیوٹر پر متعدد بار انگلیاں چلائیں اور کہنے لگی۔ "آپ کے لیے کوئی کمرہ نہیں۔"

اُس نے اتنا کہا تو میرا دم رُک گیا کہ۔ کمرہ نہ ہوا تو۔ لیکن اُس نے فوراً ہی فقرہ مکمل کر دیا "آٹھویں منزل پر آپ کے لیے ہماری پریذیڈنشل سویٹ ریزرو کی جا چکی ہے۔"

"جی بہت بہت شکریہ۔" میں نے اتنے اطمینان اور اعتماد سے کہا جیسے میں نے آج تک پریذیڈنشل سویٹ کے سوا کسی عام سے کمرے میں قیام ہی نہ کیا ہو۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ہاں۔ مجھے ای میل کے ذریعے اس سانحے کی اطلاع تو کر دی گئی تھی۔

میں نے مناسب دستاویزات پر دستخط کرنے کے بعد سویٹ کا کی کارڈ وصول کیا تو آنیا پہلی بار تھکاوٹ سے نڈھال ہوئی اور اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی "شاید ڈھائی بجنے کو ہیں۔ مستنصر آپ مجھے اجازت دیں۔ میں ابھی ڈرائیور کو فارغ کر کے پہلے میٹرو اور پھر ایک بس کے ذریعے صبح تک اپنے گھر پہنچوں گی لیکن آپ نے۔" اس نے بیگ میں سے ایک حکم نامہ سا برآمد کر کے اُس کا مطالعہ کیا "لیکن آپ نے کل سویر پورے نو بجے تیار ہو جانا ہے کیونکہ کل "وکٹری ڈے" ہے اور ہمیں "وکٹری پارک" کے جشن میں شریک ہونا ہے۔ خدا حافظ۔"

تنویر بھٹہ نے میری سٹڈی میں بیٹھے ہوئے اس "وکٹری ڈے" کا کیا ہی نقشہ کھینچا تھا کہ تارڑ صاحب آپ تو بہت نصیب والے ہیں کہ 8 مئی کو ماسکو جا رہے ہیں کیونکہ 9 مئی کو "ان کا"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ذخاروف کی جانب اشارہ کیا تھا۔ "ان کا "وکٹری ڈے" ہوتا ہے۔ روس کا سب سے بڑا قومی تہوار اور جشن ہوتا ہے جس روز روسی افواج نے برلن پر پرچم لہرا کر دوسری جنگ عظیم کو نہ صرف اختتام تک پہنچایا تھا بلکہ نازیوں کو شکست فاش دی تھی۔ آپ نے اس جشن میں بہر صورت شرکت کرنی ہے اور ہاں اسی شب سرخ چوک میں روسیوں کے ہجوم میں شامل ہو کر آتش بازی کا عظیم مظاہرہ بھی دیکھنا ہے۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی طویل مسافت، تاشقند میں پانچ گھنٹوں کے انتظار کی

کوفت اور اس کے نتیجے میں بدن پر نازل ہونے والی تھکاوٹ اور غنودگی کے باوجود دو چار گھنٹے بعد پھر سے بیدار ہو سکوں گا یا نہیں پر میں نے مروّت میں آنیا سے وعدہ کر لیا کہ.. ہم کل سویر تمہارے منتظر ہوں گے اور تیار ہوں گے.. انشاءاللہ..

''خدا حافظ..'' آنیا نے کہا اور رخصت ہو گئی۔

ہوٹل کی آٹھویں اور آخری منزل پر واقع اس پریذیڈنشل سویٹ کا نمبر آٹھ سو بارہ تھا اور ہم دونوں اس میں داخل ہوئے تو گویا ایک صحرا میں داخل ہو گئے اور راستے بھول کر بھٹکنے لگے کہ یہ ہماری مڈل کلاس توقعات اور اوقات سے کہیں بڑھ کر وسیع تھی..

میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی کلاس سے باہر نہیں آ سکتا' باہر آنے کی کوشش کرتا ہے تو پچھاڑا جاتا ہے۔ اگر ایک مڈل کلاس شخص کو کسی معجزے کے تحت ایک سلور روز رائس عطا کر دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ یہ تمہاری ہے تو وہ اس میں بیٹھے گا نہیں بلکہ ایک کپڑے سے اُسے لشکانے اور چمکانے میں مصروف ہو جائے گا کہ اُس کی اوقات یہیں تک ہوتی ہے.. وہ اس میں بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا..

شاید اسی لیے میں اس سویٹ میں بے آرام سا محسوس کر رہا تھا کہ پتہ نہیں اس میں سونا بھی چاہیے یا نہیں..

یہ کیفیت صرف میری تھی' مُونا پر اس سویٹ کی شاہانہ شانداری کا کچھ اثر نہ ہوا تھا بلکہ اُس نے بستر کے تکیوں کو تھپک کر اعلان کیا کہ ان کی نسبت ہمارے تکیے زیادہ نرم ہیں.. جب حواس ذرا بحال ہوئے تو جو دیکھا اُس نے نہال کر دیا.. ڈائننگ روم سے ملحقہ وسیع لاؤنج کے درمیان میں شیشے کی میز پر فرانسیسی شیمپئن کی ایک بوتل برف سے بھری بالٹی میں ٹھنڈی ہو رہی ہے اور اس کے آس پاس پھل فروٹ اور چاکلیٹ سجے ہیں اور انتظامیہ کی جانب سے خوش آمدید کا پیغام ایک سنہری لفافے میں پوشیدہ یہ درخواست کرتا تھا کہ اے معزز مہمان یہ حقیر تحفہ ہماری جانب سے ہے.. شیمپئن کا کارک اُڑائیے اور اس گلابی وائن کے دو گھونٹ بھر کے سفر کی تھکان اُتار دیجیے..

''کیوں بھئی مونا بیگم۔'' میں نے شیمپئن کی بوتل کو چھو کر دیکھا تو وہ یخ ہو رہی تھی۔

''انتظامیہ کہتی ہے کہ تھکن اُتار دیجیے تو میں تو بے حد تھک چکا ہوں..''

''خبردار..''

''بھئی اُن کی جانب سے تحفہ ہے اُسے دھتکارا تو نہیں جا سکتا..''

''کھڑکی سے باہر تو پھینکا جا سکتا ہے ناں..'' اُس نے مصنوعی غصے سے کہا..

''نہ یہ ظلم نہ کرنا.. بے چاری شیمپئن ایک کونے میں پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے تو تمہارا کیا لیتی ہے.. پڑی رہنے دو... ویسے تو مفت کی شراب مجھے پنجابی محاورے کے مطابق قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے اور یہ تو فرانسیسی انگوروں سے کشید کردہ مہنگی ترین بلبلے دار شیمپئن ہے تو کفرانِ نعمت وغیرہ ہے..''

میمونہ ان چھتیس برسوں میں میری اس نوعیت کی لایعنی گفتگو کی عادی ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ ''یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں..'' والی ایک نگاہ کر کے کمبل اوڑھ کر فوری طور پر نیند میں چلی گئی.. بازو واقعی اُس کے آزمائے ہوئے تھے..

شیمپئن کی یہ سنہری بوتل اگلے چندرہ روز تک یونہی بالٹی میں پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی.. سٹاف ہر روز بالٹی میں نئی برف بھر جاتا.. جو مہمان آتے وہ ہماری امارت سے شدید متاثر ہوتے لیکن یہ اَن چھوئی کنواری ہی پڑی رہی اور جب وقتِ جدائی آیا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہی بولی.. بولی کہ..

''تینوں چین گے نصیباں والے.. تے نشے دیئے بند بوتلے..''

ساتواں باب

"وکٹری پارک میں وکٹری ڈے اور بوڑھے سپاہی"

"ھُو.. ھُو.." ہوٹل سے باہر قدم رکھتے ہی مونا نے اپنی لیدر جیکٹ کے کالر گردن کے گرد لپٹا کر یوں.. ھُو ھُو.. کی جیسے سلطان باہو کا کلام.. دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے.. ھُو.. ھُو.. پڑھ رہی ہو..

"سردی ہے۔" اُس نے کپکپاتے ہوئے کہا..

"ماسکو ہے تو سردی ہوگی۔" اور اسی لمحے میں نے بھی اپنی جیکٹ کی زپ گردن تک چڑھالی۔

اُکسانہ کی کوزی کار تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں شہتوتوں کی مانند ٹھنڈے ٹھار ہو گئے..

اور یہ اُکسانہ کون تھی جو اُکسانہ تھی اور رخسانہ نہ تھی..

یہ آنیا کی والدہ ماجدہ صرف اس لیے تھی کہ آنیا کہتی تھی ورنہ وہ اُس سے دو چار برس بڑی اُس کی بڑی بہن لگتی تھی.. مونا بھی میرے اس بیان سے اتفاق کرتی ہے کہ ہم نے ماسکو کے قیام کے دوران اتنی من موہنی مسکراہٹ والی خاتون نہ دیکھی.. وہ ایک معصوم خوش شکل کی مالک تھی اور جب وہ چلتی تھی تو ایک شاہانہ وقار کے ساتھ حرکت کرتی تھی.. اُس کی جھجکتی ہوئی مسکراہٹ خاص طور پر چھوٹے پرندوں کے لیے بہت مہلک ثابت ہو سکتی تھی کہ اُن کے دل رُک سکتے تھے.. اگر کسی زمانے میں ژوگینی ذخاروف اس خاتون پر فدا ہوا اور مجھے یقین ہے کہ پہلی نظر میں ہی مر مٹا تو کون ہے جو اُسے مورد الزام ٹھہرائے.. اُس کا لباس.. گلے میں بندھے رومال.. کاؤبوائے بوٹوں اور سیاہ جین میں بھی اُس کی جمالیاتی حس کا شوخ چلن تھا.. اگر آنیا خوش لباس تھی تو میں دیکھ سکتا تھا کہ یہ ایک موروثی عادت تھی..

اور آنیا ڈیئر.. مجھے یقین ہے کہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئی ہوگی.. ہم سے ڈھائی

بجے شب رخصت ہو کر صبح سویرے گھر پہنچی ہوگی اور پھر اپنی اماں جان کے ہمراہ ہماری جانب پھر سے عازم سفر ہو گئی ہوگی.. وہ پچھلی شب قدرے خاموش اور بجھی سی لگتی تھی لیکن آج صبح وہ ایک لاہوری قلفی کی مانند تر و تازہ اور دودھیا دکھائی دے رہی تھی..

اُکسانہ خصوصی طور پر صرف ہم سے ملاقات کرنے اور ہمیں اس فتح کے جشن کے دن وکٹری پارک تک اپنی کوزی کار میں چھوڑنے آئی تھی..

ماسکو کے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر اُس سویر کیا ہی خوب رنگ تھے اور رونقیں تھیں..

صرف آنیا ہی نہ تھی جو لاہوری قلفی لگ رہی تھی بلکہ وہاں جو لڑکیاں پُر مسرت گھومتی پھرتی تھیں اُن میں سے بیشتر ایک تر و تازہ خوشنمائی کی تصویریں لگتی تھیں.. اور بچے اتنے بنے ٹھنے تھے اور اُن کو یوں بنایا اور ٹھنایا گیا تھا جیسے یہ اُن کی پہلی عید ہو.. ہر کوئی اپنے بہترین لباس میں تھا اور بہترین چہروں کے ساتھ اُس جانب جا رہا تھا جدھر کو ہم جاتے تھے..

اگرچہ وکٹری پارک کے پہلو میں فٹ پاتھ کے کنارے کار رُک نہ سکتی تھی.. ممنوع تھا.. اور اُکسانہ ہماری سہولت کی خاطر اُسے وہیں روکنا چاہتی تھی تو اُس نے سخت گیر سپاہیوں کو یہ کہہ کر موم کر دیا کہ میرے ہمراہ دو پاکستانی مہمان ہیں جو خصوصی طور پر صرف اس وکٹری ڈے کے جشن میں شامل ہونے کے لیے ماسکو آئے ہیں.. ویسے وہ اس بیان سے بھی موم ہونے والے نہ تھے لیکن اُکسانہ کی مسکراہٹ جو اس بیان کے ساتھ تھی اس نے اُنہیں پگھلا دیا اور اُنہوں نے وہاں کار روکنے کی اجازت دے دی..

اُکسانہ کے جانے کے بعد چند لمحوں کے لیے زندگی کے رنگ پھیکے پڑ گئے کہ وہ اب مسکراتے نہ تھے..

"وکٹری پارک" کے داخلے پر ہزاروں روسی مرد و زن اور بچے لوگ ہجوم کرتے تھے اور اُن سب کو سیکیورٹی کی چھلنی میں سے گزارا جا رہا تھا.. کیا پتہ ان میں سے کوئی چیچنیا کی سیاہ بیوہ ہو جو اپنے بدن کے ساتھ بم باندھ کر آ گئی ہو.. اگرچہ وہ سب ماسکو کے ایک تھیٹر میں داخل ہو کر تماشائیوں کو یرغمال بنانے کی کوشش کر چکی تھیں.. اپنے بدن کے ساتھ بارود باندھ کر موت سے ملاقات کے لیے آ چکی تھیں.. اور پھر وہ سب کی سب ہلاک کر دی گئی تھیں لیکن چیچنیا میں بے شک خوراک اور پانی کی کمی ہو وہاں بیواؤں کی کمی کبھی نہیں ہوتی.. کم از کم اس معاملے میں چیچنیا خود کفیل ہے.. تو کیا پتہ اُن میں سے کوئی ایک سیاہ بیوہ اپنے بدن کے ساتھ ہلاکت خیز مواد باندھ کر وکٹری

پارک کے رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئی ہو..

حیرت انگیز طور پر نہ ہمارے بیگز کی تلاشی لی گئی نہ ہماری جیبوں کی تلاشی لی گئی اور ہم دونوں کو سکیورٹی اہلکاروں نے صرف ایک مسکراہٹ میں فارغ کر دیا.. اگرچہ ہم اُس ہزاروں کے ہجوم میں اپنے پاکستانی لباس میں اور رنگت سے انتہائی مخدوش لگ رہے تھے لیکن اُنہوں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں پار ہو جانے کا اشارہ کر دیا شاید اس لیے بھی کہ اُس سراسر مکمل روسی ہجوم میں صرف ہم دونوں تھے جو روسی نہ تھے..

وکٹری پارک میں وہ دن.. وکٹری ڈے کیسا تھا' میں اُس کی مغلوب کر لینے والی مسرت' سرخوشی اور وطن سے ایک محبوب کی مانند ٹوٹ کر عشق کرنے والے جذبات کو بیان نہیں کر سکتا..

یہ دن.. ماسکو میں ہمارا پہلا دن تھا.. اگرچہ ہم ٹھٹھرتے تھے لیکن روسیوں کی آتشِ شوق ہمیں بھی گرماتی تھی..

میں عرض کر چکا ہوں کہ سوویت یونین نے پہلے تو چپ سادھ رکھی اور جب بالآخر اُس نے نازی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تو ونسٹن چرچل اُسی حالت میں غسل خانہ سے باہر آ گیا جس حالت میں وہ وہاں تھا اور چلانے لگا "اب ہم جنگ جیت جائیں گے کیونکہ روسی ریچھ میدان میں آ گیا ہے اور وہ نازی جرمنی کی کمر توڑ کر رکھ دے گا۔"

نہ صرف ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ روسی فوجی اور شہری اس جنگ کا ایندھن بنے بلکہ بیشتر شہر بھی ملبے کے ڈھیروں میں بدل گئے.. منسک تو مکمل طور پر کھنڈر ہو گیا اور اس کے بیشتر شہری بھی مارے گئے.. سوویت یونین کے طول و عرض میں شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہو جس کا کوئی فرد بھی جنگ میں ہلاک نہ ہوا ہو..

اس میں شک نہیں کہ لندن اور کووینٹری پر جرمن ایئر فورس نے بے تحاشا بمباری کی لیکن جو تباہی روسی شہروں کے حصے میں آئی اُس کا موازنہ ممکن نہیں.. امریکہ تو بہرحال آخری دنوں میں ذرا پکنک منانے کے لیے جنگ میں شامل ہو گیا..

بہر طور دوسری جنگ عظیم انسانی تاریخ میں لڑی جانے والی جنگوں میں سب سے بڑی تھی اور اُسی حساب سے روس کی فتح بھی سب سے بڑی تھی..

اور اس وکٹری پارک میں سب سے قدیم اور اثر انگیز روایت کیا تھی..؟

نہ صرف وکٹری پارک میں بلکہ ماسکو کے دوسرے پارکوں میں بلکہ پورے روس کے

پارکوں میں یہ اثر انگیز روایت تھی کہ وکٹری ڈے کے موقع پر بوڑھے سپاہی اپنی پرانی وردیاں زیب تن کرتے ہیں' سینے پر بہادری اور شجاعت کے اعتراف میں عطا کردہ میڈل سجاتے ہیں اور نہایت پرفخر انداز میں ان پارکوں میں آتے ہیں.. اب یہاں وکٹری پارک میں شاید ہی کوئی ایک فرد ایسا ہو جس کے ہاتھوں میں پھول نہ ہوں.. جو بچے گود میں ہیں اُن کی جھولیوں میں بھی پھول ہیں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی پھول اُٹھا رکھے ہیں.. ان میں گلاب کے پھول بھی ہو سکتے ہیں لیکن سرخ' زرد اور سفید کارنیشن زیادہ پسندیدہ ہیں.. یہ پھول ان بوڑھے فوجیوں کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں کہ تم نے مادرِ وطن کی حفاظت کی' ہمیں تمہیں سلام کرتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ایک بلند قامت سنہری بالوں والی سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی ایک فوجی کے قریب جا کر اُسے کچھ کہتی ہے اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں اور وہ ہنس بھی رہی ہے اور وہ بوڑھا جنگی ہیرو لرزتے ہاتھوں سے اُس کے پیش کردہ پھول وصول کرتا ہے اور اُس کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے انہیں اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتا ہے.. پھر وہ اپنے کارنامے بیان کرتا ہے تو وہ بلند قامت لڑکی مؤدب ہو کر سننے لگتی ہے۔ جب تک کہ کوئی اور شخص اس فوجی کو پھول پیش کرنے نہیں آ جاتا..

کچھ لاچار اور زیادہ عمر رسیدہ فوجیوں کے ہمراہ اُن کے جوان پوتے یا نواسے ہیں جو اُن پھولوں کو وصول کر کے اُن کی جھولیوں میں رکھ دیتے ہیں..

پھولوں کا بوجھ سہارا نہ جاتا تو فوجی بابے قریبی بنچ پر بیٹھ کر دم درست کرنے لگتے.. ایک ایسے ہی سفید بالوں والے بابے کے ساتھ بیٹھ کر مونا نے ایک تصویر اُتروائی.. ہمیں کچھ قلق ہوا کہ ہم بھی کچھ پھول لے آتے تو ان کی نذر کرتے.. آنیا ایک پرفخر انداز میں بابا جی سے باتیں کر رہی تھی.. اور اُنہیں ہمارے پاکستانی ہونے کے بارے میں بتا رہی تھی..

میں نے ایک ڈیڑھ دو برس کی سرخ و سپید روسی گڑیا بچی کو دیکھا جس کے سر پر ایک سرخ رومال لپٹا ہوا تھا اور وہ روس کے روایتی لباس میں کیا ہی پیاری لگ رہی تھی اور... اُس کا یہ ننھا منا لباس شجاعت کے تمغوں سے سجا ہوا تھا.. وہ ایک بچہ گاڑی میں بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی اور جب میں نے اُس کی تصویر اُتارنے میں دلچسپی کا اظہار کیا تو اُس کی ماں نے جو غالباً ایک دہقان عورت تھی اور ماسکو کے نواح میں واقع کسی گاؤں سے خاص طور پر وکٹری ڈے کے جشن میں

شریک ہونے آئی تھی.. اُس بچی کو اُٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُسے کھڑا کیا اور پُرفخر انداز میں تصویر کے لیے مسکرانے لگی..

بچہ گاڑی میں بھی متعدد پھول پڑے تھے..

چونکہ آنیا اور مونا ابھی تک اُن بابا جی سے گپیں لگا رہی تھیں اس لیے میں اس دہقان عورت سے کچھ سوال جواب نہ کر سکتا تھا. میرا قیاس تھا کہ وہ کسی ایسے جنگی ہیرو کی پوتی یا نواسی تھی جواب اس دنیا میں نہ تھا.. اور اُس کی ماں اُس کے دادا یا نانا کی جرأت کے نشان اُس کے لباس پر سجا کر اس پارک میں لے آئی تھی اور شکر گزار قوم اُس بچی کے حضور بھی پھولوں کے نذرانے پیش کر رہی تھی..

وکٹری پارک میں کہیں کہیں دوسری جنگ عظیم کے دوران استعمال ہونے والے چند ٹینک بھی کھڑے تھے اور مختلف گوشوں میں مختلف جنگوں میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی یادگاریں بھی تھیں اور ان میں اُن روسی فوجیوں کی یادگار بھی تھی جو افغانستان میں مارے گئے تھے اور یہ ایک پُراثر یادگار تھی.. یہاں بھی پھولوں کے انبار پڑے تھے..

پارک کے انتہائی آخر میں ایک بلند گنبد تلے وار میوزیم تھا جس میں داخل ہونے سے احساس ہوتا تھا کہ آپ یکدم جنگ عظیم کے اندر چلے گئے ہیں.. اور اس وسیع پارک پر بلند ہوتی ہوئی.. ناقابلِ یقین بلندی تک جاتی ہوئی لاہور کے سمت مینار کی مانند ایک جنگی یادگار آسمان کو چھوتی لگتی تھی.. اُس مینار پر جنگ کے مناظر پتھر میں سے اُبھرتے تھے اور اُس کی چوٹی کے قریب فتح کی دیوی ایک فرشتے کی شکل کے بچے کو جیت کا تاج پہنا رہی ہے.. یہ ایک عجیب دُکھ سُکھ کا میلہ تھا جہاں آنسو چھلکتے تھے اور مسکراہٹیں بھی کھیلتی تھیں اور میں نے اس نوعیت کا رنگا رنگ قومیت اور فخر سے سرشار میلہ کبھی نہ دیکھا تھا..

وہاں ایک سٹیج پر روس کے روایتی رقص بھی پیش کیے جا رہے تھے، موسیقی کی تانیں بھی تھیں.. کھانے پینے کے کھوکھے اور بچوں کے جھولے بھی تھے.. اور ہر دوسرے شخص کے ہاتھوں میں روس کا نیا پرچم بھی تھا.. اور وہ سرخ نہ تھا.. اُس پر ہتھوڑا اور درانتی نہ تھی.. یہ متروک ہو چکے تھے اور ایک ترنگا پرچم ہر سُو لہرا رہا تھا.. میں نے آج سویرے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ بیشتر کاروں کی ونڈ سکرینوں پر ایک ربن بھی چسپاں تھا جو وکٹری ڈے کی علامت تھا..

اب اس دل پر سدا کے لیے نقش ہو جانے والے میلے میں گھومتے ہوئے کوئی خلش تھی

جو جی کو جلاتی تھی.. کوئی پچھتاوا ایسا تھا جو جاں کو بے رُوح کرتا تھا.. ایک کسک تھی جو اداسی کو مہمیز دیتی تھی جو ماسکو کی اُس سویر میں وکٹری پارک میں مجھے کبھی رنجیدہ اور کبھی پشیمان کرتی تھی..

میں بہت دیر تک اس کا سبب نہ جان سکا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے.. اور پھر مجھے اس کا جواز فوجی وردیوں میں اور اُن پر شہریوں کے پھول نچھاور کرنے میں نظر آنے لگا..

میں جس پس منظر سے آیا تھا وہاں یہ بات انہونی تھی..

فوجیوں اور شہریوں کے درمیان یہ جو پھولوں کے آبدیدہ رشتے تھے ان سے میں ناواقف تھا.. دوسری جنگ عظیم کو اختتام پذیر ہوئے تریسٹھ برس ہونے کو آئے تھے اور اس کے باوجود روسی قوم اپنے فوجیوں کے حضور شکرانے کے گلدستے پیش کر رہی تھی.. اُن کے گالوں پر بوسے دے کر اپنے تشکر کا اظہار کر رہی تھی کہ تم نے ہی تو مادرِ وطن کی حفاظت کی' ہم اگر آج ہیں تو تمہاری وجہ سے ہیں.. تم نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے..

ہم پاکستانی ان جذبات سے محروم کر دیے گئے تھے..

بے شک 1965ء کی جنگ کے بعد ایک مختصر وقفے کے لیے پاکستانی شہریوں نے بھی جذبے کی اس شکر گزار شدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے فوجیوں پر ایسی ہی بے بہا محبتیں نثار کیں.. پر محبت کا یہ رشتہ عارضی ثابت ہوا.. کیونکہ بندوق کے زور پر آپ کسی کو محبت پر مجبور نہیں کر سکتے.. یہ بندوق کی بادشاہی تھی جس میں پھولوں کا گزر نہیں ہوتا.. ہم پر کبھی کسی فیلڈ میں اُترے بغیر اپنی ہی کابینہ کی سفارش پر فیلڈ مارشل مسلط ہو گئے.. کبھی یحییٰ خان نے اپنی رانی کو جنرل بنا دیا اور ایک بنگالی بیوٹی کو بلیک بنا دیا جو بدقسمتی سے میری بھی واقف تھی اور جس کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ملاقات کا تذکرہ میں نے اپنے ناول "راکھ" میں کیا ہے۔ پھر ضیاء الحق اپنی مونچھیں مروڑتا اپنی نقلی بتیسی نکالتا اُسے اسلام کے نام پر چمکاتا آیا اور کوڑوں اور پھانسیوں کے بازار گرم کر دیئے' افغان جہاد کے نام پر کلاشنکوف اور ہیروئن کو رائج کیا اور آسمانوں پر اُڑا تو وہیں سے اُسے اوپر اٹھا لیا گیا کہ زمین نے اُسے کہاں قبول کرنا تھا.. اور تادمِ تحریر ایک کمانڈو جنرل ہم پر راج کرتے ہیں.. یعنی سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں وردی کا.. یا شاید فوج کی زنجیر کا۔

کسی نے کیا خوب کہا اور ہمارے دل کا حال بیان کیا کہ.. دوسرے ملکوں میں فوج ملک کے لیے ہوتی ہے اور ہمارے ہاں ملک فوج کے لیے ہے..

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بندوق کی بادشاہی میں ہمیشہ بندوق کو سہارا دینے والے

سیاستدان ہی ہوتے ہیں..اگر آپ فخریہ طور پر اعلان کر دیں کہ میں تو جنرل صاحب کا کتا ہونے پر بھی فخر کروں تو آپ ایک صوبائی اسمبلی میں سپیکر کے عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں..

تو بس یہی تفاوت مجھے ایک احساس محرومی اور شرمندگی سے دوچار کرتا تھا..کیا کبھی کوئی ایسا سورج بھی طلوع ہوگا جب ہم ایک مرتبہ پھر اپنی فوج کے شکر گزار ہو کر اُن کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے اور وہ ہمارے گلوں میں پھانسیوں کے پھندے نہیں ڈالیں گے..

مونا بیگم اب بھی..سلطان باہو والا..ہُو ہُو کر رہی تھی کہ ہوا میں ایک خنک کاٹ تھی جو بدن کے پار جاتی تھی..اُس نے اپنے آپ کو ایک نیلی چادر میں لپیٹ رکھا تھا اور اُس کے پلو سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور ''ہُو ہُو'' کیے جاتی تھی.. یوں وہ ہزاروں روسیوں کے ہجوم میں واحد باپردہ عورت تھی اور رُوسی اُسے دیکھ کر بس مسکراتے تھے اور کچھ نہ کہتے تھے..

یورپ اور امریکہ میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی اجتماع میں گندمی رنگ کے چھینٹے نہ ہوں.. پاکستانی' ہندوستانی' بنگلہ دیشی' سری لنکن' فلپینو' کورین وغیرہ نہ ہوں لیکن یہاں ماسکو کے اس پارک میں روسی چہروں کی سفیدی کے سوا اگر گندمی رنگ کے دو دھبے تھے تو وہ میں اور میمونہ تھے اور اسی لیے ساری نظریں ہم پر تھیں اور وہ رشک اور دوستی کی نظریں تھیں..

کیسی خنک اور کھنک والی سرد ہوا تھی کہ اُس میں میمونہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور آنیا ایک لاہوری قلفی کی مانند دودھیا اور تر و تازہ تھی..

ماسکو میں ہمارا پہلا دن اور وہ بھی کیسا یادگار اور فتح کے دن کی سرشاری میں ڈوبا ہوا..

اگر روس کے سفر کے دوران ہمیں صرف یہی ایک دن نصیب ہو جاتا تو بھی یہ سفر رائیگاں نہ ہوتا..

اب آنیا نے فوری طور پر آج کے دن کے لیے ہماری مصروفیات کا شیڈول چیک کیا اور کہا ''مستنصر اب ہم سرخ چوک میں جائیں گے جہاں صدر پیوٹن فوجی دستوں سے سلامی وصول کرنے کے بعد..اس یادگار دن کی اہمیت کے بارے میں تقریر کرنے کے بعد رخصت ہو چکے ہوں گے..''

ہم نے اگر وہاں کا رُخ کرنا تھا تو زیرِ زمین ریلوے پر سوار ہو کر کرنا تھا کہ اُکسانہ کی کار ہمیں ڈراپ کر کے کب کی جا چکی تھی' بے رُخی اختیار کر چکی تھی..

''ماسکو میں جہاں روسی عوام کی مہمان نوازی اور خوش خلقی نے میرا دل موہ لیا وہاں عظیم الشان زیرِ زمین ریلوے سٹیشنوں نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ انہیں صرف سٹیشن کہہ دینا تو زیادتی ہوگی۔ عالیشان محلات تھے' قیمتی فانوس' سنگ مرمر کے مجسمے' چمکتے دمکتے فرش' سنہری ستون' بیل بوٹوں سے مزین روپہلی چھتیں'..بس ''عالم پناہ تشریف لاتے ہیں'' کی کسر تھی۔ ان نادر فن پاروں میں کالی کلوٹی گاڑی کو دیکھ کر بے حد دُکھ ہوتا..ایک اور قباحت تھی۔ سٹیشنوں کے نام اتنے پیچیدہ اور طویل تھے کہ ''الیکٹروزاروداشایا'' کہتے کہتے آدمی کا سانس بھی پھولنے کو آتا اور گاڑی الگ چھوٹ جاتی۔''

''فاختہ''

یہ بیان 1957ء کا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسکو کی زیرِ زمین ریلوے کے سٹیشن روسی زاروں کے محلات سے کسی طور کم نہ تھے اور انہیں اُس عہد کا ایک عجوبہ قرار دیا جا سکتا تھا..اگرچہ کمیونزم مزدور کسان راج کا پیغامبر ہے لیکن اس کی سرکاری عمارتیں اور یادگاریں بے حد شاہانہ اور پُرشکوہ ہوتی ہیں..تا کہ لوگ اپنے دُکھ بھول کر اس نظام کی تابناکیوں سے متاثر ہوں..ان پچاس برسوں میں زیرِ زمین ریلوے کا سلسلہ بے حد وسیع ہو چکا تھا اور سٹیشن بھی اتنے شاندار نہ رہے تھے کہ شانداری اور شاہانہ عمارتوں پر زرِ کثیر اتنا صرف ہوا کہ روسی معیشت کا جہاز ڈوب گیا..

ہم تینوں جونہی وکٹری پارک سے نکل کر زیرِ زمین ریلوے میں اُترتی راہداریوں میں داخل ہوئے تو گویا کسی سیلاب کی زد میں آ گئے..ہم بے اختیار سے ہو گئے کہ ہجوم ہمیں دھکیلتا کہیں سے کہیں لے جاتا تھا چنانچہ گمشدگی کے خوف سے ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیے..اور اس سیلابی ریلے میں بہتے چلے گئے..

نوجوان لڑکے اور لڑکیاں روسی پرچم لہراتے نہایت شوخ اور بدمست ہوتے ''رشیا..رشیا'' الاپ رہے تھے..اور لاؤڈ سپیکروں پر کسی غمناک گیت کی تانیں اُبھر رہی تھیں..

''مستنصر..'' آنیا چلتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی' ''یہ گیت ''نیلا رومال'' ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں بہت پسندیدہ تھا اور لوگ اُسے سن کر روتے تھے اور گنگناتے تھے اور پھر روتے تھے..یہ ایک ایسے سپاہی کا قصہ ہے جو جنگ پر روانہ ہونے سے پیشتر اپنی محبوبہ کو ایک نیلا رومال تحفے کے طور پر دیتا ہے اور وہ اُسے برسوں سینے سے لگائے اُس کی آمد کی منتظر رہتی ہے

اور پھر اُس کی موت کی خبر آ جاتی ہے.. یہ گیت اب بھی پسندیدہ ہے اور خاص طور پر وکٹری ڈے پر پورے روس میں گونجتا ہے.. مجھے بھی رونا آ جاتا ہے..''

''نیلا رومال'' میں وہی حزن آمیز کیفیت تھی جو روسی مزاج کا ایک حصہ ہے۔

ابھی تک تو ہم زمین کی سطح پر ہی چلتے جا رہے تھے لیکن جب زیرِ زمین اُترنے کے لیے پہلا خودکار زینہ آیا اور ہم سب ہجوم میں دھکیلے جا رہے تھے تو میمونہ اُس پر قدم رکھنے سے جھجک گئی.. لیکن وہ تا دیر جھجک نہ سکتی تھی کہ اُس کے پیچھے ہزاروں مسافروں کا دباؤ تھا.. اُس نے مجبوراً قدم رکھ تو دیا پر بری طرح لڑکھڑا گئی اور پھر بمشکل سنبھلی.. ''یہ زینے بہت تیز ہیں.. نیویارک کی سب وے میں تو ان کی رفتار آہستہ ہوتی ہے..''

میں نے یینی سے اس کا سبب پوچھا تو اُس کا کہنا تھا کہ اگر یہاں کوئی شخص زینے کے تیزی کے باعث لڑکھڑا کر گر جائے تو وہ فوراً ہرجانے کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ اس لیے ان کی رفتار مناسب رکھی گئی ہے.. ماسکو میں چونکہ ایسا کوئی قانون نہیں ہے اس لیے اُنہیں کچھ پروا نہیں ہے.. مسافر گرتا ہے تو گر جائے..

اس تیز رفتاری کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لندن یا نیویارک کے مقابلے میں ماسکو کا یہ ریلوے سٹیشن نظام زمین کے نیچے بہت زیادہ گہرائی میں جا کر تعمیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ زینے سست رفتار ہوں گے تو مسافر حضرات بس اُنہی پر سیر کرتے رہیں گے' نیچے کم ہی پہنچیں گے..

''کیا عام حالات میں بھی اتنا ہی بے پناہ ہجوم ہوتا ہے آنیا؟''

''نہیں.. یہ سب لوگ وکٹری پارک سے فارغ ہو کر سُرخ چوک میں جشن منانے جا رہے ہیں.. وہاں بھی بوڑھے فوجی موجود ہوں گے اور اُنہیں بھی پھول پیش کیے جائیں گے اور.. لوگ شراب بھی پئیں گے..''

''کچھ نے تو پی رکھی ہے..''

''ہاں..'' وہ مسکرائی۔ ''جشن کے موقع پر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

زیرِ زمین سٹیشن پر ہر چالیس سیکنڈ کے بعد ایک گاڑی داخل ہوتی تھی اور لبریز ہو کر نکل جاتی تھی.. اور یہاں مُونا کو ماسکو میں اپنا پہلا صدمہ ہوا.. برقی زینوں پر.. پلیٹ فارم پر اور گاڑی کے اندر بھی متعدد جوڑے ہونٹ جوڑے ہوئے تھے..

''نیویارک میں تو ایسے منظر نہیں ہوتے..'' اُس نے شکایت کی۔

''یہ ماسکو ہے مونا بیگم..'' میں نے اُسے یونہی چھیڑا.. ذرا سا چھیڑا تو وہ پرے ہو گئی۔

''شرم کریں..''

ہمارے برابر میں ایک عمر رسیدہ بوڑھا فوجی اپنی پرانی وردی میں ملبوس وکٹری پارک کے جشن میں شریک ہونے کے بعد تھکاوٹ سے پُورا ایک اونگھ میں تھا اور اُس کی گود میں بھی سرخ اور زرد کارنیشن پھولوں کا ایک ڈھیر تھا جسے وہ اونگھنے کے باوجود خبردار ہو کر سنبھالتا تھا.. وہ اپنی اونگھ سے ذرا باہر آیا اور ہمیں برابر میں براجمان پا کر متجسس ہوا ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''پاکستان سے..''

''اور یہ..'' اُس نے مونا کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا لباس بہت خوبصورت ہے۔''

''یہ بھی پاکستان سے..''

''تم بتا سکتے ہو کہ میں کتنے برس کا ہوں؟'' اُس نے ایک بچگانہ معصومیت سے پوچھا..

وہ جتنے برس کا تھا اُس کے چہرے پر عیاں تھا لیکن میں اُس کا دل رکھنا چاہتا تھا ''آپ ستر برس سے زیادہ کے ہیں.. شاید اسی برس کے لگ بھگ..''

''نہیں نہیں..'' وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا.. ''میں تو نوے برس کا ہوں.. کیا میں نوے برس کا دکھائی دیتا ہوں؟''

''نہیں آپ اسی برس کے بھی نہیں لگتے۔''

''پاکستانی بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں..'' یہ کہہ کر وہ پھر سے اونگھنے لگا..

صرف تین روز بعد ماسکو یونیورسٹی میں ایک لیکچر کے بعد جب سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اُردو کی ایک طالبہ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو کسی ناول کا مرکزی خیال کیسے سوجھتا ہے.. آپ کردار سازی کیسے کرتے ہیں اور یہ کردار کیا حقیقی ہوتے ہیں یا سراسر آپ کی قوتِ متخیلہ کا کرشمہ ہوتے ہیں.. تو اُسی لمحے معاً مجھے اِس بوڑھے فوجی کا خیال آ گیا جو اپنے ہم وطنوں سے عقیدت کے پھول وصول کر کے زیرِ زمین ٹرین میں اونگھ رہا تھا تو میں نے اُس کا حوالہ دے کر کہا کہ وہ بھی ایک کردار ہو سکتا ہے.. اُسے دیکھتے ہوئے مجھے مسلسل خیال آ رہا تھا کہ یہ شخص کہاں رہتا ہوگا.. کس کے پاس رہتا ہوگا.. اس کے عزیز رشتے دار اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے اور اس کی روزمرہ زندگی کا چلن کیسا ہوگا.. تو یہ بھی تو کسی کہانی یا ناول کا ایک کردار ہو سکتا ہے..

ماسکو سے پانچ روز کی مسافت پر واقع جھیل بیکال کے کناروں پر رہنے والی تانیا کے چہرے پر ایک حیرت کی اثر اندازی تیری "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ بوڑھا کیسے ایک کردار میں ڈھل سکتا ہے.."

تو یہاں سے اُس بوڑھے فوجی کی کہانی شروع ہوتی ہے.. وہ حقیقت سے ایک کردار میں بدلتا ہے..

آٹھواں باب

"بورس کی کہانی"

بورس کی بجھتی نیم مُردہ آنکھیں جن میں نمی کی ایک ہلکی سی تہہ ہمہ وقت تیرتی' کھڑکی کے بوسیدہ ہو چکے پردوں' تین گلدانوں' ایک ٹیبل لیمپ اور چند بھوری ہو چکی بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کو دھندلاتی رہتی.. اُس کی یہ آنکھیں دیوار پر آویزاں کیلنڈر کے ہندسوں کے قریب ہوتی گئیں اور وہ آپس میں گڈمڈ اور اُلجھے ہوئے سے لگتے رہے۔ یہاں تک اُس کی سرخ پھولی ہوئی ناک کیلنڈر کے صفحے کو چھونے کو تھی جب وہ ہندسے قدرے واضح ہوئے اور اُس نے فوراً اپنی لرزتی ہوئی اُنگلی نو کے ہندسے پر رکھ دی.. کہ کہیں وہ دوبارہ دھندلا نہ جائے' کیلنڈر سے فرار نہ ہو جائے اور پھر اُس پر پورے مہینے کی تاریخیں تو موجود رہیں لیکن نو کے ہندسے کی جگہ خالی ہو جائے.. جونہی اُس کی اُنگلی نے نو کے ہندسے کو چھوا تو وہ یوں مسکرا دیا جیسے پہلے اُس میں کچھ جان نہ تھی اور اب اُس ہندسے کے لمس سے وہ زندہ ہو رہا تھا.. وہ محسوس کر سکتا تھا کہ زندگی کی ایک رواں لہر ہے' ایک طاقت ہے' جس کا منبع نو کا وہ ہندسہ ہے اور یہ لہر اور یہ طاقت اُس کی اُنگلی کے پوٹے کے راستے اُس کی ہتھیلی میں پھیل رہی ہے' بازو میں سفر کرتی دماغ میں سرایت کر رہی ہے۔ دل میں اُتر رہی ہے اُسے ہولے ہولے زندہ کر رہی ہے.. جیسے مائیکل انجلو کی پینٹنگ میں آدم کی بڑھی ہوئی اُنگلی اپنے بارِیش تخلیق کار کی اُنگلی سے چھو رہی ہے اور اُس سے زندگی اور خوبصورتی حاصل کر رہی ہے..

یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا..

اُسے کہیں آنا جانا تو ہوتا نہیں تھا اور نہ ہی اُسے اب گہری نیند نصیب ہوتی تھی.. بدن میں تمام شب ایک جھٹپٹے کا سا عالم رہتا.. نہ روشنی نہ مکمل اندھیرا.. وہ ان کے درمیان اونگھتا بھٹکتا رہتا.. جب بھی آنکھ کھولتا کھڑکی کے پردے پر نگاہ ڈالتا کہ وہ کب کمرے کی تاریکی میں سے ذرا الگ ہو

کر باہر جو روشنی پھوٹ رہی ہے' اُسے اپنے آپ میں سموئے اور نظر آنے لگے.. سب کچھ اندھیرے میں ہو اور وہ ایک ہلکی روشنی میں عیاں ہونے لگے.. اور وہ اٹھے اور کھڑکی کے برابر میں آویزاں کیلنڈر پر مئی کے مہینے کی نو تاریخ کے ہندسے پر اپنی اُنگلی رکھ دے.. یہ اتنے برسوں کا معمول تھا کہ نہ اُسے کچھ دیکھنے کی حاجت تھی اور نہ ہی پردے میں سے سویر کی روشنی سرایت کرنے کی ضرورت.. وہ مکمل تاریکی میں یا آنکھیں بند کر کے بھی اپنی اُنگلی کا رُخ کیلنڈر کی جانب کیے سیدھا نو کے ہندسے کو.. مئی والے نو کے ہندسے کو شکار کر سکتا تھا.. اُسے چھو سکتا تھا..

ان دنوں تو گرمیوں کا آغاز تھا..

روس کی سفید راتوں کی پہلی راتیں تھیں..

رات کبھی بھی مکمل طور پر رات نہ ہوتی.. اُس میں دن کی روشنی کی سفید گھلاوٹ باقی رہتی.. کھڑکی کا پردہ تقریباً پوری شب بقیہ کمرے سے نمایاں رہتا' الگ نظر آتا لیکن جب سردیوں کا سرد قہر اُترتا اور دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا اور رات کو تو وہی رات ہوتی اگرچہ کل عالم سے زیادہ اندھیاری اور گھٹا ٹوپ.. تب اُس کے بوڑھے بدن کی کھڑکی کے آگے جو پردہ ہوتا اُس میں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹنے لگتی اور وہ جان جاتا کہ سویر ہونے کو ہے.. اور میں جو نیم مردہ ہو رہا ہوں.. زندگی کہاں تک ساتھ دیتی.. نوے برس تک تو ساتھ نہیں دے سکتی تھی.. وہ تو کب کی رخصت ہو چکی تھی.. اور اب اگر کچھ سانس حاصل کرنے ہیں تو اُٹھو.. کھڑکی کے پردے کے برابر آویزاں کیلنڈر کی جانب چلو اور نو کے ہندسے پر انگلی رکھ کر اپنی نیم مردگی کے عوض نیم زندگی حاصل کر لو..

تو یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا..

برسوں سے یہی معمول تھا..

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایک گہری اونگھ میں چلا جاتا' باہر نہ آتا تو اُس کی بیٹی فکر مند ہو کر دستک دیے بغیر اُس کے کمرے میں داخل ہو جاتی اور اُس کے منہ کے آگے اپنا رخسار لگا کر محسوس کرتی کہ کیا سانس آ رہا ہے اور جب اُس کے رخسار پر ایک نامعلوم سی تمازت محسوس ہونے لگتی تو وہ جان جاتی کہ ابھی سانس چل رہا ہے اور وہ اُسے اُٹھا کر ناشتے کے لیے لے جاتی۔

اور اُس ایک روز وہ بہت بوکھلایا ہوا.. بہت ناتواں اور نیم مردہ سا رہتا کہ اُنگلی کے لمس سے نو کے ہندسے کے راستے اُس میں زندگی کے سانس نہ اُترے تھے..

جب برس کا اختتام ہو رہا ہوتا تو اُس کی بیٹی اکتیس دسمبر سے پورے چھ روز پہلے کرسمس

کے دن پرانا کیلنڈر اُتارتی اور اُس کی جگہ نئے سال کا کیلنڈر لٹکا دیتی۔ وہ پرانے کیلنڈر میں سے مئی کے مہینے کا ورق جدا کر کے اپنے باپ کو دے دیتی اور وہ اسے اپنے صندوق میں سنبھال لیتا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مئی کا مہینہ ردی کی ٹوکری میں چلا جائے۔ جس مہینے کی نو تاریخ پر اُنگلی رکھ کر وہ زندگی کی حرارت وصول کرتا تھا اُس کا ورق کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دے.. بورس کے صندوق میں گزشتہ تمام برسوں کے مئی کے مہینے کے ورق محفوظ تھے اور وہ جب کبھی اُس کا ڈھکن اُٹھاتا تو نو مئی کے ہندسے اُن پر روشن نظر آنے لگتے.. تو جونہی اس کی اُنگلی نے نو کے ہندسے کو چھوا اُس کے لمس سے آشنا ہوئی اُس نے مسکراتے اور سر ہلاتے ہوئے حساب کیا جیسے وہ یہ حساب پہلی بار کر رہا ہو کہ 9 مئی کے آنے میں صرف بیس روز باقی رہ گئے تھے..

ہر نو مئی کی شام کو وہ کارنیشن کے سُرخ اور سفید پھولوں کو.. جو اُسے وکٹری پارک میں پیش کیے گئے تھے اپنے تینوں گلدانوں میں سجاتا.. اُن میں پانی تو پہلے سے موجود ہوتا کہ اُس سویرے گھر سے نکلنے سے پیشتر وہ ان گلدانوں میں پانی بھر کر جاتا.. ان کے تنگ گلوں کے اندر جب پھولوں کے ڈنٹھل جاتے اور پانی سے چھوتے تو وہ کھل اُٹھتے..

بورس اُن دنوں میں کیلنڈر کے قریب جانا بھول جاتا اور بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے گلدانوں کا پانی بدلتا.. اُس میں نمک کی آمیزش کرتا تا کہ وہ دیر تک تر و تازہ رہیں.. آٹھ دس روز گزرتے تو اُن کی پتیوں میں فنا کی اداسی بھر جاتی اور وہ مرجھانے لگتیں.. وہ اُن پر پانی چھڑک کر اُنہیں تازگی کی جانب لوٹانے کا چارہ کرتا.. پھولوں کی پتیاں گلدانوں کے گرد گرتیں اور ایک ہالہ سا نمودار ہو جاتا جس میں سرخ اور سفید رنگ ہوتے' پندرہ بیس روز گزر جاتے تو روزانہ بدلنے کے باوجود گلدانوں کے پانی بُو دینے لگتے' پھول اُن کے کناروں سے بے جان ہو کر لٹکنے لگتے.. جیسے ایک مردہ بدن ایک دیوار پر بے جان لٹکتا ہے.. جب ایک ماہ ہونے کو آتا تو پھولوں کی بجائے اُن کے گنجے ڈنٹھل باقی رہ جاتے اور گلدانوں میں سے تعفن اُٹھنے لگتا.. وہ بہت کوشش کرتا.. کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند رکھتا کہ کسی کو خبر نہ ہو.. پر ایک روز اُس کی بہو جو کئی روز سے اپنے فلیٹ میں ایک ناگوار بُو.. گلتی سڑتی بُو.. کو برداشت کرتی رہتی تھی.. بچوں کے احتجاج کرنے پر اور مہمانوں کے ناک چڑھانے پر.. کسی سویر جب وہ اونگھ میں ہوتا کمرے میں داخل ہو کر اُن تینوں گلدانوں میں گلتے سڑتے پھولوں کے ڈنٹھلوں کو نکال کر.. ڈسٹ بن میں پھینک دیتی اور سکھ کا سانس لیتی..

وہ بیدار ہوتا تو وہاں پھول نہ ہوتے.. بلکہ اُن کے ڈنٹھل یا آثار نہ ہوتے.. بُو نہ ہوتی۔

تو اُس روز وہ بے چارگی کے بوڑھے آنسو بہاتا رہتا.. جیسے اُس کے قریبی عزیز بچھڑ گئے ہوں۔ اُن تینوں گلدانوں نے اب اگلے گیارہ ماہ تک یونہی خالی پڑے رہنا تھا اور پھر شاید اُنہوں نے اگلے برس آباد ہونا تھا اس شرط کے ساتھ کہ بورس بھی اگلے برس تک زندہ رہ سکے..

اور جس روز اُس کی بہو اُس کے لاڈے پھولوں کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینکتی بس اُسی روز سے وہ پھر کیلنڈر پر 9 کے ہندسے کو تلاش کرنے لگتا.. پھر حساب لگاتا کہ کتنے ماہ کتنے دن باقی رہ گئے ہیں.. یہ خیال اُسے سارا دن خوش رکھتا کہ آج ایک اور دن کم ہو گیا ہے..

اور آج تو کچھ ماہ نہیں صرف بیس دن باقی رہ گئے تھے..

اُس نے اپنے مختصر سے کمرے میں جو کبھی فلیٹ کا سٹور روم ہوا کرتا تھا اور جس میں ظاہر ہے کوئی کھڑکی نہ تھی البتہ چھت کے قریب ایک روشندان تھا جس کے آگے پردہ تان کر وہ اسے ایک کھڑکی تصور کر لیتا تھا اور یہ بھی تو اُس کی بہو اور پوتے پوتی کی نہایت مہربانی تھی کہ اُنہوں نے اُسے بے گھر نہیں کر دیا تھا.. اور وہ ماسکو کی سڑکوں پر اور کلیساؤں کے باہر ہاتھ پھیلانے سے بچ گیا تھا۔ پرانے وقتوں میں بوڑھوں کے لیے کیسی شاندار سہولتیں ہوا کرتی تھیں۔ بے شک پنشن اتنی قلیل ہوتی تھیں کہ اُس سے مہینے بھر کی ڈبل روٹی یا پنیر کے چند ٹکڑے خریدے جا سکتے تھے لیکن پنشن ہوتی تو تھی اور جو بوڑھے لاچار ہو جاتے تھے اُن کے لیے طبی سہولتیں میسر تھیں' بوڑھوں کے گھر تھے۔ پر اب کچھ بھی نہیں تھا۔ کم از کم بوڑھوں کے لیے تو کچھ بھی نہیں تھا.. یہاں تک کہ اُن کے پاس خدا بھی نہیں تھا..

محض اس لیے کہ اُس نظام میں خدا کی کچھ گنجائش نہ تھی۔ انسان نے سارے خدائی کام اپنے ذمے لے لیے تھے..

اُس کی پوتی اُسے سرزنش کرتی کہ دادا آپ اتوار کے روز بھی اونگھتے رہتے ہیں۔ کلیسا میں جا کر اپنے کمیونزم کے زمانوں کے گناہوں کا اقرار نہیں کرتے.. ایک خدا کے یقین سے ماورا ہو جانے پر توبہ نہیں کرتے..

نئی نسل مذہب کی جانب راغب کی جا رہی تھی.. اُنہیں مارکس اور لینن کے افکار کی بجائے مقدس صحیفے پڑھائے جا رہے تھے.. اُنہیں ایک مرتبہ پھر مذہب کی عادت ڈالی جا رہی تھی جسے افیون کہا جاتا تھا۔ بس اُسی افیون کی عادت ڈالی جا رہی تھی۔

ایک روز وہ اپنی اونگھ سے بیدار ہوا تو اُسے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ ایسا

کہ اُسے اُٹھنے میں بہت دقت ہوئی.. اُس کی کٹر.. روسی آرتھوڈوکس چرچ کی پیروی کرنے والی پوتی ساشا نے سوتے میں اُس کے گلے میں ایک زنجیر ڈال دی تھی جس کے آخر میں ایک سنہری صلیب تھی.. وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کا خدا کے بغیر منکر دادا جہنم کی آگ کا ایندھن بنے..

وہ اپنی پوتی کی خوشنودی کی خاطر چند روز تک تو اس صلیب کو گلے میں لٹکائے پھرا پر اُس سے یہ بوجھ برداشت نہ ہوتا تھا.. اور اُس نے اسے اُتار دیا.. ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ جب خدا نہیں تھا تو اُس کا گزارہ اچھا بھلا ہو رہا تھا اور اب جب کہ خدا تھا اُس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا..

اس کمرے میں اُس کی عزیز ترین متاع.. اُس کی حیات کا سب سے پرانا رفیق سیاہ رنگ کا ٹین کا ایک پچکا ہوا ٹرنک تھا جو دوسری جنگ عظیم کے دوران ہر سپاہی کو تفویض کیا جاتا تھا اور وہ اُسے جان سے بھی پیارا رکھتا تھا کہ موت کے دھواں آلود اور دھماکہ خیز موسموں میں انجانے اور غیر دوست جنگی میدانوں میں وہ ایک گھر ہوا کرتا تھا.. اُس میں سے گھر کی اور اپنے پیاروں کی خوشبو آتی تھی.. اس ٹرنک کے آس پاس دور دور تک صرف دشمن ہوا کرتے تھے اور وہ ایک خاموش دوست کی مانند اُسے بددل نہ ہونے دیتا تھا.. اُس کے ایک کونے میں پوری جنگ کے دوران وہ اُونی قمیض اُسی حالت میں' کوکلوں کی استری سے استری شدہ.. جوں کی توں پڑی رہی جو اُس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے تہہ کر کے اُس کے ٹرنک میں رکھی تھی اور رکھتے ہوئے اُسے اپنے بوڑھے رخساروں سے لگایا تھا.. بہت بار وہ بہت ٹھٹھرا.. سردی سے نیلا ہونے کو آیا پر اُس نے وہ قمیض جوں کی توں ہی رہنے دی' اُسے نہ پہنا.. کہ اُس کے پہننے سے ماں کے ہاتھوں کی تہیں کھل جاتیں اور اس کے رخسار کی مہک کھو جاتی.. لوگ تو یقین نہیں کریں گے کہ اور اُسے کچھ پروا نہ تھی کہ وہ یقین کرتے ہیں یا نہیں لیکن لینن گراڈ کے محاصرے کے دوران جب وہ کئی روز بھوکا رہا اور مرنے کو آیا تو اُس نے ٹرنک کھول کر اُس قمیض کو آنکھوں سے لگایا اور اپنی ناک اُس کے گرم کپڑے میں دفن کر دی تو بھوک کی شدت کم ہو گئی.. وہ ہر روسی سپاہی کی مانند متعدد بار زخمی بھی ہوا اور اس دوران بھی وہ قمیض اُس کے زخموں کا مداوا ہوئی' ایک مسیحا ہوئی.. جیسے حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہونے کے وقت جو لبادہ پہن رکھا تھا وہ بھی ایک روایت کے مطابق مسیحائی کا کرشمہ رکھتا تھا.. اُسے جس بیمار کے بدن سے چھوا جاتا وہ بھلا چنگا ہو جاتا.. ماں کی تہہ شدہ اس قمیض میں بھی یہی معجزہ پوشیدہ تھا' کوئی یقین کرے یا نہ کرے..

اُس کی بیوی اور بیٹا تو بہت بعد میں آئے.. یہ ٹرنک پہلے آیا.. بہو اور پوتا پوتی تو گویا..

کل ہی اُس کی حیات میں وارد ہوئے تھے..

اُس کی بہو ایک اچھی خصلت کی مالک عورت تھی ورنہ وہ اُسے اب تک کیوں برداشت کرتی لیکن اُس کے اندر کمیونزم اور اس کے عظیم رہنماؤں کے لیے بہت کڑواہٹ تھی..وہ اُنہیں معتوب کرتی رہتی اور اُسے چپ رہنا پڑتا..وہ اپنا کمرہ کھونا نہیں چاہتا تھا..وہ اس خیال کی اسیر تھی کہ اگر اُس کا خاوند ایک صبح حسب معمول تیار ہو کر فیکٹری جانے کے لیے گھر سے نکلا اور کبھی نہیں لوٹا تو یہ کوئی حادثہ نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی عورت کے لیے اُسے چھوڑ گیا تھا..بلکہ وہ جوزف سٹالن کے عتاب کا شکار ہو کر لاکھوں دوسرے روسیوں کی مانند کہیں سائبیریا میں کسی عقوبت خانے میں مر گیا تھا کیونکہ وہ فیکٹری میں ہمیشہ بڑبڑاتا رہتا تھا کہ یہ کیسا انقلاب ہے کہ میں فیکٹری میں رات گئے تک اپنی کمر توڑتا ہوں اور پھر بھی اکثر اوقات ایک باسی روٹی پانی میں بھگو کر کھاتا ہوں اور کوچوں بازاروں میں میری ایک مزدور کی عظمت کے گیت گائے جاتے ہیں..میرے مجسمے آویزاں کیے جاتے ہیں..اور وہ جو ہمیں کبھی نظر نہیں آتے یوم مئی کی پریڈ کے دوران سال میں صرف ایک مرتبہ کریملن کی دیوار کے پیچھے بھاری کوٹوں اور میڈلوں کے انبار میں بہت دور سے نظر آتے ہیں۔وہ محلات میں رہتے ہیں اور ایک پرتعیش زندگی بسر کرتے ہیں..وہ اکثر بڑبڑاتا رہتا تھا..

اُس کی غیر موجودگی میں ایک روز اُس کی بہو نے اُس کا ٹرنک کھول کر وہ تمام جنگی میڈل جن پر سٹالن کی شبیہہ ابھری ہوئی تھی نکالے اور اُنہیں جانے کہاں پھینک آئی..اس کے باوجود وہ چپ رہا..اُن میڈلوں کی گمشدگی کے بارے میں کچھ تذکرہ نہ کیا..بہر طور وہ اس مفروضے پر یقین نہ رکھتا تھا کہ اُس کے اکلوتے بیٹے کی گمشدگی میں مارشل سٹالن کا ہاتھ ہو سکتا ہے..وہ تو عظیم سوویت یونین کا باپ تھا' مسلح افواج کا کمانڈر ان چیف تھا جس کی بے مثال اور انقلابی قیادت میں روسیوں نے نازیوں کو شکست دے کر تاریخ کی سب سے بڑی فتح حاصل کی تھی۔جب وہ.. بورس ذوخوف لینن گراڈ کے معرکے کے دوران بھوکا پیاسا اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر گھسٹتا آگے بڑھتا تھا اور نازیوں کے بالمقابل پیچھے نہ ہٹتا تھا تو یہ عظیم باپ سٹالن تھا جو اُس میں ایک نئی رُوح بھرتا تھا..وہ کیسے اتنا ظالم ہو سکتا تھا کہ اپنے ہی ایک سپاہی کے بیٹے کو ہلاک کر ڈالے..

تو جونہی اُس کی اُنگلی نے نو کے ہندسے کو چھوا' اُس کے لمس سے آشنا ہوئی تو اُس نے مسکراتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے حساب کیا جیسے وہ یہ حساب پہلی بار کر رہا ہو کہ نو مئی کے آنے میں

صرف بیس روز باقی رہ گئے تھے..

چونکہ صرف بیس روز باقی رہ گئے تھے اس لیے اُسے تیاری کا آغاز کر دینا تھا..

بورس نے پورے گیارہ ماہ اور دس دن کے بعد جستی ٹرنک کا ڈھکن اُٹھایا اور اُس کے اندر اس اشتیاق سے جھانکا جیسے کچھ علم نہ ہو کہ اس کے اندر کیا ہے ایسے جھانکا..جیسے وہ ایک آوارہ گرد ہو اور ایک دور افتادہ اجنبی وادی میں پہلی بار داخل ہو رہا ہو..اُس کے اندر ٹرنک کے اندر معرکۂ لینن گراڈ ابھی تک سانس لیتا تھا' اُس کی مہک باقی تھی' بارود کی بُو تھی اور لاشوں کی سڑاند تھی..اور بھوک اور پیاس سے مرتے ہوئے یا نازیوں کی بمباری سے جن کے پرخچے اڑ گئے تھے اُن کے لوتھڑوں میں سے برآمد ہونے والی موت کی آخری ہچکیاں تھیں..وہاں وہ برسوں تک اپنے رفیقوں کی لاشوں کے درمیان ہی سوتا جاگتا رہا تھا..اُنہیں دفن کرنے کے لیے اگر وقت ہوتا بھی تو زمین نہ ہوتی..دریائے نیوا میں پانی کم تھے اور اُن میں روسی فوجیوں کی اُبھرتی ڈوبتی لاشیں زیادہ تھیں اور جب کبھی کوئی جنگی کشتی اُن میں تیرتی گزرتی تو وہ لاشے اُس کے آہنی وجود سے بھڑتے ٹکراتے' بوسیدگی میں پھٹتے اور ٹکڑوں میں بٹ جاتے..کوئی ایک ہاتھ کشتی کے ساتھ یوں جُڑ جاتا جیسے اپنی جان بچانے کی التجا کر رہا ہو..

صرف اُس نے ہی نہیں اُس کے بہت سے ساتھیوں نے بھوک سے لاچار ہو کر اور بے سُدھ ہو کر اپنے رفیقوں کے لاشے کاٹ کر اُن کے گوشت کے نمکین پارچے نگلے تھے..

بس ایک بار اُنہیں ایک جرمن سپاہی کی لاش سے ایک جنگی چاقو سے تراشیدہ گوشت کے دو چار تلے نگلنے کا اتفاق ہوا تھا اور اُنہیں ایک عجیب سا صدمہ پہنچا تھا..اُن کا خیال تھا کہ ایک دشمن نازی کی لاش کا گوشت بہت کڑوا اور کسیلا ہو گا بلکہ زہر آلود ہو گا پر ذائقے میں کچھ فرق نہ تھا..روسی اور جرمن پارچے ذائقے میں ایک جیسے تھے..

ٹرنک میں اُن زمانوں کے روسی اخباروں کے کچھ تراشے بھی تھے جو بھورے ہو کر بھُربھُرے ہو چکے تھے اور ان میں مارشل سٹالن کا وجاہت بھرا چہرہ سیلوٹ کر رہا تھا اور مارشل ذوخوف ایک تصویر میں سینکڑوں بھاری توپوں کے درمیان اپنے بھاری وجود کے ساتھ کھڑا برلن پر آخری حملہ کرنے کا حکم دے رہا تھا..اس روز تو وہ ٹرنک کا ڈھکن کھول کر ماضی کی مہک کے خمار میں گم رہتا..

پھر نو مئی میں انیس دن باقی رہ جاتے تو وہ اُس میں سے اپنی پرانی وردی نکالتا اور سارا

دن کونکوں کی استری سے اُس کی سال بھر کی شکنیں استوار کرتا رہتا..

ایک بار اُس کی بہو نے اُس پر ترس کھا کر اُس سے پوچھے بغیر اس پرانی وردی کو استری کر دیا تھا تو وہ اُس پر برس پڑا تھا. اسے دوبارہ ہاتھ نہ لگانا نتاشا.. یہ مجھے اپنے پوتے سے بھی زیادہ عزیز ہے. اس کی شکنیں دُور کرنا صرف میرا حق ہے۔

یہ بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں کہ وہ ٹرنک کا ڈھکن اُٹھا کر سب سے پہلے اُس اونی قمیض کو ایک مقدس صحیفے کی مانند اٹھا کر اُسے سونگھتا.. اور پھر نہایت احتیاط سے دوبارہ ٹرنک کے کونے میں رکھ دیتا..

اُس سے اگلے روز وہ اپنے جنگی میڈل.. جو ہر سپاہی کو چاہے وہ میدان جنگ میں بے جگری سے لڑا تھا یا نہیں. صرف خچر ہانکتا رہا تھا یا دیگر فوجیوں کے لیے روٹیاں پکاتا رہا تھا.. عطا کر دیے جاتے تھے.. یہ اہل اقتدار کی جانب سے فریب اور دھوکہ دہی کی قانونی وارداتیں تھیں کہ تمہاری خدمات کے عوض میں ہم نے تمہارے سینے پر یہ میڈل ٹانک دیے ہیں تو تمہیں اور کیا درکار ہے.. اس عیاری کے باوجود ہر سپاہی ان بیکار میڈلوں کو دل و جان سے عزیز رکھتا تھا.. تو اُس سے اگلے روز بورس اپنے ان میڈلوں پر جن پر کامریڈ لینن کی سٹالن کی شبیہیں کندہ تھیں اور سُرخ ستارہ نمایاں تھا.. درانتی اور ہتھوڑے کے نقش تھے ایک محلول اُن پر چھڑک کر چمکاتا اور لشکاتا رہتا تھا.. البتہ یہ ابتدائی ایام کا قصہ تھا جب کہ بعد میں کامریڈ سٹالن کی شبیہ والے میڈل پُراسرار طور پر ٹرنک میں سے غائب ہو گئے تھے اور وہ چپ رہا تھا' کوئی تذکرہ نہ کیا تھا..

اپنے بوسیدہ بوٹ پالش کرتا..

ٹائی کی گرہ بار بار باندھ کر کھولتا.. اور جب وہ اُس کی خواہش کے مطابق موٹی گرہ والی ہو جاتی تو اُسے جوں کی توں گلے میں سے نکال کر کھونٹی سے لٹکا دیتا..

اُس کی بہو نتاشا.. پوتا جوزف اور پوتی ساشا جو یوں بھی اُس سے کوئی خاص میل جول نہ رکھتے مئی کے مہینے کے آغاز میں ہی اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیتے.. اُس کے کمرے میں بھی نہ جھانکتے..

باہر.. اُس مختصر فلیٹ کے باہر زمانے بدل چکے تھے جب کہ اُس کے زمانے اُس ٹرنک کے اندر حنوط ہو چکے تھے..

گورباچوف' یلسن اور پیوٹن نے اُس کے.. بورس کے سوویت یونین کے بخیے ادھیڑ

دیے تھے.. اُسے بکھیر دیا تھا.. اکتوبر انقلاب کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا اور اُس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نافذ کر دیا تھا.. اور عظیم لینن کریملن کے سائے میں اپنے شیشے کے تابوت میں حنوط.. احتجاج کے طور پر کروٹ بھی نہ بدل سکتا تھا..

وہ باہر کے زمانوں میں جا کر کیا کرتا' اُن کے لیے وہ ایک اجنبی تھا۔ 1986ء کے بعد اُس نے اپنے کمرے سے باہر جانا تقریباً ترک کر دیا تھا.. باہر کوڑے کے ڈھیروں پر لینن کے مجسمے اوندھے پڑے تھے.. سرخ انقلاب کا خواب منتشر ہو چکا تھا..

البتہ وہ ہر ماہ نہایت باقاعدگی سے لینن کے مقبرے کے تہہ خانے میں اُترتا اور پہرے داروں کی سرزنش کے باوجود بھیگی ہوئی آنکھوں سے اُس کے حنوط شدہ چہرے کو ایک کامریڈ سلیوٹ کرتا..

کبھی پورا مغرب اُس کے سوویت یونین کے سامنے لرزتا تھا اور اب اُس مغرب کا نظام اپنی تمام تر آزادیوں اور قباحتوں کے ساتھ اُن کا حکمران ہو چکا تھا.. بے شک اُس کے زمانوں میں تنگی بہت تھی. شخصی آزادی نہ تھی.. لیکن عزت نفس تو تھی اور اب ایک خاص طبقے کے پاس سب کچھ تھا.. کاریں اور بڑے بڑے گھر تھے پر عزت نفس کو دفن کر دیا گیا تھا.. امریکہ کو خدا مان لیا گیا تھا.. اُس کا اپنا پوتا جوزف میکڈانلڈ میں ویٹر کے طور پر کام کرتا تھا اور ایک روز وہ اُس کے لیے ایک میک برگر لے کر آ گیا اور کہنے لگا' دادا ذرا یہ برگر تو کھا کر دیکھو جس کے لیے ہم نے تمہارا نظام بدل دیا ہے.. ظاہر ہے اُس نے اُسے ہاتھ تک نہ لگایا..

وہ جب کبھی معرکہ لینن گراڈ کا ذکر چھیڑتا تو اُس کی پوتی ساشا اُسے ٹوک دیتی.. دادا آپ کن زمانوں میں جی رہے ہیں اب اُس کا نام پھر سے سینٹ پیٹرز برگ ہو گیا ہے..

اور وہ اُسے سمجھاتا' نہیں ساشا ہم نے جو جنگ لڑی تھی' وہ لینن گراڈ کے لیے لڑی تھی' زاروں کے سینٹ پیٹرز برگ کے لیے نہیں لڑی تھی.. دوسری جنگ عظیم کے دوران ہمارے کام سینٹ پیٹر تو نہیں آیا تھا' کامریڈ لینن کے اقوال اور کامریڈ سٹالن کی شاندار قیادت آئی تھی اور ساشا بوریت میں کندھے جھٹک کر امریکی چیونگم چباتی چلی جاتی..

بورس کمیونسٹ نہیں تھا..

جیسے کائنات کے کُل بورس جہاں کہیں جس معاشرے یا مذہب میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ پیدا ہوتے ہی اُنہی معاشرتی اقدار اور اُسی مذہب کے پیروکار ہو جاتے ہیں.. جیسے دنیا کے تمام

خطوں میں کہیں بدھ، کہیں مسلمان، ہندو، یہودی یا عیسائی وغیرہ پیدا ہوتے رہتے ہیں اسی طور بورس نے بھی ایک کمیونسٹ معاشرے اور سرخ انقلاب میں رنگے ہوئے سوویت یونین میں آنکھ کھولی تو وہ بنا مرضی اور انتخاب کے بہر طور کمیونسٹ ہو گیا.. جیسے ہم مسلمان یا عیسائی ہو جاتے ہیں..

اُس کے ان آخری دنوں میں جب وہ ٹمٹما رہا تھا، کسی بھی لمحے بجھ سکتا تھا بس نو مئی کی ہی ایک کرن تھی جس کا وہ منتظر رہتا.. یہ کرن اُس ایک روز کے لیے اُس کے چہرے کی شکنوں کو رفو کر دیتی اور اُس کی آنکھوں کی بینائی بڑھا دیتی.. وہ پورا برس اس آرزو کے سہارے گزارتا کہ وکٹری ڈے پر جب میں اپنی وردی زیب تن کر کے اُس پر اپنے میڈل سجا کر وکٹری پارک میں پہنچوں گا تو لوگ مجھ پر فخر کریں گے، میں نگاہوں کا مرکز بن جاؤں گا اور مجھ پر پھول نچھاور کیے جائیں گے..

وہ ہمیشہ تنہا گھر سے نکلتا، صرف ایک بار اُس نے اپنی پوتی سے درخواست کی تھی کہ ساشا کیا تم آج میرے ہمراہ چل سکتی ہو.. کچھ فوجیوں کی پوتیاں اُن کے ساتھ آتی ہیں، تم چل کر دیکھو تو سہی کہ تمہارے دادا کی کتنی عزت ہوتی ہے.. لوگ کیسے اُس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں اور پھولوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں.. تمہیں اپنے دادا پر فخر ہوگا جب تم میرے ساتھ ساتھ پھول اُٹھائے چلو گی..

وہ ساشا عجب انداز میں مسکرائی تھی ''نہیں دادا.. مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی پرانی وردی پہن کر میڈل سجا کر جب ہر برس وکٹری پارک میں جاتے ہیں تو بھیک مانگنے جاتے ہیں.. کہ آؤ میں نے مادر وطن کے لیے جنگ لڑی تھی، پلیز مجھے پھول پیش کرو..''

''نہیں ساشا..'' اُس کی بجھتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ''وہ صدق دل سے میری وردی اور تمغوں کی قدر کرتے ہیں.. میں مانگتا تو نہیں وہ خود ہی پھول پیش کرتے ہیں..''

''نل شٹ..'' ساشا نے چیونگم چباتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تھا ''وہ آپ پر ترس کھاتے ہیں۔''

اُس نے بہت راتیں بے خوابی میں گزاریں.. اُس کے اونگھتے ہوئے ذہن کی سکرین پر لینن گراڈ کے دن اور رات منعکس ہوتے رہے.. وہ اپنے کامریڈ کی لاشوں پر رینگ رہا تھا.. اُن کی لاشیں بُو دے رہی ہیں.. وہ کئی روز سے بھوکا ہے اور پارچے چبا رہا ہے جن میں نمک بہت ہے.. دریا میں ہزاروں لاشیں پھولی ہوئی مشکوں کی مانند ہچکولے کھاتی ڈوبتی ابھرتی ہیں.. اور وہ

سرخ پرچم گرنے نہیں دیتا.. درانتی اور ہتھوڑے کو سربلند رکھتا ہے مادر وطن کے لیے.. تو کیا واقعی لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں.. مجھے ایک بھک منگا سمجھتے ہیں.. آج کی نسل تو بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی تو کیا واقعی وہ وکٹری پارک میں آنے والے بوڑھے فوجیوں کو بھکاری سمجھتی ہے.. اُن پر ترس کھاتی ہے.. وہ کبھی یہ فیصلہ کر لیتا کہ اس برس میں وردی پہن کر وکٹری پارک میں نہیں جاؤں گا اور پھر اُسے اُن کے دمکتے ہوئے چہرے یاد آ جاتے.. اُن کی آنکھوں میں اُترتی نمی یاد آ جاتی جب وہ پھول پیش کرتے تھے.. بھیک دینے والوں کی شکلیں ایسی تو نہیں ہوتیں.. وہ مؤدب ہو کر آپ کی کہانیاں تو نہیں سنتے.. آپ کو گلے تو نہیں لگاتے..

نتاشا اپنی بیٹی کی مانند کبھی اتنی بے باک تو نہیں ہوئی تھی لیکن اُس کا رویہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اُس سے متفق ہے..

وہ اُس روز بن ٹھن کر جب گھر سے نکلتا تو نتاشا سے کہتا ''دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا..''

اور وہ جو بھی کام کر رہی ہوتی اُس میں وقفہ ڈالے بغیر اُس کی جانب دیکھے بغیر کہتی ''ہاں وہاں کوئی نہ کوئی آپ کو کھانا کھلا دے گا..''

اور وہ مسکراتے ہوئے کہتا ''ہاں ہاں.. وہ بہت اصرار کرتے ہیں.. لینن گراڈ میں لڑنے والے ایک ہیرو کو کھانے پر مدعو کرنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔''

''ہاں.. وہ جانتے ہیں کہ اس ہیرو نے ایک مدت سے اچھا کھانا نہیں کھایا۔''

وہ اُس کے پوشیدہ طنز کو سمجھتا تو تھا لیکن اُسے تب تک اُس کی عادت جانتا تھا جب تک نتاشا نے بھیک کی بات نہ کی تھی..

نتاشا بھی اُسے ایک بھک منگا ہی سمجھتی تھی..

تو سمجھتی رہے..

وہ بیس دن.. نو مئی تک کے بیس دن تو یوں فر فر گزرے جیسے دیوار پر آویزاں کیلنڈر آندھی کی زد میں آ گیا ہو، دنوں کی بجائے تاریخیں پھڑ پھڑاتی ہوئی لمحوں میں گزر گئیں..

اُس شب اُس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی.. جیسا کہ پچھلے کئی برسوں سے اس شب میں ہوتا چلا آیا تھا.. وہ کروٹیں بدلتا رہا اور ہر کروٹ کے ساتھ اُس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہو جاتا اور اُس کی خدمت میں پھول پیش کر دیتا.. کھڑکی کے پردے میں سرایت کرتی ماسکو کی سفید

راتیں تھیں.. وہ بستر سے اُترا.. منہ ہاتھ دھو کر وردی کو ایک مقدس فریضے کی مانند پہنا.. بوٹوں کو ایک مرتبہ پھر پالش کر کے پہنا.. ٹوپی سر پر جمائی اور کمرے سے نکل گیا.. اُس نے آج کسی کو بھی مطلع کرنا مناسب نہ جانا کہ میں دوپہر کے کھانے کے لیے گھر نہیں آؤں گا.. ویسے آج صرف آج ایک گہری اداسی اور فنا کی سردی اُس کے بدن میں اُترتی تھی.. پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا جیسے آج رخصتی کا دن ہو.. کسی نہ کسی وکٹری ڈے نے آخری ڈے ہونا تھا تو کیا پتہ آج وہی روز آخر ہو..

وہ اپنے فلیٹ سے باہر آیا.. نیچے آ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا تو سامنے سے آتے وہ لوگ جو اُسے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے اُسے راہ دینے لگے.. آگے بڑھ کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملانے لگے.. اور پہلی بار اُسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ لوگ اس کی وردی اور تمغوں کو راہ دیتے ہیں اُس سے بورس سے نہیں اُن سے ہاتھ ملاتے ہیں.. تو پھر بورس کہاں گیا..

زیر زمین ریلوے میں سوار ہو کر جب وہ وکٹری پارک کی جانب جا رہا تھا تو اُس نے اپنے جیسے وردی پوش تین اور بوڑھوں کو بھی دیکھا.. اگرچہ وہ کامریڈ تھے دوسری جنگ عظیم کے دوران جانے وہ کون سے محاذ پر تھے اور لڑنے والوں میں سے تھے یا محض تندور پر روٹیاں لگانے والے یا سپاہیوں کی وردیاں سینے والے تھے جو بھی تھے کامریڈ تھے لیکن اُنہوں نے اُن چاروں نے آپس میں کچھ کلام نہ کیا کہ وہ آج کے دن ایک دوسرے کے رقیب تھے کہ دیکھیں کس کے حصے میں زیادہ پھول آتے ہیں تو کیا سا شاید کہتی تھی ہم سب بھیک مانگنے کے لیے نکلے ہیں..

لیکن وکٹری پارک میں اُس خنک سویر میں جو کہ دھوپ بھری تھی ہر فوجی کے حصے میں اتنے ڈھیروں پھول آئے کہ وہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے.. اگرچہ آج کے روز موسلا دھار بارش کی پیش گوئی تھی لیکن آسمان پر صبح سویرے سے اُڑتے چکر لگاتے جہازوں نے کوئی کیمیائی محلول چھڑک کر بادلوں کو عارضی طور پر پسپا کر دیا تھا اور دھوپ نمایاں ہو گئی تھی...

پارک میں بیشتر لوگوں اور بچوں کے ہاتھوں میں روسی پرچم تھے اور ایک نوجوان لڑکی نے بورس کو کارنیشن کے سرخ پھول نذر کرتے ہوئے ایک پرچم بھی پیش کر دیا..

بورس نے جھک کر پھول وصول کر لیے ”یہ میرا پرچم نہیں ہے۔“

اُس لڑکی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اُسے تو یہی پرچم تین رنگوں کی پٹی والا آس پاس دکھائی دیا تھا تو یہ فوجی اگر یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میرا پرچم نہیں ہے تو اسے معاف کر دینا چاہیے.. دوسری جنگ عظیم کے بچے کھچے بیشتر فوجی بڑھاپے کے باعث اپنے حواس پر اختیار نہ رکھتے تھے..

”سر.. یہ روس کا پرچم ہے۔“

”ہاں یہ ہو گا.. پر یہ وہ پرچم نہیں ہے جو سرخ ہے اور اُس پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان ہے جو میرا پرچم ہے بیٹی..“

”لیکن.. پرچم بدل چکا ہے جناب..“

”میں اپنے پرچم بدلا نہیں کرتا..“

”یقیناً..“ اُس محبت بھری لڑکی نے بے یقینی میں سر ہلایا اور چلی گئی..

وہ ایک بنچ پر نڈھال ہو بیٹھ گیا اور اُس کی گود پھولوں سے بھری ہوئی تھی..

ایک اُس کی عمر کا بوڑھا آیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر بولا ”مجھے اب سرکار کی جانب سے پنشن نہیں ملتی.. اور پھول بہت مہنگے ہیں.. اور مجھے بڑھاپے کی بہت ساری بیماریاں ہیں جن کا میں علاج نہیں کروا سکتا کہ علاج بہت مہنگا ہے.. میں تو زیر زمین ریلوے میں اُترتے ہوئے جہاں ٹکٹوں کی خودکار چیکنگ ہوتی ہے وہاں کھڑا رہتا ہوں اور پھر کوئی نوجوان مجھ پر ترس کھا کر مجھے پار لے جاتا ہے تو میں پھول نہیں خرید سکتا.. آپ کے ہاتھوں پر ایک بوسہ دے سکتا ہوں۔“

بورس کچھ نہ بولا.. اور وہ معمر شہری اُس کے ہاتھوں پر ہونٹ ثبت کر کے ایک ناتوانی کے ساتھ چلتا ہجوم میں کھو گیا۔

آج دھوپ کتنی چمکیلی اور بوڑھی ہڈیوں کو سکھ دینے والی تھی.. وہ ایک مزے کی اونگھ میں چلا گیا.. نیم غنودگی کا لطف لیتا رہا.. اُس سے کچھ فاصلے پر ایک دل کش عورت جو مہنگے ترین امریکن طرز کے لباس میں تھی اپنے چھوٹے سے بچے کو اُس کی جانب اشارہ کر کے کچھ بتا رہی تھی۔ بچہ پہلے تو جھجکتا رہا اور پھر ہولے ہولے چلتا اور بار بار مڑ کر اپنی ماں کی جانب دیکھتا کہ کیا میں درست سمت میں درست شخص کی جانب جا رہا ہوں اُس کے پاس آ گیا اور اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ایک روسی پرچم اُس کے پھولوں پر رکھ کر ایک گھبراہٹ میں فوراً واپس چلا گیا.. اُس کی ماں نے داد طلب نظروں سے بورس کو دیکھا اور وہ جواب میں مسکرایا اور ذرا جھک کر ماں کی عافیت میں واپس پہنچ چکے بچے کا شکریہ ادا کیا..

وہ اس نئے پرچم کو ہاتھ لگانے پر بھی تیار نہ تھا.. یہ اس کی کل حیات اور جدوجہد کی نفی کرتا تھا.. اُس کی محبتوں اور دکھوں کا شریک نہ تھا یہ اُس کی شکست کا اعلان کرتا تھا.. بیشتر فوجیوں کی مانند اُس کی جیبوں میں اپنے خاندان کی تصویروں کے علاوہ ایک سرخ پرچم بھی ہوا کرتا تھا گویا

وہ بھی اُس کے خاندان کا ایک فرد تھا.. وہ اب اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اُسے ٹرنک سے نکال کر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلانا بھی نہیں تھا لیکن اُس میں اپنے خون اور پسینے کی بُو سونگھ سکتا تھا.. اگر پچھلے نظام کو ترک ہی کرنا تھا اور اُس کی تمام نشانیوں کو ملیامیٹ کرنا تھا تو بے شک وہ ہتھوڑے اور درانتی کو مٹا دیتے لیکن پرچم کو سرخ تو رہنے دیتے.. وہ کیسے اس نئے پرچم کے ساتھ مفاہمت کر سکتا تھا جس کے ساتھ اُس کا تعارف ہی نہ تھا.. نہ وہ اُسے پہچانتا تھا اور نہ وہ اُس سے واقفیت رکھتا تھا.. جیسے آپ اپنے بچے کو نہیں بدل سکتے ایسے آپ ایک پرچم کو بھی نہیں بدل سکتے.. وہ قسم تو نہیں اُٹھا سکتا تھا لیکن شاید اُس نے اس نئے بچے کو آج تک چھونا بھی گوارا نہیں کیا تھا چہ جائیکہ اُس سے محبت کرتا' اُسے تھپکتا..

دونوں ماں بیٹا ایک فاصلے پر کھڑے منتظر تھے کہ وہ اُن کے عطا کردہ پرچم کو پھولوں کے ڈھیر سے اُٹھا کر اُن کی جانب لہرا کر تشکر اور مسرت کا اظہار کرے.. اور اتنی آرزو سے اُس کی جانب تکتے تھے کہ بورس نے لرزتی اُنگلیوں سے پرچم کو اُٹھایا اور بلند کر کے اُن کی جانب لہراتے ہوئے مجبوراً مسکرایا.. وہ اپنا تشکر وصول کر کے چلے گئے.. ہزاروں کے اُس ہجوم میں کھو گئے جو اُس جیسے بوڑھے فوجیوں کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے آج وکٹری پارک فتح کا جشن منا رہا تھا..

گویا آج اُس نے اپنی ہار مان لی تھی..

اُسے اتنے برسوں بعد معرکہ لینن گراڈ میں شکست ہو گئی تھی..

سواستیکا کا نشان آویزاں کیے نازی پرچم تو اُسے شکست نہ دے سکا تھا..

اُس کے اپنے روس نے اپنا نیا ترنگا لہرا کر اُسے مات کر دیا تھا..

بورس نے ایک مجرم کی مانند آس پاس نگاہ کی' جائزہ لیا اور بنچ کے برابر میں جو کوڑے کی ٹوکری تھی اس میں چپکے سے اس پرچم کو پھینک دیا.. جیسے مجبور مائیں اپنے ناجائز بچے کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک جاتی ہیں.. شاید یہ موازنہ ایک بری مثال ہے.. اُن ماؤں کے اندر ایک گہرا دُکھ ہوتا ہے' اُن کا کلیجہ کٹتا ہے جب وہ ایسا کرتی ہیں کہ وہ ناجائز ہی سہی اُن کا اپنا خون ہوتا ہے۔ جوزف کو کچھ قلق نہ ہوا کہ وہ اُس کا بچہ تھا ہی نہیں..

وہ پرچم کوڑے کی ٹوکری میں کاٹھ کباڑ میں پڑا ہوا بھی اُس کی شکست کا اعلان برابر کیے جا رہا تھا..

اُسے اپنے ہم وطنوں کی عقیدت اور محبت نے تھکایا تو تھا لیکن اس تھکاوٹ میں بھی

ایک عجیب سرخوشی تھی لیکن.. اس پرچم کو چھونے اور لہرانے سے وہ ڈھے گیا تھا.. شکست خوردہ اتنا ہو گیا تھا کہ وہ اُٹھا' اپنے پھولوں کے ڈھیر کو سنبھالتا اُٹھا... وہ گھر لوٹنا چاہتا تھا.. ایک شکست خوردہ شخص ہمیشہ گھر لوٹنا چاہتا ہے.. وہ ایک طویل فاصلہ طے کر کے زیرزمین ریلوے کی راہداریوں میں بہتے ہجوم کے ساتھ بے اختیار بہتا.. خودکار زینوں پر اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتا نیچے سٹیشن تک اُترتا گیا اور پھر لوگوں سے لبریز پلیٹ فارم پر دھکے کھاتا ہوا بالآخر ایک گاڑی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا.. اگرچہ ڈبے میں کوئی نشست خالی نہ تھی لیکن ایک نوجوان جوڑے نے اُس کی تعظیم کی' اُسے سنبھالا دیا اور اپنی نشست خالی کر دی.. وہ دن بھر کی تھکاوٹ سے چُور.. وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا چلا آیا تھا.. پر اب وہاں ایک رنج ایسا تھا جو اُس کے بوڑھے بدن میں سرایت کرتا اُس کی کل حیات کو بیکار کرتا تھا.. اُسے آج مات ہوئی تھی..

اُس کے برابر میں ناآشنا لباسوں میں ایک غیرملکی جوڑا بیٹھا تھا.. اور اُس نے محسوس کیا کہ اُن کے درمیان شاید محبت کا رشتہ نہیں ہے جو وہ آپس میں جُڑ کر نہیں بیٹھے ہوئے.. کھنچے کھنچے سے ہیں.. اُن دونوں کی آنکھیں بڑی بڑی سی تھیں اور وہ ادھیڑ عمر کے تھے اور اس کے باوجود اُن میں ایک سیاہ کشش تھی جو اُن کی عمر کے روسی جوڑوں میں نہیں ہوتی..

''تم کہاں کے ہو؟'' اُس نے برابر میں بیٹھے مرد سے پوچھا۔

''پاکستان سے..''

''اور یہ..'' اُس نے خاتون کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ بھی پاکستان سے..''

''تم بتا سکتے ہو کہ میں کتنے برس کا ہوں..'' اُس نے ایک بچگانہ معصومیت سے پوچھا تھا..

''آپ ستر برس سے زیادہ کے ہیں.. شاید اسی برس کے لگ بھگ...''

''نہیں نہیں..'' وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا ''میں تو نوے برس کا ہوں.. کیا میں نوے برس کا دکھائی دیتا ہوں؟''

''نہیں.. آپ تو اسی برس کے بھی نہیں لگتے..''

''پاکستانی بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں..'' یہ کہہ کر وہ پھر سے اونگھ گیا تھا..

وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو اُس کی بہو اپنے بچوں سمیت کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی..

اور اُس کی نظروں میں بیزاری اور شکایت تھی کہ اتنی دیر سے کیوں آئے ہو.. کسی نے بھی اُس کے پھولوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا.. اُس کی پُرفخر بوڑھی مسکراہٹ کا احساس نہ کیا..

"دیکھو نتاشا.. وہ مجھے بھولے نہیں.. تریسٹھ برس گزر جانے کے باوجود عظیم سوویت یونین کے ایک معمولی سے سپاہی کو نہیں بھولے... پچھلے کئی برسوں میں مجھے کبھی اتنے پھول نہیں ملے جتنے آج ملے ہیں.. دیکھو.." اُس نے پھولوں کے انبار کو اپنے دونوں بازوؤں پر اُٹھا کر انہیں دکھایا.. پر کسی نے کچھ نہ کہا۔ البتہ اُن کی الزام لگاتیں نظریں کہتی تھیں کہ بوڑھا بھیک حاصل کر کے آ گیا ہے..

"دادا.. کھانا کھاؤ گے؟" اُس کی پوتی نے کہا۔

"نہیں.." وہ آزردہ ہو کر بولا حالانکہ اُسے بھوک لگی تھی..

"کسی نے کھلا دیا ہوگا.. ایک بوڑھے فوجی کی شاندار خدمات کے عوض کسی نے تو کھانا کھلا دیا ہوگا۔" اُس کی بہو کے لہجے میں اتنی کڑواہٹ کیوں تھی..

وہ کہا کرتا تھا کہ.. ہاں ہاں وہ بہت اصرار کرتے ہیں.. لینن گراڈ میں لڑنے والے ایک ہیرو کو کھانے پر مدعو کرنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں.. لیکن آج ایسا نہ ہوا تھا.. شاید سب جان گئے تھے کہ آج اُس نے ہار تسلیم کر لی تھی اور شکست مان کر ایک نیا پرچم لہرا دیا تھا..

وہ بہت بجھا ہوا ایک افسردگی کے سناٹے میں اپنے ڈربے میں چلا گیا.. اُن تینوں گلدانوں میں جنہیں وہ پانی سے لبریز کر کے گیا تھا اُن میں اُس نے بے دلی سے یہ پھول ٹھونس دیے.. اپنی وردی اُتارتے ہوئے.. اُس پر آویزاں میڈل اُتارتے ہوئے کہ اُن میں کچھ پر سرخ ستارہ چمکتا تھا اور کچھ پر پرانا سرخ پرچم کندہ تھا.. انہیں اُتارتے ہوئے اُسے گمان ہوا کہ یہ آخری بار ہے.. اُس کے بعد ایک اور نومئی.. ایک اور وکٹری ڈے نہیں آئے گا.. یہ گمان ہوا اور پھر یقین میں بدلا کہ وہ کبھی دوبارہ اس وردی کو زیب تن نہیں کرے گا کہ اس وردی کو شکست ہو چکی تھی اور یہ سارے کے سارے بہادری کے میڈل بزدلی کی نشانی ہو چکے تھے..

جیسے کسی بھی جانور کو.. اور خاص طور پر کتے کو اپنی موت کے بارے میں آگاہی ہو جاتی ہے.. اُس کے اندر مرگ کی آمد کا اعلان ہو جاتا ہے تو وہ چپ ہو جاتا ہے.. کسی کی نظر کے سامنے آنے سے اجتناب کرتا ہے.. چھپتا پھرتا ہے.. کسی جھاڑی کی اوٹ میں پوشیدہ ہو کر موت کا منتظر ہو جاتا ہے.. بس ایسے ہی بورس بھی آگاہ ہو گیا تھا..

اُس نے اپنی وردی اُتار کر حسبِ معمول تہہ کر کے اپنے ٹرنک میں نہیں سنبھالی..

کچھ دیر ایک کونے میں موت کی آمد کے منتظر ایک کُتے کی مانند بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر ٹرنک کا ڈھکن اُٹھایا.. کتنے برس پہلے.. بہت برس پہلے۔ شاید چھیاسٹھ برس پہلے اُس کی ماں نے جس اونی قمیض کو استری کر کے تہہ کر کے ٹرنک میں رکھا تھا کہ بیٹا جب تمہیں بہت سردی محسوس ہو تو اسے پہن لینا اور اُس نے آج تک اُسے ہاتھ نہیں لگایا تھا' اُسے ٹرنک کے ایک کونے میں رہنے دیا تھا' بورس نے اُس اونی قمیض کو نکالا.. ناک سے لگا کر اپنی ماں کی مہک سونگھی اور اُسے کھول کر پہن لیا.. اور اُس پرچم کو جو اُس کے خون اور پسینے سے بھی بھیگا تھا اُسے نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلایا.. وہ اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اُس پر نقش درانتی اور ہتھوڑا اُس کے ہاتھوں میں بکھرتے گئے..

بورس کسی جھاڑی کی اوٹ میں پوشیدہ ہو کر منتظر نہ ہو سکتا تھا.. وہ اپنے ڈربے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا.. ایک ایسی اونگھ میں چلا گیا جس میں سے کون جانے کہ وہ بیدار ہوا بھی یا نہیں..

اور وہ نہ ہوا..

اُسے ایک وار ہیرو کے طور پر روس کے نئے پرچم میں لپیٹ کر دفنایا گیا..

اُس کی شکست پر آخری مُہر ثبت ہوگئی..

نواں باب

''آج پھر جشن کی رات تھی اور یہ وہ شہر نہ تھا''

ماسکو سے پانچ روز کی مسافت پر واقع جھیل بیکال کے کناروں پر رہنے والی تانیا نے پوچھا تھا کہ.. وکٹری پارک سے واپسی پر ٹرین میں آپ کی جس بوڑھے فوجی سے ملاقات ہوئی تھی' تو وہ کیسے ایک کردار میں ڈھل سکتا ہے.. یا ڈھالا جا سکتا ہے..

تو یہ ہمارے برابر میں بیٹھے ہوئے بورس کی کہانی تھی جو ہم سے دریافت کرتا تھا کہ میں کتنے برس کا ہو سکتا ہوں اور پاکستانی اچھے لوگ ہوتے ہیں.. کہانیاں یونہی جنم لیتی ہیں۔ اگرچہ کچھ کہانیوں میں انصاف ہوتا ہے اور بیشتر میں ناانصافی کے پرتو ہوتے ہیں۔ سب کہانیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں.. جانے میں نے جوزف کے ساتھ انصاف کیا ہے یا نہیں..

لیکن جس روز وہ ہمیں ٹرین میں ملا تھا' اُس روز وہ بورس نہ تھا.. اُس روز تو وہ اپنے آپ میں مسکراتا کبھی کبھی اونگھ میں اُتر جانے والا ایک بوڑھا فوجی تھا اور اُس کی گود میں رکھے کارنیشن کے پھول جب ذرا کھسکنے لگتے تو وہ چونک کر انہیں سنبھال لیتا اور پھر فخریہ انداز میں ڈبے میں سوار مسافروں کو دیکھنے لگتا اور وہ بھی شاید صرف آج ہی کے دن.. فتح کے دن.. 9 مئی 1907ء کو جواب میں اُسے مسکراہٹوں سے نوازتے..

بورس نے تو کئی روز بعد ماسکو یونیورسٹی کی اردو کی طالبہ تانیا کے سوال کے جواب میں جنم لیا تھا..

کسی ایک اور پیچیدہ نام کے سٹیشن میں داخل ہو کر ٹرین آہستہ ہونے لگی رُکی اور وہ ہماری جانب جھکتا ہوا وہاں اُترنے والے مسافروں کے ریلے میں بہتا ڈبے سے نکل گیا۔ کیا وہ واقعی بورس تھا؟

اور کیا واقعی آج اُس کا آخری فتح کا دن تھا اور اُس نے آج شب مر جانا تھا..

وہ بوڑھا فوجی جو کہ ایک حقیقت تھا' اُس دنیا سے نکل کر تصور اور خیال کی ایک ایسی دنیا میں چلا گیا ہے کہ میں لاکھ کوشش کروں.. اُس کی تصویر سامنے رکھ کر اپنے آپ کو یقین دلاؤں کہ دیکھو یہ ایک حقیقت ہے تصور نہیں اور پھر بھی وہ اُس دنیا سے واپس نہیں آتا.. بورس ہی رہتا ہے..

کیا یہ ممکن ہے کہ دراصل وہ بورس ہی تھا جسے میں نے ایک بوڑھا فوجی تصور کیا.. یا اُس بوڑھے فوجی کو میں نے زبردستی ایک ایسا روپ دیا جو اُس کا نہ تھا.. ہو سکتا ہے وہ ایک آرام دہ فلیٹ میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ رہتا ہو اور وہ نئے نظام میں بہت متمول ہو چکے ہوں اور مہنگی سپورٹس کاروں میں گھومتے ہوں اور اُسے بھی گھماتے ہوں اور وہ آج کے ماسکو کو پسند کرتے ہوئے کہتا ہو کہ.. ہماری نسل نے تو مجبوراً کیمونزم کا عذاب سہا تھا.. سرخ پرچم پر نقش وہ درانتی اور ہتھوڑا تو وہ ایسے بچھو تھے جنہیں کچل دینا ہی بہتر تھا اور یہ نیا پرچم کیسا دلنشیں ہے.. میں لینن گراڈ میں اُس طرح لینن کی خاطر تو نہیں لڑا تھا' سینٹ پیٹر کے شہر سینٹ پیٹرز برگ کے لیے اپنی جان کو داؤ پر لگایا تھا تا کہ مجھ پر اُن کی رحمتوں کا نزول ہو۔ تم کیسے نصیب والے ہو کہ اس نئے نظام میں آزادی اور فراوانی کے سانس لیتے ہو.. بس یہ کرو کہ اُس منحوس مردے کو.. جو کریملن کی دیوار کے سائے میں حنوط پڑا ہے' اُس سے تو چھٹکارا حاصل کرو.. جب تک ہم اُس مردے کو زمین میں دفن نہیں کر دیتے سینٹ باسل کے خصوصی فرشتے رحمت کے ہم پر نازل نہیں ہوں گے۔

ایسا ہو سکتا ہے.. کہانی کا ایک رُخ یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے..

اور یہیں پر ایک تخلیق کار کو ایک برتری حاصل ہوتی ہے کہ یہ اُس کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ ایک کہانی کو کون سا رُخ دیتا ہے.. اور اس رُخ میں اُس کا ذاتی تعصب.. نظریاتی جھکاؤ اور زندگی کا تجربہ شامل ہوتا ہے..

وہ بورس ہی تھا اور اُس نے آج شب مر جانا تھا..

ہم تینوں.. میں' میمونہ اور آنیا سرخ چوک کی قربت میں واقع کسی سٹیشن پر گیت گاتے' ترانے الاپتے.. ''رشیا۔ رشیا'' کا شور مچاتے ہجوم کے سیلاب میں بہتے پلیٹ فارم پر اُتر گئے اور پھر یوں محسوس ہوا کہ ہر جانب یاجوج ماجوج کے گھنے لشکر چلے آتے ہیں.. زیرِ زمین طویل راہداریاں تھیں جن میں لوگ ٹین بند مچھلیوں کی مانند آپس میں جڑے ہوئے تھے' مچھلیاں تو ساکت رہتی

تھیں لیکن یہ پھر بھی حرکت کر رہے تھے.. اور ان طویل راہداریوں کے اختتام پر کوئی زینہ ہے جو اوپر اُٹھتا چلا جا رہا ہے..

مونا یہاں بھی جھجکی اور گرتے گرتے بچی..

اُس نے تو کیا میں نے بھی پوری زندگی میں کہیں اتنے بڑے اور متحرک ہجوم نہ دیکھے تھے.. ایسے ہجوم ایک عفریت کا مزاج رکھتے ہیں جو کسی کو بھی نگل سکتا ہے.. آپ کو خدشہ ہوتا ہے کہ آپ ابھی دھکم پیل سے گر جائیں گے' کچلے جائیں گے اور روندے جائیں گے اور باہر کی دنیا میں خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ دو پاکستانی آخر گئے کہاں..

آنیا ہمیں بار بار یقین دلا رہی ہے.. ڈھارس بندھا رہی ہے کہ یہ معمول نہیں ہے.. زیرِ زمین ریلوے کی راہداریوں میں اتنا اژدہام نہیں ہوتا.. آج کے دن چونکہ کوئی بھی اپنے گھر میں نہیں رہتا تو یہ ماسکو کی کل آبادی ہے جو سرخ چوک کی جانب گامزن ہے' اس لیے.. لیکن مونا کی تسلی نہ ہوتی تھی.. اُس کے چہرے پر ایک بچے کا خوف تھا' گھبراہٹ اور سراسیمگی تھی اور اتنی تھی کہ نہ صرف اُس نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا بلکہ مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ.. اب کے بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں.. اور میں عرض کر چکا ہوں کہ مونا.. یوں کھلے عام تو کیا ذاتی بیڈ روم میں بھی میرا ہاتھ تھامنے سے شدید گریز کرتی ہے..

مجھ میں اس ہجوم میں ایک تنہائی اور خوف کا ایک اور سبب بھی تھا..

میں نے پچھلے دو برس کے گرما کے موسم امریکہ اور کینیڈا میں بسر کیے جہاں آس پاس خالص امریکیوں اور کینیڈین کے علاوہ سب قومیں آس پاس ہوتی تھیں۔ اطالوی' ہسپانوی' چینی' ہندوستانی' پاکستانی' سری لنکن وغیرہ.. اور اُن کے درمیان حرکت کرتے ہوئے آپ اُس ملک میں اجنبی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ کہیں کہیں جب کوئی اکا دکا گورا ہوتا تھا تو وہ خود اجنبی محسوس کرتا تھا۔ جب کہ یہاں.. اور میرے پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ ہزاروں نہیں لاکھوں تک پہنچتے جمِ غفیر میں ہم دونوں کی رنگت اور چہرے جدا تھے.. اور آس پاس خالص روسیوں کا سیلاب بہتا تھا..

ہم روسیوں کی بے رنگی کے سمندر میں بے اختیار گندمی رنگ کے دو خوشے تھے..

بھوری' نیلی اور بے رنگ آنکھوں کے درمیان میں چار سیاہ تتلیاں تھے..

اور یہ تتلیاں پر پھڑ پھڑاتی اپنے آپ کو اس سمندر میں ڈوب جانے سے بچانے کی سعی کرتی تھیں.. ہم بالآخر طویل مسافتیں طے کر کے.. راہداریوں میں چلتے.. زینوں پر چڑھتے باہر کھلی

فضا میں آ گئے.. ماسکو کی سفید رات میں آ نکلے تو مونا نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا "اللہ تیرا شکر ہے.." اور پھر میرا ہاتھ جھٹک دیا.. جیسے ہم کسی قبر میں سے نکل کر باہر آ گئے ہوں..

باہر آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوچہ و بازار ویران پڑے ہیں۔ شاہراہوں پر ٹریفک کا نام و نشان نہیں البتہ فٹ پاتھوں پر لوگ چل پھر رہے ہیں.. آج کے دن سرخ چوک میں داخل ہونے والی جتنی شاہراہیں ہیں وہ ٹریفک کے لیے ممنوع قرار پا چکی تھیں.. یہاں تک کہ ٹریفک سگنل بھی بجھے ہوئے تھے.. ذرا آگے گئے تو ایک رکاوٹ تھی.. روسی پولیس کے جوان نہایت تحمل سے پُر جوش گیت گانے والوں کو اطلاع کر رہے تھے کہ آپ آگے نہیں جا سکتے.. سرخ چوک ہجوم سے لبریز ہو چکا ہے اور اس میں کسی ایک فرد کی بھی گنجائش نہیں اس لیے آپ آگے نہیں جا سکتے.. جا ہی نہیں سکتے..

آنیا نے اپنی والدہ کی سحر انگیز مسکراہٹ بروئے کار لا کر چند راستہ روکنے والے باوردی اہلکاروں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ براہ کرم ان دو پاکستانیوں کو تو اندر جانے کی اجازت دیجیے یہ بہت دور سے ہمارے جشن میں شامل ہونے کے لیے آئے ہیں پر اُن پر اُس کی مسکراہٹ کی دال نہ گلی اور وہ انکار میں سر ہلاتے رہے..

"مستنصر.." آنیا نے اپنا چاند چہرہ جھٹک کر کہا "ہم آگے نہیں جا سکتے۔"

"تو اب ہم کہاں جائیں؟"

"میرا خیال ہے کہ بہتر یہی ہے کہ آپ ہوٹل واپس چلے جائیں.. آرام کریں اور میں رات کو آپ کو لینے کے لیے آ جاؤں گی تا کہ آپ سرخ چوک میں ہونے والی آتش بازی کے بے مثال مظاہرے سے لطف اندوز ہو سکیں.."

سچی بات ہے ہم دونوں بھی خاصے پژمردہ ہو چکے تھے.. سویرے سے نکلے ہوئے تھے.. اور اتنے تھکے ہوئے تھے کہ اگر آنیا کہتی کہ آیئے اُدھر سرخ چوک میں لینن اپنے مقبرے سے باہر نکل کر صرف اس آس میں کھڑا ہے کہ آپ سے ہاتھ ملائے اور آٹوگراف حاصل کرے.. تب بھی ہم ہرگز مائل نہ ہوتے۔ ہم اتنے پژمردہ اور بجھ چکے تھے..

چنانچہ ہم نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اب ہمیں مزید نہیں چلنا ہوگا.. ہوٹل چلنا ہوگا.. ہم اب بخوشی زیرِ زمین ریلوے کے پاتال تک اُترتے بھیڑوں میں اُترے اور بالآخر ہوٹل آرس کانگرس کی آٹھویں منزل پر پہنچ کر اپنی وسیع سویٹ کے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ اس ڈھیر شدہ

حالت میں ہم دونوں باتیں کرنے لگے کہ اُس لمبے بدن میں تھکاوٹ کے علاوہ ایک اجنبی سرزمین پر پہلے دن کا ہیجان بھی شامل تھا۔ ’’جی بیگم صاحبہ.. ماسکو کیسا تھا اور ماسکو والے کیسے تھے؟‘‘

میمونہ کا غیر ملکی تجربہ جدہ، دوہا، فلوریڈا اور نیو یارک تک محدود ہے۔ جدہ یا دوہا کو تو وہ اس لائق نہیں گردانتی کہ اُن کا کسی ثقافتی یا تاریخی اہمیت کے شہر کے ساتھ موازنہ کرے البتہ امریکہ میں متعدد بار خاصے طویل قیام کے دوران وہ اُس معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں سے کسی حد تک آگاہ تھی۔ ’’روسی امریکیوں کی نسبت مجھے بہت ستھرے نظر آئے.. اُن کے مقابلے میں خوش لباس بھی دکھائی دیتے ہیں.. لڑکیاں بھی پیاری لگی ہیں اور جس طرح تم اُنہیں دیکھ رہے تھے لگتا تھا تمہیں بھی لگی ہیں۔ یہ لوگ امریکیوں کی مانند ٹرین میں سفر کرتے ہوئے منہ میں گھگھنیاں ڈالے نہیں بیٹھے رہتے.. بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت اپنائیت سے باتیں کرتے رہتے ہیں.. اور وہ جو ایک مخمور شخص گنگناتا ہوا آنیا کے پاس آیا تھا اور اُس سے جانے کیا پوچھ رہا تھا تو آنیا نے بالکل برا نہیں مانا اور مسکراتی ہوئی اُسے کچھ بتاتی رہی.. اور میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اُس شخص نے قطعی طور پر کوئی بدتمیزی نہیں کی اور جو پوچھنا تھا پوچھ کر گنگناتا ہوا چلا گیا۔ میں نے آنیا سے جب یہ پوچھا کہ کیا وہ ڈرنک تھا تو اُس نے خوش ہو کر کہا کہ ہاں.. وہ مزے میں تھا اور ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔‘‘

’’اس کے علاوہ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟‘‘

’’ذرا اپنے آپ میں رہنے والے چُپ سے لوگ ہیں۔ شور و غل نہیں کرتے اور مددگار بھی ہیں۔ جب میں پہلی بار خود کار زینے سے لڑکھنے لگی تو کتنے لوگوں نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا تھا اور پھر روسی میں میرا حال پوچھتے رہے تھے.. اور ہر کوئی میری شلوار قمیض اور شال کی توصیف کرتا ہے.. ایک بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو تو میں نے کہا کہ پاکستان سے تو وہ خوش ہو کہنے لگا ’’راولپنڈی۔ راولپنڈی‘‘ میں نے کہا کہ نہیں ہم تو لاہور کے ہیں تو وہ پھر کہنے لگا ’’راولپنڈی۔ راولپنڈی‘‘.. شاید وہ پاکستان کے صرف اسی شہر سے واقف تھا.. ویسے تم اپنے آپ کو قابو میں رکھا کرو.. پچاس سال پیشتر تم ٹین ایجر تھے تو خیر تھی لیکن اب اس عمر میں تم مڑ مڑ کر دیکھتے اچھے لگتے ہو؟‘‘

میں قدرے متحیر ہوا کہ میں نے اس معاملے میں اپنے تئیں خاصی احتیاط برتی تھی..

’’بیگم تمہیں معلوم ہے کہ گارسیا مارکیز کا کہنا ہے کہ جب کبھی وہ کسی محفل میں جاتا ہے اور اگر وہ وہاں کسی عورت کے حسن سے مسحور ہو جاتا ہے تو اُس کی بیوی جو اُس کی اس خصلت سے خوب واقف

ہے اُسے کہتی ہے کہ گارسیا وہ تم پر اثر کر چکی ہو.. تم بے شک جاؤ اور اُس عورت کے ساتھ تھوڑا سا فلرٹ کر لو مجھے کوئی اعتراض نہیں.. مونا وہ گارسیا کو اس لیے اجازت دیتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس نوعیت کے تجربے اُس کے خاوند کے لیے تخلیق کی تحریک کا باعث بنتے ہیں..‘‘

’’نہ تو تم گارسیا مارکیز ہو اور نہ ہی میں اُس قسم کی بیوی ہوں جو خاوند کو چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دے.. اور یہ تخلیق کی تحریک کے سارے فلسفے محض ایک ڈھونگ ہیں جو تم لوگوں نے رچا رکھے ہیں اور ان میں گارسیا بھی شامل ہے.. کیا خیال ہے اب ذرا ستا نہ لیں اپنی ہڈیوں کو تھوڑا سا آرام دے لیں کیونکہ شام سات بجے وہ آنیا پھر سے نازل ہو جائے گی کہ چلو چلو سرخ چوک میں آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے چلو..‘‘

مجھے قلق تو بہت ہوا کہ چلو میں گارسیا مارکیز کا ہم پلہ نہ سہی لیکن مونا اُس کی بیوی جیسی ہو جاتی تو کیا قباحت تھی..

میں نے اپنی کمر سیدھی کرتے ہوئے نوٹ کیا کہ شیمپئن کی بوتل کے گرد بالٹی میں جو برف تھی وہ کب کی پگھل چکی تھی..

پورے سات بجے آنیا نازل نہ ہوئی اُس کی بڑی بہن ساشا چھم چھم کرتی چلی آئی..

ساشا آنیا کی مانند دراز قامت نہ تھی ٹوٹے سے قد کی تھی اور بھری بھری لڑکی تھی اور اپنی ماں اُکسانہ سے اتنی مشابہت رکھتی تھی کہ پہلی نظر میں مجھے یہی شائبہ ہوا کہ اُکسانہ چلی آ رہی ہے..

جہاں آنیا اپنے باپ ذخاروف کی تصویر تھی وہاں الگزانڈرا.. یعنی ساشا اپنی ماں کی جادو بھری مسکراہٹ کی امین تھی..

ساشا کی انگریزی بھی مناسب سے ذرا بہتر تھی اور اُس سے گفتگو کے دوران زیادہ دقت نہ ہوتی تھی.. ذخاروف نے درست کہا تھا کہ اُس کی بیٹیاں اُس کی بہترین پروڈکشن ہیں..

ہم تینوں ہوٹل آرس کا گرس سے نکلے اور مارو مار کرتے ایک مرتبہ پھر صرف دو گھنٹے میں سرخ چوک کی قربت میں ایک زیر زمین ریلوے سٹیشن میں سے برآمد ہو گئے..

صورت حال جوں کی توں تھی..

سرخ چوک میں داخل ہونے والے راستے پر باقاعدہ مورچے قائم تھے.. ناکہ بندی ہو چکی تھی.. کسی ایک فرد کو آگے جانے کی اجازت نہ تھی کہ.. وہی بات وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

آپ کے پاس اس کے سوا اور کوئی متبادل نہ تھا کہ آپ سرخ چوک کے نواح میں جتنی بھی شاہراہیں تھیں اور وہ سب کی سب آج کے دن تہی دامن تھیں اُن پر ایک سائیکل چلانا بھی ممنوع تھا تو آپ وہاں ہلا گلا کر لیجیے.. جو پینا ہے پیجئے جو گانا ہے گایئے اور جو بھی پر مسرت حرکت کرنی ہے کر گزریئے.. آتش بازی سرخ چوک کے پتھریلے فرش پر تو نہیں ہوگی اوپر آسمان پر ہوگی جو یہاں سے بھی دکھائی دے رہا ہے..

ویسے بھی شاید ہم تینوں کے سوا وہاں جتنے بھی تھے اور جس عمر کے بھی تھے اُن کے اندر بدن میں واڈکا کے گل رنگ انار چھوٹ رہے تھے.. پھل جھڑیاں روشن ہو رہی تھیں تو وہ کم از کم آتش بازی کے معاملے میں خود کفیل ہو چکے تھے..

بے خود اور زندگی کی پر مسرت آبشار میں بھیگتا ہجوم گیت الاپ رہا تھا اور اُس لمحے کا منتظر تھا جب سرخ چوک پر جھکے آسمان پر شرارے پھوٹنے لگیں گے اور آگ کے صد رنگ کھیل کا آغاز ہوگا.. اور تب موازنہ ہو جائے گا کہ بدن کے اندر جو آتش بازی کے بھڑکیلے دہکتے جگنو ہیں اور سرخ چوک کے آسمان پر جو خوش رنگ چنگاریاں لو دیتی ہیں ان میں سے کون ہے جو زیادہ منور ہے..

ہم تینوں بھی وقت گزاری کی خاطر تورسکایا سٹریٹ پر چہل قدمی کرنے لگے..

اگرچہ وہ دونوں مونا اور ساشا تو تورسکایا سٹریٹ پر چہل قدمی کرتی تھیں، پر میں گورکی سٹریٹ کے پتھروں پر چلتا تھا.. میرے پاس اُن وقت میں دفن ہو چکے زمانوں کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر کبھی تھی جس کے پس منظر میں یہی سرخ چوک تھا اور فٹ پاتھ پر ناخوش دکھتے، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس لوگ میرے کیمرے کو گھورتے تھے اور تب یہ گورکی سٹریٹ ہوا کرتی تھی.. چند روز بعد جب میں نے اپنے لیکچر "ماسکو پچاس برس پیشتر اور اب" کے دوران اس کا تذکرہ کیا تو نوجوان طلب کے لیے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی..

"آپ کھانا کہاں سے کھائیں گے اور کیا کھائیں گے؟" ساشا نے پوچھا..

"ایسی کچھ بھوک تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ نے بہر طور شام کا کھانا تو کھانا ہے تو کہاں کھانا پسند کریں گے۔"

تو ہم نے ایک میکسیکن ریستوران کا چناؤ کیا، اس آس میں کہ وہاں شاید چاول ہوں.. مرچیں اور پاپڑ ہوں اور وہاں یہ سب کچھ تھا.. بل فائٹنگ کے پوسٹر تھے.. میکسیکو کے سامبریرو بڑے بڑے چھجے دار ہیٹ تھے.. سیاہ آنکھوں والی قاتل حسیناؤں کی تصویریں تھیں لیکن وہاں جو

موسیقی تھی وہ امریکی تھی.. کوئی ایک گمنام میوزیکل گروپ تھا جو امریکہ میں کسی شراب خانے میں کنٹری میوزک بجاتے بجاتے اپنی انگلیاں زخمی کرنے کے باوجود کسی مقام پر نہ پہنچا تھا تو وہ گرتا پڑتا ماسکو پہنچ گیا تھا.. اور گروپ کے ارکان گلا پھاڑ پھاڑ کر بے سُرے ہو رہے تھے اور عوام الناس جھوم رہے تھے..

کچھ دیر بعد باہر شاہراہ پر ایک شور سے بپا ہوا، کچھ دھماکے سنائی دیئے اور ریستوران کے نیم تاریک ماحول میں کچھ روشنی سی ہوئی..

ساشا جس نے کھانے سے مکمل اجتناب کیا تھا اور صرف سلاد پر گزر اوقات کر رہی تھی اُس نے ایک پتہ چباتے ہوئے کہا "آتش بازی کا آغاز ہو گیا ہے.. آپ باہر جا کر گلی میں تماشہ دیکھیں، میں یہاں بیٹھتی ہوں۔"

تو ہم دونوں باہر گورکی سٹریٹ میں آ گئے..

سرخ چوک کے عین اوپر آتش بازی کے خفیف دھماکے ہو رہے تھے اور اُن میں سے صد رنگ انار اور طرح طرح کی رنگین روشنیاں آسمان کو اپنے رنگ میں روشن کرتی تھیں اور لوگ دیوانے ہوئے جاتے تھے.. اگرچہ وہ پہلے سے دیوانے ہو چکے تھے لیکن ان شراروں کی بھڑک نے اُنہیں مزید دیوانہ کر دیا تھا..

آج بھی جشن کی رات تھی..

آج بھی کراسنایا پلوشت.. یعنی سرخ چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی..

گزر چکے کل اور آج میں صرف پچاس برس کا فرق تھا..

تب سرخ چوک میں میرے پہلو میں تین نقاب پوش لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک "فاختہ" تھی..

اور آج میرے پہلو میں اگرچہ وہ گارسیا کی بیوی کی طرح نہ ہو سکی تھی، میمونہ کھڑی تھی..

یہ وہ ماسکو نہ تھا جو میں نے نصف صدی پیشتر دیکھا تھا..

یہ کوئی اور شہر تھا..

وہ بھی کیا دن تھے جب میں یہاں آیا تو تو ہر درخت سرسبز لگتا تھا اور ہر بطخ راج ہنس دکھائی دیتی تھی.. اور یہ بھی کیا دن تھے کہ جس شہر میں ایک گمنام پاکستانی.. ایک کچے ٹین ایجر کے طور پر آیا تھا تو وہاں اُسی شہر میں آج مجھے ایک ادیب کی حیثیت سے یہ اعزاز دیا گیا تھا.. مجھے خصوصی

طور پر دعوت دی گئی تھی کہ میں دنیا کی ایک اہم ترین یونیورسٹی میں خصوصی لیکچر دوں..

تو یہ دن بھی کچھ ایسے برے نہ تھے..

آپ اُس کی کن کن نعمتوں کا شکر نہ ادا کریں گے.. کہ وہ مجھے ذلت بھی دے سکتا تھا پر اُس نے مجھے عزت عطا کی..

تو آج پھر جشن کی رات تھی..

اور وہ ہجوم جو سرخ چوک کے عین اوپر آتش بازی کے بھڑکنے اور آنکھوں میں چکاچوند بھرنے والے مظاہرے کو دیکھ کر دیوانہ ہوا جاتا تھا تو اُن میں سے کوئی ایک فرد بھی نہ جانتا تھا اور نہ ہی گمان کر سکتا تھا کہ اُن کے درمیان کھڑا ایک ادھیڑ عمر شخص آج سے پورے پچاس برس پیشتر بھی یہاں آیا تھا اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سے نکلنے والے نوخیزی کے شرارے سرخ چوک کے آسمان پر روشن ہونے والے شراروں کو روشنی دیتے تھے.. اور اب آیا ہے تو بے شک ساری شب یہ سلسلۂ آتش بھڑکتا رہے اُس کی بجھتی ہوئی اُنہی آنکھوں میں کوئی ایک چنگاری بھی نہ بھڑکے گی..

آج پھر جشن کی رات تھی..

اور جب سرخ چوک کے آسمان پر آتش بازی کے آخری شرارے بھڑک کر بجھے اور وہ جن کی نظریں آسمان پر تھیں کیسے جان گئے کہ یہ آخری شرارے ہیں.. ایسے جان گئے کہ وہ تادیر دیکھتے رہے اور وہ آسمان خالی رہا.. اور تاریکی میں جانے لگا.. ہجوم ہولے ہولے منتشر ہونے لگا..

ہم دونوں ریستوران میں واپس آئے.. جہاں ساشا نہایت خوش اسلوبی سے ہمارے اُس کھانے پر پہرا دے رہی تھی جسے ہم آتش بازی کے شوق میں ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تھے..

اور جب ہم ہوٹل واپس جانے کے لیے زیر زمین ریلوے کے سٹیشن کی جانب مُڑ سکایا سٹریٹ میں منتشر ہجوم کے ہمراہ اور اُن کے خمار سے ذرا متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے تو میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر مجھے یقین نہ آ سکا..

چوڑے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ جو ایک پتھریلی پرشکوہ عمارت چلی جا رہی تھی جس میں بین الاقوامی فیشن گھروں کے سٹور تھے.. زیورات اور آرائش کی مہنگی دکانیں تھیں اور اُن کے شوکیس روشن اور حیرت انگیز تھے تو اس عمارت میں کہیں کہیں پتھر میں سے اُبھرتے روسی شاعروں یا موسیقاروں کے چہرے تھے.. ہر مجسمے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں اُسے پہچاننے کی کوشش

کرتا لیکن کوئی بھی میری پہچان میں نہ آیا.. ساشا مجھے نامانوس سے نام بتاتی رہی.. چند قدم چلا ہوں تو ایک ایسا چہرہ پتھر میں سے اُبھرتا دکھائی دیا جسے میں خوب پہچانتا تھا.. تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص رہا ہو جس کے مجسمے اتنی بڑی تعداد میں تراشے یا ڈھالے گئے ہوں.. یہ ولادی میر لینن کا چہرہ تھا.. بے یقینی اور غیر متوقع حیرت کا سبب صرف اس مجسمے کا لینن ہونا نہیں تھا بلکہ سرخ کارنیشن کے وہ دو پھول تھے جو اُس کے پہلو میں رکھے ہوئے تھے..

ایک متروک خدا کے حضور کسی نے محبت کے چند پھول رکھ دیے تھے..

وہ کون ہو سکتا تھا..

اُس نے یہ پھول چپکے سے رکھے ہوں گے ذرا پوشیدہ ہو کر.. کہ لوگوں کے چہروں پر طنزیہ مسکراہٹیں نہ تیریں کہ دیکھو یہ شخص ایک متروک خدا کا پرستار ہے..

شاید دوسری جنگ عظیم میں ایک سرخ پرچم تلے بے جگری سے لڑنے والا کوئی بوڑھا سپاہی ہو.. یا کوئی ایسا عمر رسیدہ مزدور جسے اُس نظام کے تحت عزت نفس حاصل تھی اور اب اُسے کوئی نہ پوچھتا تھا..

کوئی ایسا لاچار بوڑھا بھی تو ہو سکتا تھا جسے اب پنشن ملنی بند ہو گئی تھی اور وہ مانگ تانگ کر گزر اوقات کرتا تھا اور آج اُسے جشن کی وجہ سے کچھ زیادہ بھیک مل گئی ہو اور اُس نے اپنے ماضی کے محسن لینن کے لیے چند پھول خرید لیے ہوں..

میں اُس ایک گمنام شخص کے بارے میں ایک کہانی بُن سکتا ہوں جس نے آج کے دن لینن کو یاد رکھا.. یہ ماسکو میں میرا پہلا دن تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ روز بعد جھیل بیکال سے آنے والی تانیا کے کہنے پر میں اسی شخص کے بارے میں ایک کہانی کی بُنت کروں گا..

یقیناً وہ شخص.. ہمارے برابر میں بیٹھا ہوا بوڑھا فوجی ہی تھا جس نے کل سویرے مر جانا تھا..

وہ بورس ہی تھا جو اس مجسمے کے تلے سرخ کارنیشن رکھ کر گیا تھا.. اور ابھی ابھی گیا تھا..

بس یونہی کہانیاں جنم لیتی ہیں.. خاص طور پر جن کا انجام المناک ہو..

دسواں باب

''جھیل بیکال کی تانیا اور دوستووسکی کا ''مقتل''

خوراک ہم مسلمانوں کے لیے نہایت ہی نازک اور تشویش ناک مسئلہ رہا ہے..

اگر دیارِ غیر میں ہیں تو کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں اور اگر کھائیں تو کیا اُس جانور کا گلا شرعی طور پر کاٹا گیا تھا یا بس جھٹکایا گیا تھا..اور پھر اسے جس چربی میں بنایا گیا تھا اُس میں اکڑی ہوئی گردن والے کسی مختصر دُم اور تھوتھنی والے جانور کی چربی کی آمیزش تو نہ تھی..

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن پچیس تیس برس پیشتر یہ کوئی ایسا خاص مسئلہ نہ ہوا کرتا تھا..لوگ باگ یورپ میں اور امریکہ میں جو میسر آتا تھا' کھاپی جایا کرتے تھے..اور وہ جو قدرے متشرع حضرات ہوا کرتے تھے وہ بھی بس اتنا دھیان کرتے تھے کہ اُن کی خوراک میں کوئی سرخ قسم کا گوشت نہ ہو..لیکن ان دنوں تو یہ باقاعدہ ایمان کا امتحان ہو چلا ہے..

چین کے دورے کے دوران پہلے دن کے پہلے طعام پر بیٹھتے ہوئے سب ادیبوں نے اپنے اردو مترجم سے میز پر سجی درجنوں خوراکوں کے بارے میں استفسار کیا تھا کہ..کیا یہ حلال ہیں..

تو اُس نے عینک سنبھالتے ہوئے تسلی دی تھی..فکر نہ کریں یہ مُسلم فوڈ ہے..

دو تین روز کے کھانے پینے کے بعد ایک بارلیش شاعر کو کچھ شک سا ہوا تو اُس نے پوچھا..

خاور یہ مُسلم فوڈ ہے تو کیا یہ حلال ہے..

تو اُس نے پھر اپنی عینک درست کی..مجھے یہ پتہ نہیں..لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ مُسلم فوڈ ہے..

اور مُسلم فوڈ سے تمہاری کیا مراد ہے؟

اس میں سؤر کا گوشت نہیں ہے..

یوں تو چین کے دورے کے دوران ایک ادیب نے چٹخارے لیتے ہوئے روسٹ گدھا بھی کھایا تھا اور ایک اور حضرت سرخ گوشت کے قتلوں والا پلاؤ بھی بے دھڑک کھا گئے تھے..اور میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں نے شنگھائی میں فرائی شدہ نہایت نمکین اور ذائقے دار ریشم کے کیڑے بھی کھائے تھے..اور حلال جان کر کھائے تھے کیونکہ اگر نڈیاں باقاعدہ شرعی طور پر حلال ہیں تو یہ تو پھر بھی ریشم کے کیڑے تھے..

میرا ابوا برخوردار سلجوق جب نیویارک میں کولمبیا یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا تو سبزی یا مچھلی نہ میسر ہوتی تو فاقہ کر لیتا اور جب کہ اُس کے والد صاحب چکن وغیرہ سے پرہیز نہ کرتے..

اُدھر فلوریڈا میں عینی کے پاس ایک ہدایت نامہ تھا جس میں درج تھا کہ کون سی ڈبل روٹیوں..چاکلیٹوں یا ٹوتھ پیسٹوں کے اجزاء میں کچھ ملاوٹ ہو سکتی ہے اور وہ اُسے سامنے رکھ کر خریداری کرتی..اگرچہ فلوریڈا کے ہی ایک عالمِ دین نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر سٹیک کھانے کو جی چاہے تو بے دھڑک کھا لیجیے..بس اتنا کیجیے کہ اُس پر اپنی چھری رکھ کر بسم اللہ پڑھ لیجیے تو وہ آپ پر حلال ہو جائے گی..یعنی علمائے دین میں بھی بے حد مفید ورائٹی پائی جاتی ہے..

چنانچہ روس میں بھی جب کبھی پیٹ پوجا کے لیے بیٹھتے تو یہی تشویش شروع ہو جاتی کہ یہ کیا ہے..اور جو بھی ہے کیا حلال ہے..

مونا کی طبیعت میں بھی عجیب ست رنگی سی تھی..امریکہ میں نہایت اطمینان سے جو ملتا صبر شکر کر کے کھا لیتی اور روس میں جو بھی خوراک دیکھتی تھی' یہ تو حلال نہیں لگتی..میں پوچھتا کہ امریکہ میں تو تم نے کبھی اتنی میم میخ نہیں نکالی تھی..فرمائش کر کے ''چیز کیک فیکٹری'' کا اورنج چکن کھانے جاتی تھیں تو یہاں کیا ہوا ہے تو وہ ناک سکیڑ کر کہتی' پتہ نہیں پر وہاں حلال لگتا تھا' یہاں نہیں لگتا..یقیناً وہ پاکستان کی امریکہ نواز اور روس دشمن پالیسیوں کا اثر قبول کر چکی تھی..

ویسے میں ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے عرض کروں گا روسی خوراک میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ہمیں کڑوی اور قدرے حرام سی لگتی تھی..شاید اُس کے اجزا ایسے تھے یا ایک عرصہ تک بے دین رہنے سے وہ ایسی ہو گئی تھی..

جو پہلی سویر تھی تب ہم آٹھویں منزل پر سے اپنے عرش بریں سے اتر کر نشیب میں واقع فرش پر آئے..ڈائننگ ایریا میں آئے تو یہی مسئلہ درپیش ہو گیا..مونا کی تسلی نہ ہو رہی تھی یہاں تک کہ وہ اُبلے ہوئے انڈوں کے بارے میں بھی قدرے تشویش میں تھی کہ مجھے تو یہ

انڈے بھی حلال نہیں لگتے.. میں تو پھل فروٹ کے ساتھ ہی گزارہ کروں گی اللہ کرے یہ حلال
ہوں.. میں نے البتہ فرائی انڈوں کا رسک لے لیا لیکن ان کے ہمراہ آلو کے جو قتلے تھے وہ مجھے
بھی مخدوش نظر آنے لگے.. چائے سُر کتے ہوئے بھی ہم ذرا بے آرام سے ہوئے.. میں نے
نوٹ کیا کہ ہوٹل کا عملہ اگرچہ نہایت چاک و چوبند' ستھرا اور مستعد تھا مگر اُن کی شخصیت میں
کمیونزم کی تنظیم اتنی رس بس چکی تھی کہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے ہر کام ایک فرض کے طور پر
سرانجام دیتے لیکن اُن کے چہرے مسکراہٹ سے عاری ہوتے اور وہ ہوٹل کے مکینوں کے ساتھ
زیادہ خوشگوار ہونا مناسب نہ جانتے..

میں نے ناشتے کے آغاز میں اپنے پسندیدہ گریپ فروٹ جوس کے متعدد گلاس پیے اور
نہایت فرحت بخش محسوس کرنے لگا..

پورے دس بجے ایک گول چاند چہرے والی تانیا مسکراتی ہوئی نازل ہوگئی..

یہ آنیا برگیڈ کی ایک رنگروٹ تھی..

آنیا نے ہماری آمد سے بہت پہلے ماسکو یونیورسٹی کی شعبۂ اردو کی طالبان کی ایک
اعزازی برگیڈ تیار کرلی تھی اور ان کا فرض منصبی یہ تھا کہ ان میں کوئی ایک یا دو اور بعض اوقات تین
رنگروٹیاں پورے دس یا گیارہ بجے مارچ کرتی ہوئی ہوٹل میں نازل ہوجاتیں اور ان کے ہاتھوں
میں ہمارے آج کے دن کا مکمل شیڈول ہوتا کہ "معزز پاکستانی مہمان اور اس کی بیگم کو آج ماسکو
میں کہاں کہاں لے جانا ہے اور کیا کیا دکھانا ہے... جہاں نہ جانا چاہے وہاں بھی لے جانا ہے اور جو
نہ دیکھنا چاہیں وہ بھی دکھانا ہے کیونکہ شیڈول میں درج ہے...

اور یہ جو آنیا برگیڈ کی رنگروٹ تانیا تھی' ایک چھکتی لمبی سی ٹہنی لڑکی تھی... نہایت ہونہار اور
متجسس... اس کی آنکھیں باتیں کرتی تھیں' سوال پوچھتی تھیں... وہ دنیا' پاکستان اور اردو کے
بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی...

اور ہاں آنیا میری وزیر خزانہ بھی تھی... تمام تر مالی معاملات اس کے قبضۂ قدرت میں
تھے یعنی جہاں کہیں بھی روبل جیب سے باہر آنے ہوتے تھے تو ہماری جیب سے نہیں آنیا کے بیگ
سے باہر آتے تھے... یہ وہی مالی معاونت تھی جو ماسکو یونیورسٹی کی جانب سے ہمیں روسی ثقافت اور
سماج کے مطالعے کے لیے نہایت فراخ دلی سے تفویض کی گئی تھی اور ہم نے آنیا کو اس کا انچارج بنا
دیا تھا... چنانچہ جب وہ خود نہ آتی اور کسی رنگروٹ کو بھیجتی تو اسے خزانے کی کنجی سونپ دیتی... تو آج

یہ کنجی بھی تانیا کے پاس تھی...

اور ہاں یہ وہی چھیل چھبیلی بیکال والی تانیا تھی جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ سر اردو میں والکینو
کو کیا کہتے ہیں... تو میں نے ذرا سوچ کر اسے بتایا کہ والکینو کو اردو میں آتش فشاں کہا جاتا ہے...
اور آتش کے معنی ہیں آگ جو کہ فارسی کا ایک لفظ ہے اور... تو اس نے فوراً اپنا گول چہرہ ہلایا کہ اچھا
تو وہی آتش ہے ناں آتش شوق والی.. تو میں نے اسے ایک بزرگانہ تھپکی دے کر کہا تھا کہ بچی اگر تم
یہ جانتی ہو کہ یہ وہ والی آتش ہے تو یقیناً ترقی کرو گی...

اور آج کا شیڈول کیا تھا... آج پھر... وہی مرنے کا ارادہ تھا...

یعنی جس سرخ چوک میں ہم نہ کل دوپہر داخل ہو سکے تھے اور نہ کل شب... تو پھر وہیں
جانے کا ارادہ تھا کہ ماسکو یاترا کا مقدس آغاز صرف اسی بابرکت مقام سے ہو سکتا ہے...

دنیا میں بہت سے چوک ہیں جنہیں کل دنیا جانتی اور پہچانتی ہے... بلکہ کئی ایسے چوک
ہیں کہ دنیا ان کو جانتی ہے لیکن یہ نہیں جانتی کہ وہ کون سے ملک کے کون سے شہر میں ہیں... اس
فہرست کی طوالت میں کیا جانا... اسے مختصر اور سرسری کر لیں تو اس میں روم کا سینٹ پیٹرز سکوائر...
پیرس کا کنکورڈ... لنڈن کا ٹرافلگر سکوائر... نیویارک کا ٹائمز سکوائر... وینس کا پلازہ سینٹ مارکو... بیجنگ
کا تیان من سکوائر وغیرہ شامل ہوں گے... میں نے جان بوجھ کر اس فہرست میں چاندنی چوک...
چوک نواب صاحب یا ریگل چوک وغیرہ شامل نہیں کیے کیونکہ یہ چوک نہیں "چونک" ہیں...

اور یہ "چونک" کیا ہے...

میرے ایک عزیز از جان دوست فرخ رضوی جو اگرچہ دنیائے بینکنگ پر راج کر چکے
ہیں... اور کر رہے ہیں... یعنی بی سی سی آئی میں اور سنہری بینک میں نہایت اعلیٰ عہدوں پر تعینات
تھے اور اب بھی ہیں لیکن اس کے باوجود چونکہ خالص لاہوریئے ہیں... اندرون شہر کی پیداوار ہیں
اس لیے چوک کو ہمیشہ "چونک" ہی کہتے ہیں...

تو جناب ان سب چوکوں میں جن کے حوالے میں نے دیئے ہیں اگر کوئی چونک ہے تو
سرخ چوک ہے... کہ اس کی پتھریلی اینٹوں نے دنیا کو چونکا دینے والے تاریخی منظر دیکھے ہیں... یہ
پتھر درجنوں بار انسانی خون سے رنگے گئے اور مزید سرخ ہوئے...

سرخ چوک پورے روس کی تاریخی اور ثقافتی حیات کے عروج و زوال کا شاہد ہے...

جہاں آئیون خوفناک کی پرچھائیاں تھیں...

جس کے پتھریلے فرش پر اگرچہ نپولین کا گھوڑا ہنہناتا ہوا چلتا تھا لیکن زیادہ مدت تک نہ چلا اور اسے پسپا ہونا پڑا...

اور اڈولف ہٹلر یہ خواہش دل میں لیے مر گیا... خودکشی کر لی اور جل گیا کہ کوئی ایک روز ہوگا جب میری نازی افواج اس چوک کے پتھروں کو روندتی مارچ کرتی ہوں گی... جیسا کہ انہوں نے نہایت آسانی سے سرنگوں ہو چکے فرانس کے شہر پیرس میں کیا...

تیمور نے کل دنیا فتح کر لی لیکن ماسکو کی حسرت اس کے دل میں ہی رہی...

جہاں کریملن کی دیوار کے سائے میں لینن کا حنوط شدہ بدن ابھی تک نمائش پر ہے...

وہ دیوار جس پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی کیپ لہرا کر دنیا کے مزدوروں کو ایک ہو جانے کو کہا تھا اور زاروں کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرز برگ کو ترک کر کے ماسکو کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا تھا... اور اس سرخ چوک میں کریملن کی جو دیوار ہے اس کے سائے میں سوویت یونین کے عظیم ترین ہیرو دفن ہیں... ان کی یادگاریں ہیں اور اب ان میں جوزف سٹالن کی راکھ بھی شامل ہے... کریملن کی اس دیوار پر کھڑے ہو کر یوم مئی کے موقع پر دنیا جن سے دہلتی تھی کیسے کیسے لیڈران کرام نے سرخ چوک میں مارچ کرنے والی فوج اور تباہ کن ہتھیاروں کو سلام نہیں کیا...

اس دیوار پر کبھی لینن کے ہمراہ ٹروٹسکی بھی کھڑا ہوا تھا... جس نے لینن کے نظریات سے اختلاف کیا تھا' فرار ہو کر جنوبی امریکہ میں پناہ گزین ہوا لیکن... اسے موت سے پناہ نہ ملی اور اسے اس کا تعاقب کرتے ہوئے روسی خفیہ ایجنٹوں نے بالآخر ہلاک کر دیا... آج تک یہ بحث چلی آ رہی ہے اور اس کے حق میں اور مخالف میں ہزاروں دلیلیں دی جا چکی ہیں' سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اگر لینن کی بجائے ٹروٹسکی کے نظریات رائج ہو جاتے تو شاید سوویت یونین کا انقلاب یوں زوال پذیر نہ ہوتا...

کریملن کی اس دیوار پر لینن اور ٹراٹسکی کے ہمراہ ایک دبیز مونچھوں والا نوجوان سٹالن بھی اپنے بھاری کوٹ میں کھڑا نظر آیا کرتا تھا... اور اس کے پہلو میں بیریا ہوا کرتا تھا...

خروشچیف... میکویان اور بلگانن بھی اسی دیوار پر نمودار ہوا کرتے تھے... اور اسے اپنی رسوائی کہوں یا کیا کہوں کہ میں نے ان تینوں کو بہ چشم خود دیکھا ہوا ہے... ان کے بعد برزنوف اور کوسیگن آئے... اور پھر اس کمیونزم کی گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا دینے والے گورباچوف آئے...

گورباچوف کے بارے میں تاریخ کبھی فیصلہ نہیں کر پائے گی کہ کیا وہ ایک ایسا ولن تھا جس نے عظیم سوویت یونین کا شیرازہ بکھیر دیا یا ایک ہیرو تھا جس نے روس کو بچا لیا... اور پھر بورس یلسن آ گیا جس نے تاریخ کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ کوئی فیصلہ کر سکے' اسے اتنا مخمور کر دیا اور خود بھی لڑکھڑاتا ہوا...

اور اب پیوٹن کے دن تھے...

بظاہر مقدس کتابوں پر ماتھا ٹیکتا انہیں بوسے دیتا... پر وہ اپنے کے جی بی کے دن کیسے بھول سکتا تھا' جب وہ امریکہ کو زیر کرنے کی چالیں چلتا تھا... وہ اب بھی ایک چال چلتا تھا' امریکہ سے مفاہمت نہ کر پاتا تھا... اور کل جب ہم سرخ چوک میں داخل نہ ہو سکے تھے کریملن کی دیوار پر کھڑے پیوٹن نے سرخ چوک میں مارچ کرتی روسی سپاہ کی سلامی کے بعد تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ بے شک آج کے دن ہم روسیوں نے نازیوں پر فتح حاصل کی' ان کا غرور خاک میں ملا دیا لیکن نازی ذہنیت اب بھی دنیا میں موجود ہے اور ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتی ہے...

چور کی داڑھی میں تنکے کی صورت امریکی وزارت خارجہ نے احتجاج کیا کہ اشارہ ہماری جانب تھا لیکن روسی وزارت خارجہ نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ اشارہ ہرگز آپ کی جانب نہ تھا... اگرچہ صریحاً تھا...

یہ عین ممکن ہے کہ میں سرخ چوک کی تاریخ میں غوطہ زن ہو کر اس کی ایک میرے نزدیک تاریخی "فضیلت" فراموش کر دوں...

ہم کلیسائے سینٹ باسل کے سامنے کھڑے تصویریں اتروا رہے تھے تو وہاں سے آگے ایک بے نام سا چبوترہ میرے مشاہدے میں آ گیا... مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ میرا گمان یہی تھا کہ سرخ چوک کے آس پاس تو تاریخی عمارتوں کی فصیلیں ہیں لیکن اس کے اندر کوئی تعمیر نہیں... اگرچہ پچاس برس پیشتر میں نے اس چوک کا کونہ کونہ چھان مارا تھا لیکن یہ چبوترہ جو ان دنوں بھی موجود تھا' میری نظروں میں نہ آیا تھا... میں نے دیکھا کہ لوگ وہاں رکتے ہیں... تصویریں کھنچواتے ہیں اور دو چار سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے کی دیوار سے اندر جھانکتے ہیں... اور ایک لڑکی نے اس کے اندر چند سکے پھینکے...

تجسس نے مجھے زندگی میں سب سے زیادہ زدوکوب کیا ہے... بہت مارا ہے کہ پتہ نہیں یہ جو بلند ٹیلہ بائیں ہاتھ پر گزرتا ہے اس کے عقب میں کیا ہے... دیکھنا تو چاہیے... میرے کوہ نورد

رفیق چلتے جارہے ہیں اور مجھے جاننے کی جستجو اس ٹیلے پر چڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے... کیا پتہ اس کے دوسری جانب کوئی پوشیدہ جھیل ہو... چندان دیکھے پھول ہوں اور میں حرکت قلب کے رک جانے کا خدشہ مول لے کر بھی اس ٹیلے پر گرتا پڑتا چڑھ جاتا ہوں اور دوسری جانب دیکھتا ہوں تو وہاں کچھ بھی نہیں... جیسے پتھر ادھر پڑے ہیں ویسے ادھر بھی ہیں... یہ ایک سعی لاحاصل تھی... لیکن... ایک دوبار ٹیلے کے اس پار کچھ ایسا تھا جیسا زندگی بھر دیکھنے کو نہ ملا... اسی تجسس نے مجھے یہاں بھی مارا اور میں میمونہ کو تانیا کی صحبت میں چھوڑ کر اُدھر چلا گیا... وہ دو چار سیڑھیاں طے کر کے چبوترے کی کمر تک آتی چار دیواری کے اندر جھانکا... اندر جانا ممکن نہ تھا کہ ایک مقفل آہنی گیٹ راہ میں حائل تھا... اور اندر... کچھ بھی نہ تھا... ماسکو کی کڑی دھوپ میں چبوترے کی گولائی کے اندر ایک پتھریلا فرش تھا... البتہ وہاں فرش کے درمیان میں تقریباً ایک فٹ اونچی ایک تعمیر تھی... اور مستطیل شکل کی تھی... آس پاس چند سکے بکھرے ہوئے تھے... یہ کوئی قبر یا یادگار وغیرہ تو نہ تھی... یونہی چبوترے کے اندر ایک اونچا تھڑا سا تھا... یہاں جھانکنے والے جو بھی آتے جھانک کر چلے جاتے' ایک نوجوان روسی جوڑا جب سرسری طور پر جھانک کر جانے کا قصد کر رہا تھا تو میں نے پوچھ لیا...

''آپ انگریزی بول سکتے ہیں؟''

نوجوان نے نہایت خوش خلقی سے کندھے سکیڑے' مسکرایا... ''نو... نو...''

روس اگرچہ بہت مغربی اور امریکی ہوا جا رہا تھا لیکن وہاں ابھی تک انگریزی زبان کا چلن کم تھا... میں نے اشاروں سے دریافت کرنے کی سعی کی کہ یہ کیا مقام ہے تو نوجوان کی جان پر بن گئی... کہ اس اجنبی کو بہر صورت بتانا ہے کہ یہ کیا جگہ ہے... کبھی وہ روسی میں رواں ہو جاتا اور کبھی اپنی گردن پر ہتھیلی رکھ کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا... میری آوارگی نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ میں اس نوعیت کے اشاروں کنایوں اور چہرے کے تاثرات سے کسی حد تک جان لوں کہ قصہ کیا ہے...

قصہ یہ تھا کہ سرخ چوک میں یہ وہ جگہ تھی جہاں زار کے مخالفین کے سر قلم کیے جاتے تھے... اور روزانہ کیے جاتے تھے...

کمر تک آنے والی چار دیواری اس لیے تھی کہ قتل کیے جانے والوں کا خون اس کے اندر رہے... سرخ چوک کے پتھروں کو آلودہ نہ کرے... مجرموں کے سر ایک ٹوکری میں جمع کر لیے جاتے اور دھڑ زار کے سپاہی اٹھا کر شاید دریائے ماسکو میں پھینک دیتے یا کہیں دفن کر دیتے...

اُس روز دھوپ کڑی تھی...

کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس چبوترے کے اندر جو فرش ہے وہ کبھی لہو کی سرخی میں پوشیدہ ہو جاتا ہوگا...

اور معاً مجھے ایک ایسے شخص کی یاد آئی جو انہی دو چار سیڑھیوں پر قدم رکھتا مقتل کی قربت میں ہوا تھا... اور یہ فیوڈور دوستو وسکی تھا... جس کا ناول ''برادرز کرمازوو'' پڑھتے ہوئے ٹالسٹائی نے اس کے ایک صفحے پر نشان لگایا تھا کہ یہاں تک پڑھ لیا ہے اور پھر اپنی حویلی سے ایسا نکلا کہ مردہ ہو کر واپس آیا تھا...

دوستو وسکی کو زار کے خلاف تختہ منصوبے میں ملوث ہونے کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور اسے موت کی سزا سنائی گئی...

اسی چبوترے کے اندر ایک گلوٹین نصب تھی...

یہ جو معصوم سا تھڑا نظر آ رہا تھا یہ اس گلوٹین کا ایک حصہ تھا...

جلاد مجرم کے بال پکڑ کر اس کا سر گلوٹین کے بیچ میں اس تھڑے پر رکھتا اور پھر اوپر سے ایک تیز دھار گنڈاسا اس کی گردن پر گرتا اور اس کا حیران کھلی آنکھوں والا سر... دھڑ سے کٹ کر نیچے ٹوکری میں جا گرتا...

روایت یہ ہے کہ زار کے ان مخالفین کے سر دھڑ ادھر ادھر... جو ابھی دھڑ کے ساتھ تھے اور ابھی دھڑ سے کٹ کر گرتے تھے... جو تختہ کی سازش میں شریک تھے... انہیں قتل کیا جا رہا تھا اور ان مجرمین کی ایک طویل قطار تھی جو سرخ چوک کے درمیان تک چلی جاتی تھی اور اس قطار میں دوستو وسکی بھی شامل تھا... ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے اور زار کے سپاہی اسے دھکیلتے ہوئے... کہا جاتا ہے کہ جب دوستو وسکی کے آگے چوتھے نمبر پر جو شخص تھا اس کا سر کٹ کر گرا... اور جو شخص تیسری جگہ پر تھا جلاد نے اس کی گردن پکڑ کر گلوٹین پر رکھی اور اس پر وہ تیز دھار گنڈاسا گرنے کو تھا تو سرخ چوک میں کچھ شور وغل سا ہوا... گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور یہ زار روس کے ہرکارے تھے جو یہ حکم نامہ لے کر آئے تھے کہ تختہ کی سازش کے تمام مجرموں کو معاف کیا جاتا ہے... کہا جاتا ہے کہ جس شخص کا سر جلاد گلوٹین کے نیچے رکھ چکا تھا جب اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ پاگل ہو گیا... اس کے پیچھے جو مجرم اپنی باری کا منتظر تھا اس کا کچھ سراغ نہ ملا کہ وہ زندگی دوبارہ پا کر کدھر چلا گیا... اور ان دونوں کے پیچھے دوستو وسکی کھڑا تھا... چند لمحوں بعد موت کا منتظر... اپنی گردن پر اس تیز دھار

گنڈاسے کے بلیڈ کو ابھی سے محسوس کرتا ہوا اور وہ بھی آزاد کر دیا گیا...

دوستوفسکی نے اپنے تمام بڑے ناول موت سے اس ملاقات کے بعد تحریر کیے...

وہ بھی پاگل ہو گیا پر اس کے پاگل پن نے ناولوں کے کرداروں کا روپ اختیار کیا...

ایسے کردار جو زندگی اور موت سے آگاہ ہو کر نڈر ہو چکے تھے...

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ادیب جب تک موت کی قربت کے سرد سانس محسوس نہ کرے ایک لازوال تحریر نہیں لکھ سکتا...

یہ صرف موت ہے جو چھوٹے اور بڑے کو الگ کرتی ہے...

موت سے جدا ہو کر محض زندگی کا تجربہ نہایت کھوکھلا اور بنجر ہوتا ہے...

اور ہاں یہ صرف حقیقت ہی نہیں ایک ادیب کی قوت متخیلہ بھی موت کی قربت کو محسوس کر سکتی ہے...

اگرچہ میں یقینی موت سے کبھی دوچار نہیں ہوا... صرف امکانی موت کے متعدد تجربوں سے گزرا ہوں اور میرے جتنے بھی سفرناموں اور ناولوں میں اس کی پرچھائیاں ہیں وہ زیادہ اثر انگیز ثابت ہوئے ہیں...

یہ ڈاکٹر سلطانہ شاہ تھی جس نے کہا تھا کہ موت مجھے تمہارے قریب لائی ہے اور اس نے میری تحریروں میں جب کہ مجھے بھی اس کا احساس نہ تھا 'موت دریافت کر لی تھی...

لیکن ایک تجربے اور قوت متخیلہ میں بہت فرق ہوتا ہے... بے شک میں اپنی آوارہ گردیوں اور کوہ نوردیوں کے دوران متعدد بار موت کی قربت میں ہوا لیکن میں کبھی کسی ایسی قطار میں کھڑا نہ ہوا جس کے آگے ایک گلوٹین کا تیز دھار گنڈاسا میری گردن پر گرنے والا تھا...

تو بس یہی فرق ہے مجھ میں اور دوستوفسکی میں...

اور اسی لیے میں اپنی تحریر میں اس کی خاک تک بھی نہیں پہنچ سکا... محض تخیل اور محدود تجربے سے تو اپنی گردن پر گرنے والے تیز دھار گنڈاسے کو محسوس نہیں کیا جا سکتا...

گیارھواں باب

"مونا اور زارِ روس نکولس سرخ چوک میں"

دوستوفسکی تو دار و رسن کی آزمائش میں سرخرو ہوا...

لیکن مونا کے دار و رسن کی آزمائش زیر زمین ریلوے میں اترتے تیز رفتار برقی زینے تھے جو زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتے گم ہوتے جاتے تھے...

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ میری پشت کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جائے اور جونہی میں متحرک زینے پر قدم رکھوں اسی لمحے وہ بھی بے دھڑک اس پر قدم رکھ دے... یوں اگر وہ لڑکھڑا کر گرتی بھی ہے تو مجھ پر گرے گی اور میں اسے سنبھال لوں گا...

ظاہر ہے بادل نخواستہ وہ میری پشت کے ساتھ جُڑ کر کھڑی ہو گئی...

میں نے اس برق رفتار زینے پر پاؤں دھرا اور متحرک ہو گیا اور اگلے لمحے مجھے احساس ہوا کہ مونا تو میری پشت پر موجود نہیں ہے' مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے اور وہ وہیں کھڑی ایک معصوم اور شدید طور پر خوفزدہ بچے کی مانند جھجک رہی ہے... پاؤں آگے کرتی ہے اور پھر پیچھے کر لیتی ہے اور اس کا چہرہ سفید ہو رہا ہے... میں اسے آواز دیتا ہوں کہ مونا آ جاؤ کچھ نہیں ہو گا... اس نے میری آواز سن کر جانے کیسے ایک اضطراری قدم متحرک زینے پر رکھ دیا اور وہ سنبھل نہ سکی' بُری طرح گری اور اسی لمحے میں نے اس کی مدد کو پہنچنے کی خاطر سیڑھیاں طے کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کی... وہ متحرک ریلنگ تھامنے کی کوشش میں بہت بری طرح گری... ذرا لڑھکی' گرتے ہوئے سنبھلی پھر گری اور پھر سنبھل گئی... اگر وہ نہ سنبھلتی تو اس تیز رفتاری میں میں بھی اسے تھام نہ سکتا اور وہ زیر زمین سٹیشن تک لڑھکتی چلی جاتی' اسے کوئی ایسی چوٹ لگ جاتی جو مہلک ثابت ہوتی یہ طے تھا... اس گرنے اور سنبھلنے کے دوران بھی اسے متعدد چوٹیں آئیں

جنہیں آئندہ دنوں میں وہ ایک پرسکون صبر کے ساتھ سہتی رہی... ان کی ٹیسیں برداشت کرتی رہی اور ہاں اس دوران اس کی اکلوتی نظر کی عینک اس کے چہرے سے بے اختیار الگ ہو کر جانے کس جہاں میں کھو گئی اور اس سانحے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک عجیب بے چارگی بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی کہ وہ آسانی سے ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

دراصل میمونہ ایک عرصے سے ایک اذیت ناک عارضہ میں مبتلا تھی... اور کسی وید، حکیم، یا ڈاکٹر کے پاس اس کا علاج نہ تھا... اسے کہا گیا تھا کہ اب آپ نے اسی اذیت کے ساتھ زندہ رہنے سے سمجھوتہ کرنا ہے... اس کے دماغ میں ہمہ وقت ایک گونج سی اٹھتی رہتی تھی ایک ہلکا شور چلتا رہتا تھا اور بقول اس کے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے دماغ میں آٹا پیسنے کی ایک چکی چل رہی ہے اور اس کا سبب یہ بتایا گیا... کہ اس کے کانوں کے اندر جو ایک پانی ہوتا ہے جو نظر اور دماغ کو ایک سطح پر رکھتا ہے وہ سوکھ گیا ہے اور اس کا کوئی اپائے نہیں ہے... آپ کو سمجھوتہ کرنا پڑے گا کہ آپ کے دماغ میں یونہی شور اٹھتا رہے گا... گراریاں سی گھومتی رہیں گی اور آپریشن کا مشورہ بھی نہیں دیا جاسکتا...

اور مونا نے سمجھوتہ کر لیا...

بس ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا کہ اس کے توازن کی حس بھی ڈول گئی تھی...

اور اسی لیے جب وہ برقی زینے پر قدم رکھنے لگتی تو ڈول جاتی...

آئندہ دنوں میں میں نے یہ اہتمام کیا کہ زینے پر قدم رکھنے سے پیشتر اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتا اور جب اپنا پاؤں متحرک زینے پر رکھتا تو اسے کھینچ کر اپنے قدم کے ساتھ قدم رکھنے پر مجبور کر دیتا... اور جب ہم نیچے زینے کے آخر میں زیر زمین پلیٹ فارم کی قربت میں پہنچتے تو وہ میرا ہاتھ جھٹک دیتی کہ مجھے زینے پر چڑھنے میں دقت ہوتی ہے... اترنے میں تو نہیں... تو تم نے میرا ہاتھ کس سلسلے میں ابھی تک تھام رکھا ہے...

ہم زیر زمین ریلوے سٹیشن سے برآمد ہوئے... سرخ چوک کی جانب گامزن ہوئے تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کے سپریم کمانڈر جنرل ژوخوف کے گھڑ سوار مجسمے کے پہلو میں سرخ چوک میں داخل ہونے والا جو در ہے وہ کھلا ہے... لوگ آ جا رہے ہیں یعنی بالآخر ہم روس کے اس مقدس مقام کی زیارت کر ہی لیں گے...

اور وہاں... جو ایک بلند محرابی دروازہ تھا... ایک در تھا جو سرخ چوک پر کھلتا تھا وہاں ایک میلہ لگا تھا...

جیسے تاج محل کے اندر جاتے ہوئے ایک اچنبھا سا ہوتا ہے کہ آخر یہ جو ہزاروں ہندوستانی بھانت بھانت کے امڈے چلے آ رہے ہیں تو کیا انہوں نے اب تک تاج محل نہیں دیکھا تھا اور پھر کھلتا تھا کہ یہ تو اپنے بھانت بھانت کے گھروں سے پہلی بار اس نگری میں آئے ہیں... اپنے آسام... بھوٹان... بنگال... گوا اور لداخ وغیرہ سے نکل کر آگرے کی نگری میں آئے ہیں... اور وہ جس خواب میں آج تک جی رہے تھے اس تاج محل کو دیکھنے آئے تھے...

بس یہی سلسلہ سرخ چوک کے محرابی دروازے کے آس پاس تھا...

یہاں بھی جن لوگوں کا میلہ تھا وہ ماسکو کے باسی تو نہ تھے... جانے وہ کیسے دور دراز خطوں... سائبیریا... تاتارستان... داغستان... اُدھر الاسکا کو چھوتے... یورپ کی قربت میں سانس لیتے... اور کبھی چین کی سرحد تک جانے والی ٹرانس سائبیریا ٹرین میں ولاڈی واسٹک تک جانے والے لوگ تھے...

اور اب دور درازی کے قصے کو یوں دراز کرتے ہیں کہ جب میں نے چھریری اور گردن کو سیدھی رکھنے والی چاند کی گولائی والے چہرے کی تانیا سے دریافت کہ کیا تم کہاں کی رہنے والی ہو... تو اس نے ایک ناآشنا سے شہر کا نام لیا کہ میں وہاں کی رہنے والی ہوں...

"اور یہ... کہاں ہے...؟"

"یہاں ماسکو سے بہت دور ہے... شاید آپ نے جھیل بیکال کا نام سن رکھا ہو... شاید آپ کو اس جھیل کے بارے میں کچھ علم نہیں... یہ وہاں کا سب سے بڑا شہر ہے..."

نہ میں نے اس جھیل بیکال کو دیکھا تھا اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ یہ روس میں کہاں واقع ہے، صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی جھیلوں میں شمار ہوتی ہے... ایسی جھیلیں جو دراصل ایک مختصر سمندر ہوتی ہیں اور یہ والی جھیل روز بروز خشک ہو رہی تھی اور اس کے کناروں پر صدیوں سے آباد مچھیرے کوچ کر رہے تھے کہ جہاں کبھی پانی ہوا کرتے تھے وہاں اب خشکی کی ویرانی رینگتی چلی آتی تھی...

جھیل بیکال... میرے پرندوں کی جھیل تھی...

اور انہی پرندوں کو ہلاک کر دینے والی ایک بندوق کا نام بھی تھا...

تانیا نے جب یہ نام لیا تو میرے ہر سو میرے تخلیق کردہ پرندے اڑان کرنے لگے... سرخ چوک کا آسمان ان سے بھر گیا اور ان کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دینے لگی... وہ کریملن کی سرخ

دیواروں اور لینن کے مقبرے کو بھی ڈھکنے لگے...

میرے ناول "بہاؤ" میں جنگل کے اندر پوشیدہ ایک ایسی خشک ہو چکی جھیل تھی جہاں پرندے مرنے کے لیے آ جاتے تھے... اور وہ پرندے اسی جھیل بیکال سے اڑان کرتے ہوئے اپنے برفانی موسموں سے فرار ہو کر وہاں آ جاتے تھے اور مرنے کے لیے آ جاتے تھے... "راکھ" میں بھی جتنی مرغابیاں قادر آباد جھیل پر اترتی تھیں اور وہاں منتظر شکاریوں کے پانی پر پھیلائے ہوئے ڈیکائز ان کے ہم شکل ہوتے تھے اور وہ ان سے میل کرنے کو نیچے آتی تھیں تو ان شکاریوں کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی... رف اور مف بیکال نامی بندوقوں کا شکار ہو جاتی تھیں... اور وہ سب جھیل بیکال سے ہی تو آ رہی ہوتی تھیں... اور ان کے لیے ایک دھند آلود سویر میں منتظر مشاہد علی کو اپنی نامردی کا احساس دلاتی تھیں کہ اس کے اندر شکار کی چاہت ماند پڑتی جاتی تھی...

میں تانیا کو... اس چکیلی ٹہنی کو کیا بتاتا کہ میرے سارے پرندے تمہاری جھیل بیکال سے ہی تو آتے ہیں اور کیا پتہ تم بھی ایک معصوم پرندہ ہو جو جھیل بیکال سے اڑان کرتا ماسکو کے شہر میں اتر آیا تھا...

"کیا آپ نے..." اس نے ذرا جھجک کر پوچھا... "جھیل بیکال کا نام سن رکھا ہے... آپ اسے جانتے ہیں..."

"ہاں میں اسے جانتا ہوں... لیکن کیا تم جانتی ہو کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں...؟"

تانیا نے حسب توقع بے چارگی سے سر ہلایا...

"اور وہ چار مرغابیاں تمہاری جھیل بیکال سے اڑان کرتی قادر آباد جھیل پر اترتی تھیں اور زاہد کالیے کی بندوق کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئی تھیں...!"

مونا نے مجھے بری طرح گھورا کہ پھر پٹڑی سے اتر گئے ہو...

میں نے اپنے تئیں اس عجیب اور لایعنی فقرے کی معنویت تانیا پر آشکار کرنے کی سعی کی کہ کیسے چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی واسطہ نہیں... اور وہ بے چارگی سے سر ہلاتی رہی...

ویسے مجھے ہمیشہ قلق ہوتا ہے جب لوگ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ آخر چار مرغابیوں کا خوشی سے کیسے کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ جناب میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ ان کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں... اور پھر بھی وہ سمجھ نہیں پاتے...

تانیا تو پھر بھی ایک نوخیز چکیلی ٹہنی تھی... ابھی اس کے شجر بن جانے میں بہت دن تھے تو وہ کیا سمجھتی... اس نے عافیت اسی میں جانی کہ وہ مجھے اپنی جھیل کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر دے کہ یہ دنیا میں تازہ پانیوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے... اس کے کناروں پر سفر کیا جائے تو آپ اگر ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کی مسافت بھی طے کر جاتے ہیں تو اس کا آخری کنارا نہیں آتا... اور وہ اس کے کنارے ایک شہر میں رہتی ہے...

"ماسکو سے تمہارا یہ شہر... تمہارا گھر کتنی دور ہے..."

"بس سات آٹھ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں..."

"یہ تو کچھ زیادہ دور نہ ہوا... ہمیں کراچی پہنچنے میں اس سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے..."

"بائی ایئر...؟"

"نہیں نہیں... ٹرین پر..."

"ٹرین پر تو ہمیں جھیل بیکال تک پہنچنے کے لیے پانچ دن اور پانچ راتیں لگتی ہیں... میں تو آپ کو پرواز کا وقت بتا رہی تھی..." اس نے منہ سکیڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

روس کے نقشے پر جب میں نے جھیل بیکال کو تلاش کیا اور اس شہر کی نشاندہی کر لی جہاں سے تانیا آئی تھی تو وہ شہر منگولیا کے صدر مقام اولان باتور کے آس پاس نکلا... اگر وہاں تک ٹرین پانچ روز میں بھی پہنچ جاتی تھی تو کمال کرتی تھی...

مونا ذرا سیانی ہے اس نے تانیا کو دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ وہ ماسکو کی نہیں ہے... اس کے لباس کی سادگی سے... اس کے تجسس اور اعتماد سے جو ایک چھوٹے دور افتادہ شہر سے ایک بہت بڑے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آنے والی لڑکی میں ہوتا ہے... مقامی لڑکیاں ہمیشہ ذرا نازک اور نخریلی ہوتی ہیں اور وہ پڑھائی کو بھی اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتیں...

سرخ چوک میں داخل ہونے والے محرابی دروازے کے باہر پتھروں کے فرش پر ایک میلہ لگا تھا... روسی دستکاریوں کے سٹال تھے جہاں اگرچہ میرے نزدیک کچھ بھی ایسا نہ تھا جسے خریدنے کی خواہش ہو سکے... مشروبات کے کھوکھے تھے اور سیاحوں کو ترغیب دینے کے لاکھ بہانے تھے...

ان میں سے ایک بہانہ زار نکولس تھا جو اکتوبر انقلاب کے دوران اپنے خاندان سمیت انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا... لیکن آج تو ے برس بعد جب کہ اس کی ہڈیاں تلاش کر کے

انہیں پورے اعزاز کے ساتھ پھر سے دفنایا جا چکا تھا' وہ پھر سے زندہ ہو کر اپنی بھوری نوک دار داڑھی اور شاہانہ وردی میں ملبوس سیاحوں کے ہجوم میں چہل قدمی کرتا تھا... مسکراتا تھا اور ایک گداگر کی مانند مسکراتا تھا... ظاہر ہے وہ ایک شاندار اور مکمل بہروپیا تھا جو صرف چند ڈالروں کے عوض سیاحوں کے ساتھ اپنی تصویر کھنچواتا تھا اور پاپی پیٹ کو پالتا تھا...

اور گاہکوں کی کچھ کمی نہ تھی...

ایک مکمل روسی زار کے پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پرفخر تصویر اتروانا صرف چند سو روبل میں تو مہنگا سودا نہ تھا... بھلا ایسے تعاون کرنے والے زار روز روز کہاں ملتے ہیں... ہمارے ہاں بھی اسی نوعیت کے متعدد فوجی اور سیاسی زار ہیں اور بہروپیے ہیں لیکن وہ اتنے کم پیسوں میں عوام الناس کے ہمراہ تصویر کہاں اترواتے ہیں... تو اس زار کی قدر کرنی چاہیے تھی... میں نے تانیا کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ حضرت زار... بلکہ زار و قطار... کہ اس کے ساتھ تصویریں اتروانے کی خواہش کرنے والوں کی ایک قطار تھی... تو تانیا کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چپکے سے زار کے ساتھ کچھ خفیہ مذاکرات کر کے اسے صرف ایک سو روبل... یعنی چار ڈالر میں میری بیگم کے ہمراہ ایک تصویر اتروانے پر راضی کر لے... اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس تصویر میں پوز کیا ہوگا... زار نکولس اپنی تمام تر شاہانہ آن بان میں مونا کے ہاتھ کو نزاکت سے تھامے' کمر تک جھکا ہوا اس کا استقبال کر رہا ہے اور مونا اپنی راجپوتی شان میں گردن اکڑائے کہ تم زار ہو گے تو اپنے گھر میں ہو گے میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں...

ویسے مونا بھی جاہ و جلال اور اکڑفوں میں کسی زارینہ سے کم نہ تھی... اور خدا لگتی کہوں کہ ہر اچھی اور سگھڑ بیوی کو اپنے بے راہرو خاوند کو قابو میں رکھنے کے لیے زارینہ ہونا ہی پڑتا ہے...

اس بدبخت بہروپیے زار نے ایک سو روبل کے عوض میں تصویر اتروانے سے انکار کر دیا اور دو سو روبل کا تقاضا کرتا رہا... وہ ایک بیہودہ اور لالچی زار تھا جس کا انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہو جانا سمجھ میں آتا ہے...

ایک تو زار روس کی ترغیب تھی سیاحوں کے لیے... اور اس کے سوا دو عقاب اور دو بندر تھے یعنی آپ یا تو زار روس کے ہمراہ ایک تصویر اتروا سکتے ہیں اور یا ایک بندر کے ساتھ...

زار روس... بندر اور دو عقاب... آپ ان میں سے کسی کو بھی چند روبل کے عوض لمحے بھر کے لیے اپنے اشاروں پر نچا سکتے تھے...

وہ دو عقاب... ایک سلاخ پر پنجے جمائے بہت کھوئے کھوئے' اداس اور بور ہو چکے لگتے تھے... آپ چند روبل ادا کر کے ان کے ہمراہ ایک تصویر اتروا سکتے تھے... اور آپ اس دوران ان کے پروں کو پیار سے تھپک سکتے تھے... ان کی چونچ پر بوسہ دے سکتے تھے یا انہیں اپنے ہاتھ پر بٹھا کر ایک شکاری انداز اختیار کر سکتے تھے... اور کسی بھی معزز اور عزت نفس رکھنے والے عقاب کے لیے اس سے بڑھ کر بے عزتی اور ڈوب مرنے کا مقام اور کیا ہوگا کہ اسے پہلے تو زنجیروں سے جکڑ کر ایک سلاخ پر بٹھایا جائے... سرعام اس کی نمائش کی جائے اور پھر کوئی بھی شخص چند روبل خرچ کر کے اس کے ساتھ ایک پرتفاخر تصویر اتروا لے... اس کی چونچ... بند چونچ کے بوسے لے... اگر وہ دونوں عقاب... زنجیروں میں جکڑے ہوئے قدرے اداس اور بور ہو چکے لگتے تھے تو ان کو دوش نہیں دیا جا سکتا... پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے والے شاہین کیسے بے بس اور قابل فروخت ہو گئے تھے... شائد انہیں اُن کے تکبر کی سزا ملی تھی... وہ جو ایک ناتواں کمزور چڑیا پر جھپٹنے پلٹنے لہو گرم کرنے کا ایک بہانہ ڈھونڈتے تھے انہیں ان کے اس ظلم کا بدلہ ملا تھا... اور ان کے اوپر ماسکو کا جو آسمان تھا اس پر عام سی فضول سی چڑیاں فضائے بسیط میں پرواز کرتی تھیں اور وہ... یہاں زمین پر بندھے ہوئے پر پھڑپھڑاتے تھے اور ان میں طاقت پرواز نہ تھی...

اگر آپ ایک معصوم چڑیا یا پرامن فاختہ کی بجائے ایک عقاب کی پوجا کرتے ہیں تو آپ کا یہی حشر ہوتا ہے...

کچھ دیر بعد بارش اترنے لگی... سب لوگ پناہوں میں چلے گئے یا برساتیاں اوڑھ کر پانی سے محفوظ ہو گئے اور وہ دو عقاب بے بسی سے بھیگتے رہے...

ویسے اپنے علامہ اقبال اگر انہیں دیکھ لیتے تو کیسے رنجیدہ اور دکھی ہو جاتے کہ میرے شاہین یوں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں... اتنے رسوا ہو رہے ہیں...

میرے اندر بہت شک تھا... اور شک یہ تھا کہ یہ عقاب نہیں چیلیں ہیں... جو عقاب دکھائی دے رہی ہیں... البتہ ان کے ہمراہ جو دو بندر تھے وہ قطعی طور پر رنجیدہ یا اداس نہ تھے' خوب موج میلہ کر رہے تھے... دانت نکوستے ہوئے تصویریں اتروا رہے تھے... شاید وہ خوش تھے کہ یہاں ہم بندر اور عقاب ایک ہو چکے ہیں...

ماسکو میں قیام کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ روسی جانوروں اور پرندوں کے بارے میں قدرے لاپروا ہیں... ان کے ساتھ جانوروں ایسا برتاؤ کرتے ہیں... شاید ایسا ہے کہ

زاروں کے عہد میں... ایک عام روسی دہقان یا مزدور یا زرعی مزارع مراعات یافتہ طبقے کے لیے ایک جانور ہوا کرتا تھا... اور اگر ایک انسان کو جانور بنا دیا جائے تو اسے سچ مچ کے جانوروں سے کچھ ہمدردی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ خود بھی تو اس قسم کی زندگی گزار رہا ہے... چند روز بعد ہم ایک روسی سرکس دیکھنے کے لیے گئے اور وہاں بھی ہم نے بے اعتنائی اور شقی القلبی کا یہی مظاہرہ دیکھا... ایک بن مانس... ایک ریچھ اور ایک رائل بنگال ٹائیگر... یہ سب برائے فروخت تھے... اور روسی بچے ان کے ساتھ تصویریں اتروا رہے تھے... بن مانس کو تو نہیں جو ایک عمر رسیدہ گنجا بن مانس تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ریچھ اور رائل بنگال ٹائیگر کو ٹیکے لگا کر اتنا مدہوش کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک مطیع شدہ حالت میں چپ چاپ لیٹے بچوں اور بڑوں کے ساتھ تصویریں اترواتے تھے اور نہ کبھی دھاڑتے تھے اور نہ کچھ احتجاج کرتے تھے...

کم از کم اس معاملے میں ہم پاکستانی 'روسیوں' سے کہیں بہتر تھے...

ہمارے ہاں بے شک انسانوں سے غفلت برتی جاتی تھی... انہیں جی بھر کے کبھی مذہب اور کبھی حب الوطنی کے نام پر ذلیل کیا جاتا تھا لیکن ہم بندروں اور بھالوؤں کے حقوق کا تحفظ کرتے تھے... آپ کو اب کہیں بھی بھالو نچانے والے نہیں ملیں گے کہ ان کے بھالو چھین کر انہیں جنگلوں میں آزاد کر دیا گیا ہے... اور ہم نے بندر کا تماشا دکھانے والے مداریوں سے ان کے بندر چھین لیے ہیں اور انہیں آزاد کر دیا ہے... اور اگر وہ بندر... اپنی من مرضی سے ایوان اقتدار میں داخل ہو کر خود سے تماشا کرنے لگتے ہیں تو یہ ان کا آئینی حق ہے...

وہیں سرخ چوک کے محرابی دروازے کے آگے جہاں یہ کھیل تماشے جاری تھے... سیاحوں کی جیبیں خالی کرانے کے لاکھ بہانے تھے اور زار نکولس اتراتا پھرتا تھا تو وہاں کیا دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جو فرش پر نشان زدہ ایک دائرے میں کھڑے ہوتے ہیں... تصویریں اترواتے ہیں اور اپنے کندھے پر سے کچھ سکے نچھاور کرتے ہیں اور بہت پرمسرت ہوتے ہیں...

اب جانے یہ کون سا مقام تھا...

''مستنصر...'' چلبلی ٹینی تانیا بولی... ''یہ وہ جگہ ہے جہاں سے پورے روس کے فاصلے ماپے جاتے ہیں... یعنی یہ زیرو کلومیٹر ہے... جہاں سے پورے روس تک جانے والے راستوں کا آغاز ہوتا ہے...''

''تمہارے شہر کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے تانیا...''

''ہاں.. یہ ہمارا مرکز ہے.. اور یہاں سے میرا شہر اور جھیل بیکال پانچ روز کی مسافت پر واقع ہے..''

''تم اس دائرے میں کھڑی ہو کر ایک تصویر اتروانا چاہو گی تانیا..؟''

''نہیں..'' وہ چونک کر بولی.. ''مجھے اپنے گھر سے دوری کا احساس ہو گا اور میں بہت اداس ہو جاؤں گی.. میں یکدم ماسکو کو چھوڑ جانا چاہوں گی..''

''تانیا..'' مونا مارشل ژوخوف کے مجسمے کے قریب ہو کر اس کے گھوڑے کی باگیں.. جو کہ پتھر کی تھیں انہیں حیرت سے تک رہی تھی..

''تانیا کیا وہاں جھیل بیکال کے کنارے سے کیا کوئی ایک شخص.. کوئی بوائے فرینڈ تمہارا منتظر ہے..''

''نہیں.. آپ میرے پسندیدہ مصنف ہیں اور میں اقرار کرتی ہوں کہ ابھی تک مجھے محبت نہیں ملی..''

چنانچہ میں نے اور مونا نے اس دائرے کے اندر کھڑے ہو کر ایک تصویر بنوائی جہاں سے ہر فاصلہ.. روس کے تمام شہروں کے راستے زیرو کلومیٹر سے شروع ہوتے تھے.. ہم دونوں بھی ایک زمانے میں زیرو میٹر ہوا کرتے تھے لیکن اب تک اتنا گھوم چکے تھے کہ خود بھی میٹر ہو چکے تھے.. ہم نے رواج کے مطابق اپنے کاندھے پر سے سکے پھینکنے سے اجتناب کیا.. اگر ایسا کرنے سے ہم دونوں پھر سے جوان ہو کر زیرو میٹر ہو جاتے تو ہم اپنے تمام تر روبل لٹا دیتے..

ایک بڑھیا بہت جھکی ہوئی لاچارگی سے سیاحوں کے پھینکے ہوئے سکے نہایت احتیاط سے چن رہی تھی اور اپنے گھٹنوں تک آتے کوٹ کی جیب میں محفوظ کر رہی تھی.. اب یہ روسی بڑھیا کون ہو سکتی تھی.. کہاں سے آئی تھی اور کیوں اتنے معمولی سکوں کو چننے پر مجبور تھی.. یا اگر سارا دن یہ سکے جمع کرتی رہے تو بھی وہ شاید ان کے عوض ایک وقت کا کھانا نہ خرید سکے..

تو یہ کون ہو سکتی تھی..؟

کیا اس کا کوئی والی وارث تھا..؟ یہ رہتی کہاں تھی' کسی چھتر تلے یا کسی پل کے نیچے.. یہ ایک اور کہانی ہو سکتی تھی.. میں اس روسی بڑھیا کو بورس کی مانند اپنے ذہن کی کھڈی پر چڑھا کر کھٹ کھٹ کرتے ایک اور کہانی بُن سکتا تھا.. لیکن اتنی کہانیاں کون سنے گا.. تو صرف بورس کی کہانی ہی کافی ہے..

میں نے آگے بڑھ کر بے تابی سے محرابی دروازے کے اندر نگاہ کی.. کیا اس کے اندر پچاس برس پیشتر والا سرخ چوک جوں کا توں موجود ہے یا اس کی ہیئت بدل گئی ہے.. وہاں وہی پتھریلے فرش پر بساط بچھی تھی' وہی مہرے وہیں ایستادہ تھے.. سینٹ باسل چرچ.. آئیون ٹاور.. کریملن کی دیوار اور لینن کا مقبرہ.. سب کچھ نظر تو جوں کا توں آتا تھا لیکن بساط الٹ چکی تھی.. ان زمانوں میں لینن.. سٹالن.. بیریا.. مکویان.. کوسیگن.. خروشچیف اور برزنوف سرخ چوک کی شطرنج کے کھلاڑی تھے.. وہ اپنی اپنی چالیں چلتے رہے اور مات کھا گئے.. اور ان کی جگہ گورباچوف کی حقیقت پسندی یا نشتر پسندی آ گئی.. معیشت اور امریکہ اس بساط کو الٹانے میں مددگار ثابت ہوئے.. بورس یلسن ایک ایسا مُہرا تھا جو بے چارا ایک مقام پر تا دیر ایستادہ نہ رہ سکتا تھا.. حالت خمار میں ادھر ادھر لڑھکتا پھرتا تھا.. اور ان دنوں پیوٹن جو کبھی روسی خفیہ پولیس میں شطرنج کا کھلاڑی تھا.. اب سب کو مات دے رہا تھا..

محراب کے سائے میں ایک بوڑھی عورت اتنے گرم موسم میں بھی کسی جانور کی کھال کا اوورکوٹ پہنے' ایک پُھندنے والی اونی ٹوپی اوڑھے ہر سیاح کے سامنے دست سوال دراز کر رہی تھی.. اس کے گالوں پر سرخی چھلکی ہوئی تھی اور اس کی ناک ایک مرچ کی مانند سرخ ہو رہی تھی.. تانیا کا کہنا تھا کہ وہ گداگر نہیں بلکہ شراب کی لت میں مبتلا ہے اور واڈکا خریدنے کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے..

اور ہاں محرابی دروازے کے اوپر حضرت عیسیٰ اور دیگر صوفیا کرام کی مقدس شبیہیں آویزاں تھیں جو پچاس برس پیشتر تو ہرگز نہ تھیں.. ظاہر ہے یہ تازہ ترین اضافہ تھا.. چنانچہ آپ ان کے سائے تلے گزر کر سرخ چوک میں داخل ہوتے تھے..

ہم سرخ چوک میں داخل تو ہو گئے پر اس کے پتھروں پر چلتے نہ تو لینن کے مقبرے تک جا سکتے تھے اور نہ ہی چوک کے پار کلیسائے سینٹ باسل تک رسائی حاصل کر سکتے تھے کہ آگے ایک عارضی رکاوٹ کھڑی کر دی گئی تھی.. یعنی آپ سرخ چوک کو یہاں کھڑے ہو کر دیکھ تو سکتے تھے پر اس کے اندر نہ جا سکتے تھے.. یہ وکٹری ڈے کے خمار کی باقیات تھیں.. سرخ چوک میں ابھی تک کل کی فوجی پریڈ کے دوران استعمال ہونے والے سٹینڈ.. نشست گاہیں اور سٹیج وغیرہ سمیٹے جا رہے تھے.. تو ہم نے اسی کو غنیمت جانا کہ باریابی تو ہو گئی بے شک وصل نہیں ہو سکا تو پھر کبھی سہی.. سرخ چوک کا دیدار تو ہو رہا ہے..

ہمارے بائیں جانب گم سٹور کے سامنے کونے میں ایک خوشنما اور تازہ رنگ شدہ کلیسا تھا اور ظاہر ہے یہ بھی تازہ ترین اضافہ تھا.. وہاں اس کے ایک گنبد پر متعدد لاؤڈ سپیکر نصب تھے جن میں سے پادری صاحب کے وعظ کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی.. چونکہ ہم سرخ چوک کے اندر نہ جا سکتے تھے اس لیے ہم بہت دیر تک آلتی پالتی مارے اس کے پتھروں پر براجمان اس کا نظارہ کرتے رہے.. اور اس دوران مجال ہے کہ پادری صاحب نے اپنا سانس بھی درست کیا ہوا.. لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسلسل خلق خدا کو ڈرا دھمکا رہے ہیں اور عذاب کی نوید دے رہے ہیں.. ان بلند بانگ واعظ کے باعث ہمیں بھی ذرا بلند آواز میں ایک دوسرے کو مخاطب کرنا پڑ رہا تھا.. بالآخر مونا بیزار ہو کر کہنے لگی.. ''ہم ان سے فرار ہو کر' گھبرا کر یہاں آئے تھے اور یہاں بھی ان سے پالا پڑ گیا ہے.. ماسکو میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے..''

''تو کدھر جائیں گے؟''

''اس تانیا سے پوچھو.. آج کے دن یہ ہماری پھپھی ہے..''

اور تانیا بیکال اسی طرح نہایت سنجیدگی سے ایک ٹہنی کی مانند بلند ہو رہی تھی اور اسے سرخ چوک سے کچھ غرض نہ تھی اور وہ صرف ہمارے چہروں کے تاثرات کو نہایت خاموشی سے آنکھوں میں محفوظ کر رہی تھی..

''تانیا.. اب کیا کریں..؟''

اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ہمارے لیے طے شدہ پروگرام برآمد کر کے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا.. ''پوشکن..''

''پوشکن چوک سے تو ہم گزر کر آئے ہیں.. اس کا مجسمہ دیکھ آئے ہیں..''

''نہیں.. اب ہم ارباط سٹریٹ میں واقع پوشکن کا گھر دیکھنے جا سکتے ہیں.. آپ نے پاکستان میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ آپ ماسکو میں قیام کے دوران موسیقاروں.. مصوروں اور ادیبوں کی یادگاریں دیکھنا پسند کریں گے..''

اب اس چکیلی ٹہنی کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے لاہور میں.. اپنی سٹڈی میں ذخاروف سے یہی فرمائش کی تھی اور اسے ایسے معلوم ہو گیا کہ ذخاروف بھائی جان نے آنیا اور اس کی بریگیڈ کو پہلے سے مطلع کر دیا تھا کہ تارڑ ماسکو میں.....

''میں نے پوشکن کو بھی خوب پڑھا ہے.. اس کی کہانیاں مجھے یاد ہیں اور اس کی شاعری

پڑھی تو ہے پر یاد نہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پوشکن کو روسی ادب کا والد صاحب کہتے ہیں۔"

میں نے پوشکن کے بارے میں فرفر معلومات فراہم کر کے تانیا پر دھاک بٹھانی چاہی پر وہ نہ بیٹھی کیونکہ اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "کون ہے جو پوشکن کو نہیں جانتا۔"

"اور اس پوشکن کا گھر کہاں ہے۔" میں نے ذرا خفا ہو کر پوچھا۔

"ارباط میں۔"

"ارباط۔۔ یہ نام کچھ کچھ اسلامی سا لگتا تھا۔ جیسے رباط یا ربط وغیرہ۔۔ اور یہ ارباط کہاں ہے۔۔ سرخ چوک سے کتنی دور ہے۔۔؟"

"زیادہ فاصلے پر نہیں۔۔ ہم تو ستکایا سے میٹرو پر سوار ہوں گے اور تین سٹیشنوں کے بعد اتر جائیں گے۔"

"میٹرو۔" مونا کا رنگ فق ہو گیا۔۔

بارھواں باب

"ارباط کی کیا باط ہے"

ارباط کی کیا باط ہے۔۔

آپ براہ کرم یہ اعتراض نہ کیجیے گا کہ یہ تو بات ہوتی ہے باط نہیں۔۔

کیونکہ اگر آپ ارباط کی بات کریں گے تو وہ باط ہو گی۔۔ بات نہیں۔۔!

اور یہ ارباط جس کی کیا باط ہے۔۔ ہے کیا۔۔؟

یوں جان لیجیے کہ جیسے مصوروں۔۔ ادیبوں۔۔ فٹ پاتھی موسیقاروں۔۔ بیکار اور معاشرے سے بیزار نکلے لوگوں باغیوں کی ہر شہر میں کوئی نہ کوئی پناہ گاہ ہوتی ہے' جہاں پہنچ کر وہ من مانی کر سکتے ہیں' سکون حاصل کر سکتے ہیں۔۔ پیرس میں لیٹن کوارٹر کا رخ کر سکتے ہیں۔۔ لندن میں سوہو کے علاقے میں اور نیویارک میں گرین وچ گاؤں میں بسیرا کر سکتے ہیں۔۔ استنبول کے تقسیم سکوائر میں موج کر سکتے ہیں اور لاہور میں۔۔ کہیں بھی موج نہیں کر سکتے۔۔ تو ایسے تمام بیہودہ لوگ ماسکو میں ارباط سٹریٹ میں پائے جاتے ہیں۔۔ اور ارباط بھی ایک نہیں دو عدد ہیں۔۔

ایک پرانی ارباط ہے اور دوسری نویں نکور جدید ارباط ہے۔۔

یہ جو جدید ارباط ہے۔۔ وہی پر ہجوم بلند عمارتوں اور تنگ چڑھے لوگوں والی ارباط ہے جس کی کوئی بات نہیں اور جو قدیم ارباط ہے اس کی تو کیا باط ہے۔۔

یہاں ہر نوعیت کی ٹریفک ممنوع ہے۔۔ یہاں تک کہ آپ اس میں سائیکل پر سوار ہو کر بھی داخل نہیں ہو سکتے اور اس قدیم کوچے کے عین درمیان میں دستکاریوں اور فنون لطیفہ سے متعلق سٹال اور کھوکھے ہیں جن میں سے اکثر کے مالک بے ترتیب گھنی داڑھیوں والے ہیں جو انہیں صرف تب کھجاتے ہیں جب ان میں مقیم جوئیں متحرک ہوتی ہیں۔۔ اور یہ جوئیں بھی روس کے

نئے سرمایہ دارانہ نظام کی دین تھیں ورنہ کمیونسٹ دور میں نہ تو آزادیٔ رائے کا رواج تھا اور نہ ہی اپنی من مرضی سے یوں بیکاری داڑھیاں بڑھا لینے کی اجازت تھی.. چنانچہ یہ جوئیں جو ارباط سٹریٹ کے مکینوں کی گھنی داڑھیوں میں قیام پذیر تھیں' دراصل روس کی نئی آزادی کی ایک رینگتی ہوئی علامت تھیں..

یہاں متعدد ایسے موسیقار تھے جو یا تو گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے اور یا کچھ نہ کچھ بجا رہے تھے.. اور کچھ گاتے بھی تھے اور بجاتے بھی تھے اور جب ان کے بچھائے ہوئے کپڑے پر مناسب تعداد میں سکے گر جاتے تھے تو وہ انہیں سمیٹ کر ایک اور بیئر خرید کر اس کے گھونٹ بھرتے پہلے سے کہیں بہتر سُر میں ہو جاتے تھے.. یہ کس حد تک نیویارک کے فٹ پاتھوں اور خاص طور پر ٹائمز سکوائر میں پرفارم کرنے والے موسیقاروں کی روایت پر عمل پیرا تھے..

یہاں اس سٹریٹ میں جتنے بھی لوگ.. ہم جیسے سیاح.. ماسکو میں پہلی بار آنے والے دور دراز شہروں اور قصبوں کے روسی اور مقامی شائقین چل پھر رہے تھے تو وہ سب نہایت سستی اور کاہلی اور بے مقصدیت کے تابع حرکت کرتے تھے کہ یہاں کسی کو کچھ بھی کام نہ تھا سوائے ایک بے وجہ آوارہ گردی کے.. دستکاریوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے.. غیر معروف مصوروں کی فٹ پاتھ پر سجی نمائشوں کو پرکھنے کے اور جب تھکاوٹ غالب آ جائے تو ارباط کے متعدد معروف قہوہ خانوں اور ریستورانوں میں سما جانے کے..

پرانی ارباط کی عمارتیں بھی پرانی تھیں.. اور ان میں جو قہوہ خانے اور ریستوران پوشیدہ تھے ان کے ڈھنگ بھی نرالے تھے.. فرنیچر بوسیدہ تھا اور دیواروں کا پلستر ادھڑتا تھا لیکن ان کی قیمتیں ماسوائے چند ایک کے ہرگز بوسیدہ نہ تھیں..

میمونہ ارباط کے عین درمیان میں ایستادہ دستکاریوں اور تصویروں کے متعدد کھوکھوں میں جھانک چکی تھی.. ہر شے کو پرکھ چکی تھی اور نہایت باریک بینی سے ملاحظہ کر چکی تھی اور پھر اس نے وہی بات کی جو باطہ میرے دل میں بھی تھی..

یہ ایک حیرت انگیز اور پرتاسف حقیقت تھی کہ روس ایسا عظیم دیس آرٹ کرافٹ اور دستکاریوں کے معاملے میں بہت ابتدائی' بے کشش اور غریب تھا.. نہ صرف یہاں ارباط میں بلکہ روس بھر میں جہاں کہیں بھی ہمارا جانا ہوا' وہاں دستکاریوں کے سٹالوں پر کوئی ایک شے ایسی نہ تھی جو آپ کا دل موہ لے اور کہے کہ تم مجھے لے جاؤ اور اپنے ڈرائنگ روم یا سٹڈی میں سجا لو اور مجھے

دیکھ کر تمہیں روس یاد آیا کرے گا.. البتہ کچھ ایسے بوکس تھے جن کے ڈھکنوں پر منقش دل آویز تصویریں تھیں اور ان کی قیمتیں ہوشربا تھیں اور پھر گڑیائیں تھیں.. شوخ رنگوں میں رنگی.. بڑی گڑیا میں سے ایک گڑیا برآمد ہوتی تھی اور اس میں سے ایک اور گڑیا.. کل پانچ گڑیائیں ایک بڑی گڑیا کے پیٹ میں سے برآمد ہوتی تھیں.. اگرچہ ان سب میں سے چھوٹی اور آخری گڑیا ایسی ہوتی تھی کہ میں نے اسے اپنے چھ ماہ کے پوتے کے لیے دلہن کے طور پر چن لیا تھا.. لیکن ان کے سوا دل کو کوئی اور دستکاری نہ چھوتی تھی..

روس.. دنیا کے ایسے خطوں میں شمار ہوتا ہے جس کے باسی ذوق جمال رکھنے والے ہیں.. دوستووسکی کے کسی ناول کے نئے ایڈیشن کو حاصل کرنے کے لیے سارا دن ایک قطار میں کھڑے رہتے ہیں.. بالشوئی تھیٹر کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے بھوکے رہ سکتے ہیں... اپنے اکارڈین پر نہ صرف چائے کوسکی بلکہ "آوارہ ہوں" کی دھن الاپ کر جذباتی ہو سکتے ہیں تو وہی روسی دستکاریوں.. سوونیئرز اور مقامی ثقافت کے اظہار کے بارے میں اتنے تہی دامن کیوں ہو جاتے ہیں.. آپ ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کے ملک نیپال میں چلے جائیں تو وہاں اتنا کچھ آپ پر اثر کرے گا کہ آپ بے بس ہو کر بے تحاشا خریداری کرنے لگیں گے.. اطالیہ.. ہسپانیہ.. مراکو اور مصر کی تو بات ہی کیا' آپ اپنے سوات میں صرف خوازہ خیلہ کے قصبے میں چلے جائیں تو وہاں آپ کو کیسے کیسے منقش اور بہت قدیم ستون.. دروازے.. جائے نماز.. صندوق.. تلواریں.. خنجر.. زیور.. اور ملبوسات ملیں گے.. ایسے کہ آپ اپنے آپ کو لٹا دیں گے.. لاہور کے کسیرا بازار میں آپ آسانی سے مغل عہد کا ایک پیالہ تلاش کر سکتے ہیں اور پشاور کی شنواری مارکیٹ میں.. سینکڑوں دکانوں میں ہزاروں ازبک.. ایرانی.. افغانی.. زیور.. قالین اور منقش دستکاریاں ایسی ہوں گی کہ آپ ہر ایک کو دل دے بیٹھیں گے..

مجھے روس کی یہ کم مائیگی اور غربت سمجھ میں نہ آ سکی..

پورے ماسکو میں میں نے کہیں بھی کسی سوونیئر شاپ پر کوئی ایک ایسی ٹی شرٹ نہ دیکھی جس پر اس شہر کی کسی یادگار عمارت.. سرخ چوک کی شبیہہ ہو یا اس پر "آئی لو ماسکو" لکھا ہو.. یا جیمز بانڈ کی فلم "فرام رشیا ود لو" درج ہو.. ماسکو والے بے شک سرمایہ دارانہ نظام کے سمندر میں دھم سے کود تو گئے ہیں پر ابھی انہیں سیاحوں اور غیر ملکیوں کو لبھانا نہیں آیا.. اپنے شہر کو فروخت کرنا نہیں آیا..... میمونہ نے ایک سٹال پر رک کر ایک خصوصی روسی سمور کی ٹوپی میں کچھ دلچسپی لی.. پچاس برس

پیشتر تقریباً ایسی ہی خصوصی روسی ٹوپی اسی شہر میں مجھے تحفے کے طور پر عطا کی گئی تھی جو وطن واپسی پر کسٹم کے کسی اہلکار نے میرے سامان میں سے اچک لی تھی اور وہ اہلکار بعد میں کیسا پچھتایا ہوگا کہ پاکستان کی شدید ترین سردیوں میں بھی وہ ٹوپی اوڑھنے سے پسینے کے دریا بہہ نکلتے ہوں گے۔۔

میمونہ کی دلچسپی بنیادی طور پر اس لیے تھی کہ اس نے "ڈاکٹر ژواگو" میں وحشی بدن کی بھڑکتی نیلی آنکھوں والی جولی کرسٹی کو ایک ایسی ہی ٹوپی سر پر جمائے دیکھا تھا۔۔اور جب بارِیش دکاندار نے اس کی قیمت تقریباً سات ہزار پاکستانی روپے بتائی تو میمونہ نے ناک چڑھا کر کہا۔۔ "دفع کرو۔۔ پاکستان میں اتنی سردی تو نہیں ہوتی۔۔"

ارباط سٹریٹ میں چلتے ہوئے ہمیں پوشکن اور اس کی بیوی کے مجسمے نظر آئے اور حسب روایت ان کے قدموں میں بھی پھول پڑے تھے۔۔لیکن پوشکن کا گھر کہاں تھا۔۔وہ بھی قریب ہی تھا لیکن سیاحوں کے لیے اس کے دروازے بند کر دیے گئے تھے کیونکہ ہم دیر سے پہنچے تھے۔۔گھر معمولی سا دکھائی دیتا تھا۔کھڑکیاں مقفل تھیں۔۔

بہت روز بعد جب لڈمیلا کے ہاں ایک یادگار شام اختتام کو پہنچ رہی تھی تو میں نے اُس عاشقِ فیض سے کہا کہ میلا مجھے بہت قلق ہے کہ میں ارباط میں پوشکن کے گھر کے اندر نہیں جا سکا تو اس نے اپنی شراروں بھری مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے کہا۔۔ "آپ کو ہرگز قلق نہیں ہونا چاہیے کہ اس گھر میں پوشکن کا قیام نہایت مختصر تھا اور اس کا فرنیچر بھی نقل مطابق اصل ہے۔۔ پوشکن تو سینٹ پیٹرزبرگ رہتا تھا۔ سارے راستے سینٹ پیٹرزبرگ یا ہمارے زمانوں کے لینن گراڈ جاتے تھے۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نہ صرف مصوری، ادب اور موسیقی بلکہ اعلیٰ ترین جمالیات کے تمام دریا پیٹرزبرگ کے سمندر میں گرتے تھے۔۔ یہاں تک کہ دنیا کا عظیم ترین عجائب گھر ہرمے تاژ جسے دیکھنے کی آرزو ایک مدت سے چلی آتی تھی وہ بھی ادھر تھا۔۔ بقول میلا اگر اس عجائب گھر کے تمام ہال۔۔ کمرے اور قصر کھلے ہوں اور آپ ان میں سے ہر ایک میں صرف جھانکیں تو دو ہفتے گزر جائیں گے۔۔ جب دوستووسکی کا تذکرہ چلا تو وہاں بھی میلا نے کہا' او ہو تارڑ صاحب وہ بھی سینٹ پیٹرزبرگ رہتا تھا۔ آپ جب جائیے گا تو وہاں ایک خصوصی ٹور "دوستووسکی ٹور" نام کا ہے اور آپ کو ہر اس مقام پر لے جایا جاتا ہے جہاں دوستووسکی جایا کرتا تھا۔۔ آپ وہ کمرہ بھی دیکھ سکیں گے جس میں اس نے "کرائم اینڈ پنشمنٹ" تحریر کیا تھا۔۔"

میں کچھ عرصہ تک پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کا اعزازی ڈائریکٹر بھی رہا ہوں' جہاں

سالانہ بجٹ یا مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں تو میرے دستخط حاصل کر لیے جاتے تھے لیکن سیاحت کی ترویج کے لیے اگر میں اپنی محدود دانش کے مطابق کوئی مشورہ دیتا تھا تو اسے قبول تو فوری طور پر کر لیا جاتا تھا لیکن اس پر عمل کبھی نہ ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک درخواست یہ بھی تھی کہ لاہور شہر میں جتنے بھی نابغۂ روزگار مقیم ہوئے' ان کے حوالے سے سیاحتی ٹور ترتیب دیے جائیں۔۔ ان میں سرفہرست تو علامہ اقبال ہوں گے۔۔ کن گھروں میں ان کا قیام ہوا۔۔کون سے مقامات پر انہوں نے کیا لکھا۔۔ان کی سیر کا معمول کیا تھا۔۔ حقے کا تمباکو کہاں سے خریدتے تھے۔۔گانا سننے کہاں جاتے تھے وغیرہ۔۔علامہ اقبال کے علاوہ میں نے ایسے ٹورز کے لیے "استاد بڑے غلام علی خان ٹور"۔۔ "رستم زماں بھولو پہلوان ٹور"۔۔ "عبدالرحمٰن چغتائی ٹور"۔۔ "سعادت حسن منٹو ٹور" اور "راجندر سنگھ بیدی ٹور" شروع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ ان نادر ہستیوں کے نقش قدم پر چلنے کو پسند کرتے۔۔ چنانچہ تمام راستے سینٹ پیٹرزبرگ کو ہی جاتے تھے اور ہم لاہور سے ہی فیصلہ کر کے آئے تھے کہ ہم نے بھی بہر طور ان راستوں پر چلنا ہے۔۔

لیکن فی الحال ہم ارباط میں تھے اور پوشکن کے گھر کے سامنے تھے اور اس کا گیٹ مقفل ہو چکا تھا۔ ارباط سٹریٹ کی بے شک کیا بات تھی۔۔ بہت پرکشش اور قدامت بھری اور عاشقانہ تھی لیکن یہ ضرورت سے زیادہ طویل تھی اور اس میں پیدل چل چل کر حشر ہو جاتا تھا۔۔ چنانچہ ایک بار چلنے کے بعد دوسری بار چلنے کی ہوس نہیں رہتی تھی۔۔

چونکہ ہم پوشکن کے گھر نہیں جا سکے تھے اس لیے ہم ارباط سے نکل کر پوشکن سکوائر چلے گئے اور وہاں ایستادہ عین جوانی کے عالم میں ایک ڈوئل میں ہلاک ہو جانے والے۔ بے مثال شاعر اور کہانی کار کے پرشکوہ نپولین کی مانند اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈالے مجسمے کے قریب ہو ہو کر چند تصویریں اتروائیں۔۔ اس کے سر پر ایک پرندہ براجمان تھا۔۔ اور جب بھی وہ پھڑ پھڑاتا تو زندہ لگتا ورنہ وہ بھی پتھر کا تراشیدہ ہی معلوم پڑتا۔۔

پوشکن سکوائر ماسکو میں میل ملاقات کا رومانوی معبد ہے۔۔ بڑے بوڑھوں کے لیے اونگھنے اور دنیا کا تماشا دیکھنے کے لیے بہترین مقام ہے۔۔ اگر آپ کا محبوب بے ایمان نہیں ہے تو وہ آسانی سے یہاں پہنچ سکتا ہے۔۔ مجسمے کے قدموں تلے متعدد ایماندار محبوب منتظر دکھائی دیتے ہیں اور اس سے ملحقہ باغ میں ایستادہ نشست گاہوں پر متعدد جوڑے بے اختیاری سے ذرا ادھر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں ملتے ہیں۔۔

شاید.. گزرے تھے ہم یہاں سے..

ایک موہوم سی یاد کے سائے تیرتے تھے.. یاد تھی یا محض تصور کے تماشے تھے اس کا تعین نہیں ہو رہا تھا کہ پچاس برس گزر چکے تھے.. عمر کے تالاب کی سطح پر کائی کی دبیز تہہ تھی اور نیچے پانیوں میں اگر کبھی کوئی کنول کھلے تھے تو ان کا سراغ نہ ملتا تھا.. پھر جو مٹ چکا تھا وہاں کچھ نقش ابھرنے لگے' ایک اندھی سی تصویر نظر آنے لگتی ہے کہ رات کا پچھلا پہر ہے' صبح کی سفیدی نمودار ہونے کو ہے اور پستہ قد لینا ایک گھیرے دار فراک میں کھلی کھلی میرے ہمراہ ہے اور میں اسے اس کے ہوسٹل چھوڑنے جا رہا ہوں.. اور چلتے چلتے نیم تاریکی میں پوشکن کا مجسمہ ظاہر ہو رہا ہے.. اور میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے گمان ہے کہ وہ رکتی ہے.. رات کے اس پہر ٹھنڈک بڑھ چکی ہے اور ہم دونوں ذرا ٹھٹھرتے ہیں.. محسوس کرتے ہیں کہ بدن میں سردی سرایت کرتی ہے اور وہ پوشکن کے مجسمے کی جانب دیکھتی ہے اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر روسی میں کچھ کہتی ہے.. پوشکن کی کوئی نظم دہراتی ہے.. نہ میں روسی سے اس حد تک واقف ہوں اور وہ تو انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتی.. اور وہ کوئی ایک مصرعہ ادا کر کے مجسمے کی جانب اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے.. پوشکن..!

پوشکن سکوائر کے پار ایک خاموش اور پرکشش ماحول کا ایک قہوہ خانہ ہے جسے تانیا جاتی ہے.. مونا ایک جھاگ بھری کافی کا پیالہ نہایت اشتیاق سے سُڑکتی ہے.. تانیا بغیر دودھ کے کافی کا ایک گاڑھا محلول بخوشی حلق میں سے اتارتی ہے اور میں ایک اجنبی لیکن بھرپور ذائقے والا سوپ پیتا ہوں اور اس کے ہمراہ ایسی گرم ڈبل روٹی کھاتا ہوں جس پر مکھن لگتے ہی پگھلنے لگتا ہے..

اس قہوہ خانہ سے باہر قدم رکھا ہے تو اب تک ماسکو میں نظر آنے والی سب سے الفت بھری' خزاں رنگ کے بھورے دبیز بالوں والی نہایت فربہ اور پرکشش شکل نظر آ جاتی ہے... اور یہ شکل بُھلائے نہیں بھولتی اور میں آج تک اس کے عشق میں مبتلا چلا آتا ہوں.. اور یہ ایک بھالو نما' نہایت وسیع تن و توش والا.. بھورے بالوں میں ڈھکا ہوا ایک کتا سا تھا.. اور اس کے ہمراہ اس کی جو مالکن سی تھی وہ بھی اس ریچھ نما کتے سے کم فربہ اور کم پلی ہوئی نہ تھی.. برابر کا جوڑ تھا..

میں مبالغہ نہیں کر رہا.. اس شاندار کتے کو دیکھنے کے بعد یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسان رنج و غم میں ڈوبا رہے کہ وہ آپ کو ایک انوکھی روحانی مسرت سے دوچار کرنے والا کتا تھا..

اس بھورے کتے نے اپنی مالکن کی چھتری دانتوں میں داب رکھی تھی اور مجھے یقین ہے

کہ بارش اترنے کی صورت میں وہ اسے باقاعدہ کھول کر مالکن کو پیش کر دیتا ہوگا..

ایسے شاندار کتے بار بار آپ کی قسمت میں نہیں آتے اور اگر آپ ٹھہر کر انہیں پیار نہیں کرتے' ان کی گردن میں گھگلی نہیں کرتے تو آپ کیسے بدقسمت ہیں..

مونا.. ہمیشہ سے کتوں کی شیدائی رہی ہے.. اس نے میری نسبت کتوں پر اپنا پیار زیادہ نچھاور کیا ہے.. نہایت مذہبی ہونے کے باوجود وہ کسی خوشنما کتے کو تھپکی دیے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ کہتی ہے کہ اگر اصحاب کہف کا ساتھ قرآن پاک کے مطابق ایک کتے نے دیا تھا' ان کا ساتھی رہا تھا تو وہ کیسے نجس ہو سکتا تھا.. چنانچہ وہ اس بھورے بھالو نما کتے کو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگئی اور اس کی خوشگوار خصلت کی مالکن سے کہنے لگی.. ''کیا میں آپ کے کتے کو پیار کر لوں..؟''

اور وہ عورت کھل اٹھی.. ''انڈین..؟''

''نہیں نہیں.. پاکستانی.. اور بہت ہی پاکستانی..''

مونا نے اس نہایت مطیع بھورے کتے کے سر پر پیار دیتے ہوئے اسے پچکارا.. لب یوں سکیڑے جیسے اسے چوم رہی ہو.. اس بھورے کتے کی خوش بختی پر کسے شک ہو سکتا ہے کہ مونا نے آج تک یکسر تنہائی میں بھی مجھے دیکھ کر کبھی اس انداز میں لب نہ سکیڑے تھے..

کتے تیتھوں اُتے..!

تیرھواں باب

''سفید راتیں..ماسکو کی سفید راتیں''

یہ راتیں..یہ موسم..یہ ہنستا ہنسانا..انہیں نہ بھلانا..
یہ ماسکو میں منّا ڈے کیا الاپ رہا ہے کہ یہ راتیں..
کون سی راتیں..کیسی راتیں..

کینیڈا کی دور افتادہ یوکان وادی کے ایک قصبے میں جہاں کسی زمانے میں سونے کے پجاری آیا کرتے تھے اور جن ہوٹلوں میں گزر اوقات کرتے تھے ہم ایک ایسے ہی ہوٹل میں شب گزارتے تھے تو اس قدیم لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے چرچراتے ہوٹل میں جو ایک باتونی اور بھولی خاتون کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی کمروں کی چابیاں تفویض کرتی تھی اور ساتھ ساتھ آپ کو اطلاع کرتی چلی جاتی تھی کہ بس دو تین ماہ تک میرا بچہ باہر آنے والا ہے تو وہی خاتون نصف شب کی قربت میں ہمارے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ پیٹ رہی ہے کہ باہر آؤ باہر آسمان پر شمالی روشنیاں اپنے رنگ بکھیرتی بھڑک رہی ہیں..

اور ہم باہر..ایک سنسان کچی گلی میں آتے ہیں تو آسمان پہ آج تک نہ دیکھی گئی عجیب رنگوں کی روشنیاں تیرتی اور بکھرتی ہیں..وہ بے یقینی اور واہمے کا ایک منظر تھا..ہم تاریکی میں تھے اور آسمان پر ایسے رنگ لہراتے اور دہکتے تھے جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتے..

اور اس لمحے یوکان وادی کے آسمانوں پر پرواز کرتی ایک کونج نے سرگوشی کی ''اگر تم میرے ساتھ پرواز میں شامل ہو جاؤ تو ہر شب تم ایسی ہی انہونی اور ان دیکھی روشنیاں دیکھو گے..لیکن میں دیکھ سکتی ہوں کہ تم میں خواہش تو شدید ہے پر ارادہ ساتھ نہیں دیتا..تم بہت جکڑے ہوئے ہو..''

کونجیں عام طور پر بہت بے وقوف ہوتی ہیں..
وہ نہیں جانتیں کہ عمر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کرتی..بال و پر جھڑ جاتے ہیں اور پرواز کے قابل نہیں رہتے..خواہش یا ہوس تو رہتی ہے پر طاقت پرواز نہیں رہتی..
تو کچھ راتیں..ایسی بھی ہوتی ہیں..شمالی روشنیوں کی انوکھی اور ان دیکھی راتیں!
اور کچھ راتیں چاندنی کی ہوتی ہیں..سب جگ سوئے ہم جاگیں تاروں سے کریں باتیں..
ایسی بھی ہوتی ہیں..
اور چندا تیری چاندنی میں جیا جلا جائے رے والی راتیں بھی ہوتی ہیں..
اور یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں والی راتیں بھی تو ہوا کرتی ہیں..
تو کیا یہ راتیں وہ ہو سکتی ہیں..شب دیجور کی مانند سیاہ راتیں..
آخر یہ کون سی رات ہو سکتی ہے..شب ہجر کی جو طول پکڑتی جاتی ہے یا شب وصال کی جو مختصر ہوتی جاتی ہے..یا پھر یہ ظلم کی ایک شب ہو سکتی ہے جس کے بارے میں ظہیر کاشمیری نے کہا تھا کہ..

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

تو کیا ایسی تمام شبوں کے سوا کوئی اور شب کوئی اور رات ہو سکتی ہے..
ہو سکتی ہے..
ایک سفید رات..
رات تو ہمیشہ سیاہ ہوتی ہے تو وہ سفید کیسے ہو سکتی ہے..؟
ہو سکتی ہے..
ایک سفید رات..!
میں پہلی بار جب لنڈن سے لفظوں کی خیرات وصول کرتا سٹاک ہوم کی قربت میں جا پہنچا تھا تو وہاں ہر سو روشنی تھی' عمارتوں کی آخری منزلوں پر دھوپ ٹھہری ہوئی تھی اور جیسے سب جگ سوئے ہم جاگیں..ایسے اس دھوپ اور روشنی میں پورے سٹاک ہوم کا جگ سویا ہوا تھا..

اس لیے کہ رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور پھر بھی ہر جانب روشنی تھی..

ماگریتا کے فلیٹ میں بھی تقریباً چوبیس گھنٹے اجالا تھا..

کہیں دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا اور ادھر سویڈن میں رات کو بھی دن کی سفیدی کا سماں ہوتا تھا.. اور یہ مسلسل روشنی آپ کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے.. آپ کی آنکھوں کو سفید کر دیتی ہے.. آپ کا بدنی نظام ایک وال کلاک کی مانند ٹک ٹک کرتا رہتا ہے اور امید کرتا ہے کہ اب اگر روشنی ہے تو اس کے بعد تاریکی آئے گی اور وہ آتی نہیں اور الجھن شروع ہو جاتی ہے.. میں ماگریتا کے فلیٹ میں جاتا اور سرِ شام بھی جاتا تو وہاں ہر سو چکاچوند ہوتی اور میں پردے آگے کر کے مسلسل سرایت کرتی روشنی سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرتا اور وہ فوراً پردے پھر سے وا کر دیتی اور فلیٹ میں پھر سے قلعی کی سفید کوچی پھر جاتی..

".. تم لوگ گرمیوں میں آئے ہو اور نہیں جانتے کہ موسمِ سرما کے چھ ماہ یہاں مسلسل تاریکی رہتی ہے اور ہم روشنی کو ترس جاتے ہیں.. روشنی کو آنے دو".. چنانچہ یہ خطے ایسے تھے کہ موسمِ گرما میں کم از کم یہاں چاندنی راتیں نہ ہوتی تھیں اور نہ ہی تاروں سے باتیں ہوتی تھیں کہ راتیں بھی سفید اور ان کا آسمان بھی سفید..

لاہور میں ذخاروف نے حسبِ عادت میرا نام چبا چبا کر ادا کیا اور کہنے لگا..

مسٹر.. مستانسر.. آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے کہ جن دنوں آپ ماسکو میں ہوں گے تو وہاں سفید راتیں ہوں گی..

چونکہ میں نے دوستووسکی کا ناولٹ "سفید راتیں" پڑھا تھا اس لیے میرے اندر ایک پُرشوق ہیجان نے جنم لیا کہ واہ.. وہائٹ نائٹس..!

وہ ماسکو میں میری پہلی شب تھی..

میری آنکھ کھلی تو بلند کھڑکی کے کھلے پردوں میں فریم شدہ شیشہ سفید ہو رہا تھا.. باہر روشنی ہو چکی تھی.. سفر کی تھکاوٹ کے باعث شاید یہ رات لمحوں میں گزر گئی تھی اور سویرا ہو چکی تھی..

میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا تو ابھی ڈھائی بجے تھے..

باہر ایک رات تھی جو سفید تھی..

کیسی رات تھی کہ ہر شے ہر عمارت اور ہر شجر کو برہنہ کر رہی تھی.. کچھ بھی پوشیدہ نہ کرتی

تھی اور اس سفید رات میں ایک عجیب سا خوف تھا کہ باہر روشنی کے باوجود ہر سو ویرانی تھی.. شاہراہیں خالی.. فٹ پاتھ ویران.. نہ آدم نہ آدم زاد..

پھر میں سو نہ سکا..

مجھے آنکھیں بند کر کے نیند میں اترنے کے لیے کمرے میں مکمل تاریکی درکار ہوتی ہے.. اور یہاں ہر سو روشنی تھی تو میں کیسے سو سکتا تھا..

ماسکو میں جتنی راتیں آئیں سب کی سب سفید آئیں.. بلکہ ہر اگلی رات پہلے سے زیادہ سفید ہو جاتی.. میں سونے سے پیشتر سویٹ کی تمام کھڑکیوں کو نہایت احتیاط سے پردوں سے ڈھک دیتا اور اس کے باوجود دو تین گھنٹوں کی نیم تاریکی کے بعد ان میں سے بھی روشنی بہتی ہوئی اندر آ جاتی..

پہلی شب جب سفیدی نے مجھے سونے نہ دیا تو نیم غنودگی' جاگتے' آنکھیں بند کرتے' کھولتے ذہن میں انہونے خیال ہولے ہولے گردش کرنے لگے.. ایک ایسی ہی کیفیت میں' نہ سوتے' نہ جاگتے مجھے "بہاؤ" کا مرکزی خیال سوجھا تھا.. تو نیند کی اس دھند میں اور بیداری کی سفیدی کے درمیان بھٹکتے مجھے یہ خیال آیا کہ ایک ناول ایسی سفید راتوں کے بارے میں بھی تو لکھا جا سکتا ہے.. سفید راتوں کا ایک تسلسل ہے اور اس میں لوگ بھٹک رہے ہیں.. انہیں راستے نہیں سوجھتے.. سفیدی نے انہیں تقریباً نابینا کر دیا ہے اور وہ تاریکی کی خواہش کرتے ہیں.. اور اس ناول میں وصل کی راتوں کا بیان ہو تو اس میں الفت' ہیجان اور بدن کی شدت کی کیسی کیسی تصویریں سفیدی میں عیاں ہو سکتی ہیں.. چہرے کا کھنچاؤ.. بے اختیار ابال.. لذت کی بجائے اذیت کی لکیریں.. اور وہ آوازیں جو صرف سنائی دیتی ہیں وہ دکھائی دینے لگیں.. بے اختیاری کے جانور سانس جو صرف محسوس نہ کیے جائیں بلکہ عیاں ہو جائیں تو یہ کیسا انوکھا اور سفید شب وصال کا ایک نیا رُخ ہوگا..

وارث شاہ نے کیسا سچ بیان کیا تھا کہ یہ عمر ہونے کو آئی ہے پر طبع پھر بھی حرص سے باز نہیں آتی..

میں ماسکو کے گلی کوچوں میں سامنے سے آتی کسی خوش بدن اور خوش آثار خاتون کو دیکھ کر اب بھی بھٹک جاتا تھا.. خاص طور پر اگر اس کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں تو.. اور یہی سوچتا کہ میرے قریب سے گزر کر ماسکو کے ہجوم میں کب کی معدوم ہو چکی خاتون اگر میرے ناول کی ایک

سفید رات میں ہوتو میں اس کے آثار کیسے بیان کروں گا.. طبع حرص سے باز نہ آتی تھی..

یہ تصوراتی ناول ایک عمر رسیدہ حریص دماغ کا فتور تھا جوان سفید راتوں میں بے قابو ہو کر مجھے بے راہ رو کرتا تھا اور سونے نہ دیتا تھا..

ان سفید راتوں میں اگر آثار بھی سفید ہوں تو انہیں کیسے بیان کیا جائے..!

چودھواں باب

''پوشکن میوزیم' جہاں پوشکن نہیں تھا''

پوشکن نے ایک مرتبہ پھر ہمارے ساتھ دھوکہ کیا تھا..

المیہ یہ ہوا کہ میرے تصور میں قدرتی طور پر جو تصویریں ابھریں..ان میں فلورنس میں دانتے کا گھر تھا جہاں اس کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کے مسودے نمائش پر تھے..مائیکل انجلو کا گھر تھا.. ایمسٹرڈیم میں ریمبرانت کا مصور خانہ تھا یا ورڈز ورتھ کا ''ڈوکاٹیج'' تھا جہاں داخل ہوتے ہی آپ اس کی موجودگی کے سانس محسوس کرنے لگتے ہیں..میرے ان حوالوں میں اگر اپنے وطن کے ادیبوں یا مصوروں کا فقدان ہے تو اس میں میرا کچھ دوش نہیں کہ ہمارے ہاں ایسے نابغۂ روزگار لوگوں کو اوّل تو باعزت ہی نہیں سمجھا جاتا اور اگر بادل نخواستہ انہیں قبول کر لیا جاتا ہے تو بھی ان کے آبائی گھروں کو محفوظ کرنے کی بجائے اس رقم سے کوئی عبادت گاہ یا مدرسہ تعمیر کر دیا جاتا ہے..یعنی اگر لکشمی مینشن میں میرے بچپن کے ''دوست'' سعادت حسن منٹو کا ایک میوزیم ہوتا..یا راجندر سنگھ بیدی کا وہ ڈاکخانہ محفوظ کر لیا جاتا جہاں وہ ڈسکہ سے لاہور آ کر خطوں پر مہریں لگایا کرتا تھا..یا امرتا پریتم کا وہ گھر جہاں میرے بہت محترم پنجابی کے بے مثل ڈرامہ نگار جاتے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے تھے کہ کب امرتا آئے اور وہ اس کا دیدار کر سکیں..عبدالرحمٰن چغتائی ہر شام اپنے مصور خانے سے نکل کر اندرون شہر کے جس حلوائی سے گلاب جامن خرید کر انہیں راستے میں ہی کھاتے چلے آتے تھے وہ دکان..یا پھر وہ فلیٹ جو شاید گنگا رام مینشن میں تھا جہاں ایک ہنگیرین ماں اور سکھ باپ کی بیٹی اداس چہرے مصور کرنے والی امرتا شیرگل جو ایک شب سرما آتش دان کے سامنے ایک اجنبی شخص کے سامنے عیاں ہو گئی تھی کہ وہ بدن کی آگ کو برداشت نہ کر سکتی تھی..اور یہ فہرست قدرے طویل ہے اس لیے ہم پوشکن کی جانب لوٹ آتے ہیں..

"پوشکن میوزیم" کی جانب بڑھتے ہوئے.. مونا اور تانیا کے ہمراہ اگر میں ایک آتش شوق میں سلگتا تھا تو صرف اس لیے کہ.. میں وہاں اس کے مسودے دیکھوں گا.. جس میں شاید "کوئین آف سپیڈز" بھی شامل ہو.. اس کی شاعری اس کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی دیکھوں گا جیسے میں نے نیویارک میں والٹ وٹ مین کی "لیوز آف گراس" دیکھی تھی.. اور شاید وہاں وہ پستول بھی محفوظ ہو جس میں سے نکلنے والی گولی سے وہ ایک ڈوئل کے دوران ہلاک ہو گیا تھا..

میوزیم کے اندر داخل ہوتے ہوئے ہماری خوب خوب تلاشی ہوئی.. کوئی نوکدار شے.. کوئی چاقو.. کوئی چھتری.. کہ شاید آپ مصوری کے شاہکاروں پر حملہ آور ہو جائیں.. یہاں تک کہ میرا معصوم سا سیاہ بیگ بھی رکھوا لیا گیا کہ اس میں کوئی چھوٹی سی تصویر چھپا کر چمپت ہوا جا سکتا تھا..

بالآخر جب ہم اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو وہاں تہذیب انسانی کے بیشمار باب نمائش پر تھے.. کیا مصوری اور کیا مجسمہ سازی اور کیا فن تعمیر اور کیسے کیسے نوادرات.. اور یونانی معبد اور مصری مقابر.. کیا کچھ نہ تھا.. بس پوشکن نہ تھا..

یہاں تک کہ مائیکل انجلو کا "ڈیوڈ" بھی وہاں موجود تھا اگرچہ اصل نہ تھا نقل بہ مطابق اصل تھا اور پھر بھی اپنی اہلیہ اور ایک نوجوان لڑکی کی موجودگی میں ان حضرت داؤد کو قدرتی حالت میں ایک نظر دیکھنے سے بھی ذرا شرمندگی ہوتی تھی..

اور جب ہم بہت یونان اور بہت جاپان وغیرہ دیکھ چکے اور پوشکن کہیں نظر نہ آیا تو تانیا نے بتایا کہ مستنصر یہ میوزیم جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں تہذیب انسانی کے ارتقا کی ایک داستان ہے.. اور اس کا نام "پوشکن میوزیم" اس لیے ہے کہ ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں کے نام پر ہی اپنے عجائب گھروں کے نام رکھتے ہیں.. مثلاً یہاں ایک ٹالسٹائی میوزیم بھی ہے اور وہاں ٹالسٹائی سے متعلق تو کوئی شے نہیں ہے..

اس چلبلی بچی نے اگر ہمیں پہلے سے یہ معلومات فراہم کر دی ہوتیں تو ہم ہرگز ادھر کا رخ نہ کرتے..

تانیا پر جب میری مایوسی آشکار ہوئی تو وہ کہنے لگی.. "ابھی تو آپ نے اس میوزیم کا آغاز ہی دیکھا ہے.. یہ بہت بڑا ہے اور اس میں پکاسو اور گوگین کی تصاویر بھی آویزاں ہیں تو ہم وہ دیکھ سکتے ہیں.."

"تانیا.. میں یہ سب کچھ نیویارک کے میٹروپالیٹن میں نہایت کثرت سے دیکھ چکا ہوں.. میں تو یہاں پوشکن کو دیکھنے آیا تھا.. اور اگر وہ یہاں نہیں ہے تو.. یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے.. تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے.. آؤ چلیں..!

پندرھواں باب

''ماسکو کی سات بہنوں سے ملاقات''

کسی بھی اجنبی شہر میں وارد ہو کر مناسب یہ ہوتا ہے کہ آپ سب سے پہلے اس شہر کا ایک ''گنڈ کنڈ ٹور'' کریں.. دو تین گھنٹوں میں ایک کوچ پر سوار شہر کے اہم مقامات کو گزرتے دیکھیں اور ایک چرب زبان گائیڈ کی گفتگو سے بیزار ہو جائیں اور پھر بعد میں جو مقام آپ کے دل کو لگتے ہوں.. وہاں اطمینان سے جائیں اور انہیں تفصیل سے دیکھیں..

ماسکو میرے لیے تو اجنبی نہ تھا البتہ مونا کے لیے تھا چنانچہ ہم نے تانیا کے مشورے کے مطابق ایک ایسے ٹور کے لیے ہاں کر دی..

روس اگرچہ دل و جان سے کمیونزم سے توبہ تائب ہو چکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام سے بے تحاشا ہم آغوش ہوتا چلا جا رہا ہے.. لیکن اس کے دل اور جان ابھی تک اس نظام کی لاپروائی اور بے ترتیبی میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان میں تنظیم اور سہولت کا فقدان ہے.. ان کا جو سیاحتی نظام ہے وہ بھی حیدرآباد کا آخری نظام ہے یعنی بے بس اور ناکارہ ہے..

سرخ چوک کے ایک کونے میں نو تعمیر شدہ کلیسا کے سامنے ایک موٹی سی خاتون منہ پر ایک لاؤڈ سپیکر جمائے مسلسل اعلان کیے جا رہی ہیں کہ آئیے.. صاحبان آئیے.. ماسکو شہر کا تفصیلی دورہ ایک شاندار آرام دہ کوچ میں کیجیے.. فوراً ٹکٹ خریدیے.. صرف بارہ ڈالر میں خریدیے.. مجھے یہ انداز قدرے دھمکی آمیز لگا کہ اوئے آتے ہو کہ نہیں.. ورنہ بلاؤں کے جی بی کو.. اس موٹی خاتون کی نسبت تو ہمارے لاہوری تانگے والے بہتر اور مؤدب آوازے لگاتے ہیں کہ ہے کوئی سٹیشن کی سواری..؟ باؤ جی آجاؤ.. بھاجی بسم اللہ..

تانیا نے ہمارے لیے تفویض کردہ روبلوں کے فنڈ میں سے دو بجے روانہ ہونے والی

کوچ کے تین ٹکٹ خرید لیے..

ابھی ساڑھے بارہ کا وقت ہوا تھا تو اس دوران کیا کریں.. پیٹ پوجا کریں اور کیا کریں..

چنانچہ ہم نے ایک اور بدسواد کھانا کھایا اور پیٹ نے بھی احتجاج کیا کہ تم میری یہ پوجا کر رہے ہو..

پورے دو بجے اسی موٹی خاتون نے سرخ چوک میں جمع ہو چکے سیاحوں کو ایک نازی جرنل کی مانند حکم دیا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ.. اور ہم چلتے گئے.. فرماں بردار بھیڑوں کی مانند اس کے پیچھے سر جھکائے چلتے گئے.. سرخ چوک کو عبور کرتے گئے اور جب اس مقام سے گزرے جہاں ایک چار دیواری کے اندر باغیوں کے سر قلم کیے جاتے تھے اور دوستوو سکی بھی ایک ایسی قطار میں کھڑا تھا جس کے آخر میں گردن پر ایک کلہاڑا گرتا تھا اور میں اس مقام کو بیان کر چکا ہوں تو وہاں مجھے خدشہ سا ہوا کہ یہ موٹی خاتون ہمیں حکم دے گی کہ سب لوگ ادھر قطار میں کھڑے ہو جائیں تاکہ آپ کے سر قلم کیے جائیں..

بالآخر سرخ چوک پار کر کے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک ٹورسٹ کوچ منتظر تھی..

سیاحتی کوچ میں ماسکو شہر کا آنکھوں دیکھا حال ہم سیاحوں کو سنانے کے لیے جو خاتون تھیں، جانے کہاں تھیں کہ نظر نہ آتی تھیں.. بس آواز آتی تھی، وہ ایک خاص ٹھہراؤ سے ایک نیم مدہوش کیفیت میں بولتی جا رہی تھیں اور ان کی قادر الکلامی میں کچھ شک نہ تھا.. اور یہ قادر الکلامی خالص روسی میں جاری تھی.. تانیا ایک فرماں بردار میزبان کے طور پر ساتھ ساتھ انگریزی اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن یہ قدرے تاخیری ترجمہ ہوتا کہ اگر وہ کومنٹری کرنے والی خاتون بتا رہی ہیں کہ ذرا دائیں جانب دیکھیے یہ ماسکو کی پہلی بہن ہے..

اور جب تک تانیا ترجمہ کرتی وہ بہن گزر جاتی اور کوئی اور بہن آ جاتی..

ویسے آپ کے ذہن میں ماسکو کی بہن کی کیا تصویر ابھرتی ہے..؟

اگر تو وہ سوویت یونین کے زمانوں کی بہن ہوتی تو فرغل اوڑھے سمور کی ٹوپی اوڑھے ریڈ سکوائر میں مارچ کر رہی ہوتی.. ٹریکٹر چلا رہی ہوتی.. واکمن پر چائے کوسکی کی دھنیں بجا رہی ہوتی یا پھر کے جی بی میں ایک قاتل جاسوسہ ہوتی..

لیکن یہ سوویت یونین نہ تھا۔صرف......رشیا تھا..

نظام کے بدلنے سے بہنیں بھی بدل گئیں..

ان دنوں کی جو بہنیں تھیں وہ ٹورسکایا سٹریٹ میں امریکہ اور یورپ کے مہنگے ترین فیشن گھروں کے ملبوسات پہنتی تھیں اور کچھ تو ایسے ہوتے کہ نہ بھی پہنیں تو پتہ نہ چلتا..اور یہ بہنیں چین کی بے حد شکر گزار تھیں کہ وہاں سے نقل مطابق اصل آ جاتی تھی..دس بیس گنا کم قیمت پر دستیاب ہو جاتی تھی..اب ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی خاتون کے کپڑے اتار کر ان کے لیبل چیک کرنے لگیں کہ یہ میڈ ان فرانس ہیں یا چائنہ ہیں..کم از کم اس سٹریٹ میں گھومنے والی بہنیں تو کچھ اور نہ کرتی تھیں سوائے گھومنے کے اور مردوں کے سر گھمانے کے..ویسے ان ہیجان خیز بہنوں کے ناموس کو بچانے کے لیے بھائی ماسکو کو خاصی تگ و دو کرنی پڑتی ہوگی..اور بہنیں اس ناموس کو نہ بچانے کی تگ و دو میں مصروف ہوتی ہوں گی..

آپ کا خیال ہے کہ میں بہک گیا ہوں..موتا سے چوری چھپے واڈکا کے چار چھ گھونٹ بھر کے اک حالت مستی میں ہوں ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماسکو کی بہنیں ہوں..اور ایک دو بھی نہیں پوری سات..

نہ ٹمبکٹو کی بہنیں ہیں اور نہ لاہور کی ہمشیرگان ہیں تو ماسکو کی کیسے ہو گئیں..

دراصل یہ سات بہنیں ماسکو کے شہر میں سوویت یونین کے زمانوں میں تولد ہوئیں..سات نہایت رعب دار سکائی سکریپر عمارتیں جو یکے بعد دیگرے تعمیر کی گئیں جنہوں نے شہر کے منظر کو ایک شاندار پہچان عطا کی..

یہ سات بلند عمارتیں ماسکو کی بہنیں کہلاتی ہیں..

ہم ماسکو کے ڈپلومیٹک انکلیو میں سے گزرے تو وہاں ازبکستان' تاجکستان اور قزاقستان کے سفارت خانوں پر ان ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے..انہیں دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی کہ اگر یہ ریاستیں تو روس کی سلطنت میں شامل ہیں تو انہوں نے کس سلسلے میں اپنے سفارت خانے بنا رکھے ہیں اور پھر فوراً کھلا کہ نہیں..وہ پرانے زمانے تھے اور اب ان زمانوں میں یہ ریاستیں خود مختار ہو چکی ہیں اور اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں..

اس سفارتی علاقے میں بعض عمارتیں تو نہایت منفرد اور عجوبہ سی تھیں' فن تعمیر کے ایک عجب انوکھے پن کا شاہکار تھیں..

آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والی خاتون کی آواز نے اگرچہ یہ فقرہ روسی میں کہا..لیکن میں نے اسے تانیا کی مدد کے بغیر سمجھ لیا کہ یہ بائیں جانب دیکھیے یہ پرکشش عمارت مسلمانوں کی مسجد ہے..اور میرا جی چاہا کہ میں اپنی نشست سے اٹھ کر کوچ میں براجمان سب سیاحوں کو جھک کر سلام کروں کہ جناب یہ ہماری ہے..خوبصورت ہے ناں..؟

ایسا نہیں کہ ہم مسلسل روانی میں ہی رہے..

ہم نے چند اہم مقامات پر مختصر قیام بھی کیا..

اور ان میں کل کا دیکھا ہوا "وکٹری پارک بھی تھا جو آج ویران پڑا تھا..وہاں کوئی بھی بورس نہ تھا..

اور اس ٹورکا کلائمکس ماسکو شہر کا "بہترین منظر" تھا..

کوچ شہر کے شور اور ہنگامے سے ذرا بلند ہو کر ایک مقام پر رک گئی..

تانیا کے چہرے پر ایک معصوم اور بچگانہ مسکراہٹ جنم لینے لگی.."یہاں سے ماسکو کا سب سے حسین منظر نظر آتا ہے.." وہ اشتیاق سے دوہری ہوئی جاتی تھی' چونکہ لچکیلی تھی اس لیے کچھ زیادہ ہی دوہری ہوئی جاتی تھی.."میں جب پہلی بار اس شہر میں آئی تھی تو اس مقام پر کھڑے ہو کر میں نے یہ منظر دیکھا تو ششدر رہ گئی تھی' یا تنی بلند اور عظیم عمارتوں والا شہر تھا اور میرے شہر سے کتنا بڑا تھا..

میں نے اس کا دل دکھانا مناسب نہ جانا.."واقعی یہ ایک شاندار منظر ہے" اور یقین جانئے کہ وہ شاندار تو کیا سرے سے منظر ہی نہ تھا..ایک سٹیڈیم' اس کے گرد بہتا ہوا ایک دریا اور عمارتیں..کارخانوں کی چند چمنیاں..

"آپ دنیا کے اور بہت سے شہروں میں گئے ہوئے ہیں مستنصر..تو کیا وہاں کوئی ایسا منظر تھا..؟"

"ہرگز نہیں.."

وہ اپنی مختصر حیات کے تجربوں کے حوالے سے بالکل سچ کہہ رہی تھی..اور میں دھیان رکھ رہا تھا کہ وہ کہاں سے..پانچ روز کی ٹرین کی مسافت سے منگولیا کے صدر مقام الان باتور کی قربت میں جھیل بیکال کے کناروں کے ایک چھوٹے سے شہر سے آئی تھی تو یہاں اس پر کیا گزری ہوگی..میں اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تانیا بھولی چڑیا تم کیا جانو کہ شاندار شہری منظر کیا ہوتے ہیں..

قصر الحمرا کی منقش کھڑکی سے نیچے پھیلے شہر غرناطہ کا منظر کیا ہوتا ہے.... جبل قاسیون سے دمشق کیا دکھائی دیتا ہے.. اور بادشاہی مسجد کے مینار سے میرا لاہور کیسا نظر آتا ہے....

میں کاہے کو اس کا دل دکھاتا اس لیے میں اقرار کرتا گیا کہ ہاں اس سے شاندار منظر میں نے پہلے تو کبھی نہ دیکھا..

ٹور کے دوران متحرک کوچ کی کھڑکی میں سے آسمان پر آویزاں ایک فرشتہ سا نظر آیا جو پروں کی بجائے اپنے بازو پھیلائے پرواز کر جانے کی حالت میں ٹھہر چکا تھا.. یہ انسانی تاریخ کا پہلا انسان تھا جس نے زمین سے آزاد ہو کر خلاء میں پرواز کی.. میں نے زندگی میں بہت سی یادگاریں دیکھی ہیں لیکن خلاء میں پہلے انسان یوری گگارین کا یہ یادگاری مجسمہ ایسا تھا کہ اس کی اثر انگیزی سے زمین پر رہنے والا انسان بھی حیرت سے خلاء میں چلا جاتا ہے.. یوری کے اس پتھریلے مجسمے میں اور وہ فضا میں ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے.. یوں لگتا ہے کہ ابھی جان پڑ جائے گی اور وہ خلاء کی جانب پرواز کر جائے گا..

مجھے یاد ہے کہ سوویت یونین نے جب خلاء میں پہلا جاندار ایک کتیا لائیکا نام کی بھیجی اور اسے گھما پھرا کر زمین پر بھی لے آیا گیا تو دنیا میں دھوم مچ گئی اور یہ لائیکا مارلن منرو سے بھی زیادہ مشہور ہو گئی..

میں کوچ کی کھڑکی میں سے ماسکو کے مناظر' عمارتوں اور پارکوں اور چوکوں کو دیکھتا جاتا تھا اور کبھی کبھی میری بینائی میں خلل آ جاتا.. یکدم کسی منظر کے تمام تر رنگ نچڑ جاتے.. گھاس کی ہریالی.. آسمان کی نیلاہٹ.. عمارتوں کے رنگ.. فٹ پاتھوں پر چلتے لوگوں کے لباس.. یہاں تک کہ کسی شجر سے لٹکتی پھولوں کی لڑیاں.. ان سب کے رنگ معدوم ہو جاتے اور وہ منظر بلیک اینڈ وہائٹ میں چلا جاتا..

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کلیسائے سینٹ باسل کے رنگ رنگ کے پیاز نما گنبد اپنے رنگ کھو کر بلیک اینڈ وائٹ ہو جائیں..

کریملن کے کلیساؤں کے سنہری گنبد اپنا سنہرا پن کھو دیں..

یہاں تک کہ آئیون مینار پر آویزاں سرخ ستارہ بھی سرخ نہ رہے' بلیک اینڈ وہائٹ ہو جائے.. یہ سب یادگاریں' عمارتیں اور ماسکو شہر کے منظر ایک زمانے میں کوئی رنگ نہ رکھتے تھے..

ان زمانوں میں.. پچاس برس پیشتر جتنی بھی تصویریں اترتی تھیں وہ بلیک اینڈ وائٹ

ہوا کرتی تھیں.. رنگین تصویر کشی مہنگی بھی تھی اور اس کا رواج بھی کم کم تھا.. چنانچہ میری یادداشت میں ماسکو کی جتنی بھی تصویریں تھیں سادہ اور بلیک اینڈ وائٹ تھیں..

تو اس سٹی ٹور کے دوران ایسا ہوتا رہا کہ یکدم کوئی منظر ساکت ہو کر بلیک اینڈ وہائٹ ہو جاتا یعنی میں وہاں سے گزرا تھا اس منظر کو اپنے کیمرے میں قید کیا تھا..

دریائے ماسکو کے پل پر تانیا اور لینا اپنے ڈھیلے ڈھالے فراکوں میں کھڑی ہیں اور لینا نے اپنی آنکھوں کو اس سیاہ چشمے سے ڈھانپ رکھا ہے جو میں نے اسے تحفے کے طور پر دیا تھا..

ماسکو یونیورسٹی کی عظیم عمارت ہے جس کے سامنے میں ایک پھولدار قمیص میں نہایت کچا اور بے وقوف نوجوان لگ رہا ہوں..

آج کی ٹور سکایا اور ان دنوں کی گورکی سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر چلتے لوگ پچاس برس پیشتر میری کھینچی ہوئی تصویر میں حنوط ہو چکے ہیں وہ سب کے سب بلیک اینڈ وہائٹ ہیں.. یہاں تک کہ ایک عورت کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے گلاب کے سرخ پھول بھی اپنا رنگ ظاہر نہیں کرتے..

کوچ چلتی جاتی ہے اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں بلیک اینڈ وہائٹ کے زمانوں میں.. ابھی یہی جو تصویریں گزری ہے.. ان میں ایک ٹین ایجر.. گھنے گھنگھریالے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والا ایک برطانوی انداز کے کوٹ میں سیاہ چشمہ لگائے اگر کھڑا ہے تو پچاس برس پیشتر کھڑا ہے اور یہ تصویر بھی بلیک اینڈ وہائٹ میں ہے..

یاد ماضی ہرگز ایک عذاب نہیں ہے لیکن بلیک اینڈ وہائٹ میں ہے..

پہلی محبت اور شہروں کی جتنی بھی تصویریں ہوتی ہیں.. بلیک اینڈ وہائٹ ہوتی ہیں..

سولہواں باب

"ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں لیکچر اور گالینا ڈشنکو"

یہ ممکن ہے کہ آپ تصور کر سکتے ہیں..
کسی حد تک تصور کر سکتے ہیں' ان جذبوں کی قربت کی آنچ شاید محسوس کر سکتے ہیں جو پہلی محبت آپ کے بدن پر وارد کرتی ہے..
یہ محسوس کرنا کہ لمس کا کنوارپن جب پہلی محبت کے بدن کو سرسری چھو جاتا ہے تو کیا گزرتی ہے.. اس پہلے لمس سے یہ پوری کائنات' سیارے اور ستارے پگھلنے لگتے ہیں اور بدن کی تپش انہیں پگھلاتی ہے.. یا پھر ایک تنگ گلی میں واقع ایک کلینک میں سے ایک نرس.. انعام کی آرزومند ایک نرس مسکراتے ہوئے آپ کی جانب بڑھتی ہے آپ کو خبر کرنے کے لیے.. یا کبھی لیڈی ڈاکٹر صرف آپ کے لیے ایک دوستانہ چہرہ بنا کر کہتی ہے کہ.. مبارک ہو' آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے یا ایک گول مٹول بھاری سی بچی آ گئی ہے تو مبارک ہو.. تب آپ پر رحمت اور خوش بختی کی جو پھوار پڑتی ہے وہ بھی کسی حد تک آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ ہر فانی انسان ایسے تجربے سے کبھی نہ کبھی گزرتا ہے.. لیکن ایک تجربہ ایسا ہے جس میں سے کوئی کوئی ہی گزرتا ہے.. تصور میں لایئے کہ اگر کوئی رفعت مقام نہیں.. آپ گمنام ہیں اور ایک کتاب.. کاغذ اور سیاہ روشنائی کی مہک والا ایک نومولود وجود آپ کے ہاتھوں میں آتا ہے اور اس کے سرورق پر آپ کا نام چھپا ہوا ہے.. تو جو کیفیت بدن کی ہوتی ہے وہ نہ پیار سے ہوتی ہے اور نہ خمار سے.. بیشک یہ ایک فوری طور پر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے جانے کے لائق کاغذ اور سیاہی کا ضیاع کتاب ہو.. شائع ہوتے ہی گمنامی کی دھول میں گم ہو جانے والی ایک کتاب ہو لیکن اسے پہلی بار اٹھاتے ہوئے اور اپنے لکھے ہوئے حرف کو کاغذ پر چھپا دیکھ کر بدن میں ایک عجیب کیف ہلکورے لینے لگتا ہے.. اور اس کے

ساتھ ایک خوف کی آمیزش بھی ہوتی ہے کہ جانے اسے پڑھنے والوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے.. اگرچہ مجھے ادب سے بہت لگاؤ تھا لیکن ادیب بننے کی تمنا نہ تھی.. یہ محض ایک اتفاق یا حادثہ تھا.. 1958ء میں مجید نظامی صاحب کے کہنے پر "لنڈن سے ماسکو تک" تحریر کیا اور پھر 1969ء میں میں نے ایک مرتبہ پھر آوارگی اختیار کی جو مجھے تقریباً سترہ سرزمینوں کی روایتوں' حکایتوں اور ثقافتوں کے قریب لے گئی.. واپسی پر میں نے صرف اس خاصی ہنگامہ خیز اور جذباتی شدت سے بھرپور مسافت میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اور اس میں دوبارہ زندہ ہونے کے لیے اردو بازار لاہور سے ایک روپے بارہ آنے فی کے حساب سے دو لکیر دار رجسٹر حاصل کیے اور اپنی گوالمنڈی والی دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر ان کے صفحے سیاہ کرتا گیا.. یہ محض اتفاق تھا کہ تمکینہ حقانی کی سفارش پر مقبول جہانگیر نے میری اس تحریر کو قبول کر لیا اور "سیارہ ڈائجسٹ" میں قسط وار شائع کرنا شروع کر دیا.. تب اس سفرنامے کو "جائیو بدلیس" کا عنوان دیا گیا لیکن جب کتاب مرتب ہوئی تو بہت سے ناموں میں سے محترم شفیق الرحمن نے "نکلے تری تلاش میں" کو پسند کیا..
یہ کتاب بھی نہایت آسانی سے ردی کی ٹوکری میں گم ہو سکتی تھی لیکن بخت آوری میں صلاحیت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا.. وہ جس پر چاہے اپنے آپ کو نچھاور کر دے چنانچہ یہ بخت آوری مجھ پر مہربان ہو گئی اور میری پہلی کتاب کی کہہ سکتے ہیں دھوم سی مچ گئی.. نہایت سکہ بند اور نستعلیق نوعیت کے باقاعدہ ادیب مجھے کھوجتے میری دکان پر پہنچ جاتے اور مجھے اپنے دست شفقت سے نوازتے..
ان زمانوں میں سوویت یونین کل عالم پر راج کرتا تھا.. اس کی عسکری قوت' سائنسی ترقی اور دہشت سے وہائٹ ہاؤس کے یونانی ستون ہمہ وقت لرزتے رہتے.. پاکستان میں سوویت سفارت خانہ ایک نہایت سرکاری سرخ خیالات کا پرچارک جریدہ "طلوع" نام کا شائع کیا کرتا تھا.. کسی نہ کسی طرح اس کی میلنگ لسٹ پر میرا نام بھی آ گیا.. کوئی ایک شمارہ تھا جس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں ایک عنوان پر ٹھہر گیا.. "سوویت یونین میں اردو.." اس مضمون میں سوویت یونین میں اردو کی ترویج اور مختلف یونیورسٹیوں میں اس کے شعبوں کی تفصیل درج تھی.. مضمون کے عنوان تلے ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر زیب داستان کے طور پر چھپی تھی جس کے نیچے ایک مختصر عبارت تھی "ماسکو یونیورسٹی میں پروفیسر گالینا ڈشنکو روسی طلبہ کو اردو زبان پڑھا رہی ہیں.."
"یہاں تک تو خیریت گزری لیکن پھر چراغوں میں قطعی طور پر روشنی نہ رہی کہ پروفیسر موصوف

کے ہاتھوں میں جو کتاب تھی اس کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کا تخلیق کردہ تھا اور اس پر نہایت آسانی سے اس حقیر کا نام پڑھا جا سکتا تھا.. ڈشنکو کے عقب میں جو بلیک بورڈ تھا اس پر سفید چاک سے ربط ٹوٹ ٹوٹ جانے والے حرفوں سے لکھا گیا تھا.. "ہم جو کتاب پڑھ رہے ہیں اس کا نام "نکلے تری تلاش میں" ہے.."

ایک کھردرے اور مشکل نام والے گمنام شخص کی پہلی کچی پکی کتاب ہو..

"میں اجنبی میں بے نشاں
میں پابہ گل
نہ رفعت مقام ہے نہ شہرت دوام ہے
یہ لوح دل! یہ لوح دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے..

اور ایسے بے نشاں کی تحریر کی نشانیاں دور دیسوں کی درسگاہوں میں ظاہر ہونے لگیں.. میں کیا بیان کروں کہ وہ تصویر اور اس تحریر اور اس تصویر میں اپنی کتاب کو دیکھ کر مجھ پر کیا گزری..

مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں میرا تو یہی خیال تھا کہ میں نے پروفیسر گالینا ڈشنکو کو ایک خوفزدہ اور اطاعت گزار شکریے کا ایک خط لکھا تھا.. لیکن جب اس تصویر کی اشاعت کے چھتیس برس بعد ایک عمر رسیدہ گالینا میرے گلے لگ کر آبدیدہ ہو گئی تھیں تو انہوں نے کہا.. "نہیں مستنصر.. پہلا خط تم نے نہیں.. میں نے تمہیں لکھا تھا جب پاسکل میرے حواس پر چھا گئی تھی.."

"پیار کا پہلا شہر" کے بارے میں ان کے ایک خط کا اقتباس درج ہے کہ کیسے اس روز جب تارڑ کی یہ تحریر پڑھائی جاتی ہے تمام طالب علم حاضر ہوتے ہیں جب کہ عام دنوں میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ پورے روس میں کوئی وبا پھیل گئی ہے اور طالب علم غیر حاضر ہو گئے ہیں..

ایک بار انہوں نے لکھا.. "میں چاہتی ہوں کہ آپ کے شاندار ناولٹ "فاختہ" کا ترجمہ

روسی زبان میں کیا جائے.. ماسکو کا غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر اسے شائع کرنے پر آمادہ ہے.. لیکن اس میں ایک دو صفحے ایسے ہیں جو ہمارے عظیم سرخ چوک کے تقدس کو مجروح کرتے ہیں.. کیا آپ ان پر نظر ثانی کر سکتے ہیں.. اگر آپ ایسا کر سکیں تو "فاختہ" نہ صرف روسی زبان میں بلکہ سوویت یونین کی دیگر قومیتوں کی زبانوں میں بھی شائع ہو سکتی ہے".. ایک بے وجہ اڑیل پن نے بہ صد معذرت نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا..

اور زمانے کے دستور اور نظام کیسے بدلتے ہیں کہ اب وہی "فاختہ" پسندیدہ ہو جاتی ہے اور میری دوسری تحریروں کے ہمراہ یونیورسٹی کے نصاب میں جگہ پا جاتی ہے..

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر میں 1958ء میں اتفاق سے لنڈن سے سوویت یونین کو نہ جاتا.. اور واپسی پر "لنڈن سے ماسکو تک" نہ تحریر کرتا تو آج میں ایک ادیب نہ ہوتا.. اور اگر گالینا میری اوّلین کتاب کو یونیورسٹی کے نصاب میں نہ شامل کرتیں.. ایک اور اتفاق.. تو میری اتنی توقیر نہ ہوتی.. بے شک آج دنیا کی بہت سی درسگاہوں میں مصر میں، جاپان اور ہندوستان میں میری تحریریں نصاب میں شامل ہیں لیکن پہلا بوٹا گالینا نے ماسکو میں لگایا تھا..

گویا ماسکو میرے ادب کی جنم بھومی تھی..

شاید اب آپ کسی حد تک.. مجھ اجنبی، بے نشان شخص کی کیفیت سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ جب اس بلیک اینڈ وہائٹ "طلوع" میں شائع ہونے والی تصویر کے چھتیس برس بعد ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی مجھے سرکاری طور پر لیکچرز دینے کے لیے مدعو کرتی ہے تو مجھ پر کیا گزرتی ہے.. دو چار برس میں ستر برس کا ہو جانے والا ایک شخص اس اعزاز سے اس بلاوے سے کیسا نوخیز اور البیلا ہو جاتا ہے اور اسے ہر درخت سرسبز نظر آنے لگتا ہے اور ہر بیج ایک راج ہنس دکھائی دینے لگتی ہے..

اور وہاں گالینا ڈشنکو تھیں..

ایک چھتیس برس پرانی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر نہ تھی..

ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی مختصر لائبریری میں جہاں مہاراج گنیش کے مجسمے سجے تھے.. اس کے لیکچر روم میں گالینا ڈشنکو تھیں.. وہ ایک محسن تھیں اور روس میں میری چھتیس برس قدیمی مہربان تھیں اور یہ ان کی اور میری پہلی ملاقات تھی..

وہ درمیانی قامت کی تھیں اور عمر ان کو سمیٹ رہی تھی.. ماہی منڈا طرز کے ترشے ہوئے

نیم سنہری بال' اگرچہ مرجھائی ہوئی دل پر اثر کرنے والی نیلی آنکھیں اور بہت باریک سیب ہونٹوں پر شوخ اور سرخ لپ سٹک' قراۃ العین حیدر کی مانند... میں نے آگے بڑھ کر ان کی پذیرائی کی.. ان کا ہاتھ تھاما اور ان کے گلے لگ گیا.. وہ میری پشت ایک ماں کی طرح تھپکتی رہیں اور ان کی نیلگوں آنکھوں سے نمی یوں پھوٹنے لگی جیسے وہ دریا کنارے کی ریت ہوں جسے دبانے سے نمی ظاہر ہونے لگتی ہے..

میں انہیں پہچان نہیں پایا تھا..

میرے ذہن میں تو وہ چھتیس برس پیشتر کی "طلوع" میں شائع ہونے والی ایک تصویر تھیں.. ایک گردن کے آس پاس گرتے ترشے ہوئے سیاہ بالوں والی پرکشش خاتون جن کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے وہ "نکلے تری تلاش میں" ہے.... لیکن یہ تو بہت برس پہلے کے نظارے ہیں.. عمر کے پلوں تلے سے بہت پانی بہہ چکے تھے.. رنگ روپ اجڑ چکا تھا مگر آخری خزاں کا اپنا ہی ایک رنگ روپ تھا..

گالینا کے بارے میں مجھے خبریں ملتی رہتی تھیں..

وہ گوشہ نشین ہو چکی ہیں.. اپنے فلیٹ سے بہت کم باہر نکلتی ہیں.. البتہ اردو سیکھنے والا کوئی دیوانہ اگر ان تک پہنچ جاتا ہے تو وہ بخوشی اسے درس دیتی تھیں اور پہلا مشورہ یہی دیتی تھیں کہ مستنصر کو پڑھو.. شاعری میں فیض کو پڑھو اور ناول نگاری میں مستنصر کی "فاختہ" پڑھو..

شاید ان دنوں میں وہ پورے روس کی معمر ترین اردو دان تھیں..

میں نے جب ان کی گوشہ نشینی اور عمر رسیدگی کی خبر پائی تو میں نے انہیں سندیسہ بھیجا کہ وہ صرف مجھے ملنے کی خاطر اپنے فلیٹ سے طویل فاصلے طے کر کے ماسکو یونیورسٹی نہ آئیں' میں اور لڈمیلا ان کے ہاں خود حاضری دیں گے..

لیکن وہ خود آ گئیں اور جب میں نے شرمندگی سے شکایت کی کہ آپ نے کیوں اتنا تردد کیا' میں اور میلا آپ کے ہاں حاضر ہو جاتے تو وہ ذرا ناراض ہو گئیں.. "میں اتنی بوڑھی تو نہیں ہوئی کہ اگر مستنصر ماسکو میں آئے' جس کی تحریریں میں ایک بائبل کی مانند پڑھتی ہوں اور میں اسے ملنے کے لیے نہ آؤں.. میں اتنی بوڑھی نہیں ہوئی.."

گالینا میں مجھے کسی حد تک قراۃ العین حیدر کی جھلک نظر آئی.... انہوں نے بھی عمر رسیدگی اور بڑھاپے سے سیدھے منہ بات نہ کی تھی.. انہیں گھاس نہ ڈالی تھی.. اور وہ بھی مینی

آپا کی مانند اپنے ہونٹوں کو شوخ سرخ لپ سٹک سے گلنار کرتی تھیں.. اپنے ماہی منڈا بالوں کا دھیان رکھتی تھیں اور ہر تصویر کے اترنے سے پہلے انہیں تھپکتی تھیں اور ایک دل کش پوز بناتی تھیں..

ان کی یادداشت حیرت انگیز تھی..

انہیں میرا لکھا ہوا ہر خط' ہر فقرہ ازبر تھا..

اور میں "ہاں ہاں" کہتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے تو اپنا موبائل نمبر بھی یاد نہ ہوتا تھا تو گئے زمانوں کے خطوں کے فقرے کہاں یاد رہتے..

میری تحریروں میں وہ کیا تھا کہ اردو ادب میں وہ میرے سوا کسی اور کا نام نہ لیتی تھیں.. مجھے خوب علم ہے کہ میں بین الاقوامی سطح پر ایک قابل ذکر ادیب نہیں ہوں.. من آنم کہ من دانم.. اور اس کے باوجود گالینا اگر میری تحریروں کی شدید شیدائی ہیں تو اس کی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے.. شاید ان کی روح میں بھی ایک آوارگی اور بے چینی تھی.. ایک جنوں خیزی اور تجسس تھا اور میری تحریریں ان کی جذباتی حیات کی ترجمانی کر دیتی تھیں..

ان کی نگاہ میرے پہلے تین سفرناموں کے مجموعے کی جانب گئی تو پوچھنے لگیں' کیا یہ کوئی تازہ تصنیف ہے..

میں نے انہیں بتایا کہ وہی سفرنامے ہیں جو آپ کے پاس پہلے سے موجود ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ کی لائبریری میں میرا یہ مجموعہ جگہ پا جائے..

کہنے لگیں.. "دیکھو اس میں اور ان میں فرق یہ ہو گا کہ یہ مجموعہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے عطا کرو گے اور اس پر تمہارے دستخط ہوں گے.. اور وہ باقاعدہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تاکہ یہ تحفہ وصول کر سکیں.. اس مجموعے کے علاوہ میں نے ان کی خدمت میں "بہاؤ" اور "قربت مرگ میں محبت" بھی پیش کیے..

میرے لیکچر کے دوران وہ ان تینوں کتابوں کو مسلسل ہولے ہولے تھپکتی رہیں جیسے وہ نومولود بچے ہوں جنہیں انہوں نے گود لے لیا ہو..

وہ بار بار میمونہ کے ہاتھ تھام کر اسے کچھ کہتیں اور میری بیگم اس شفیق ہستی کی محبت سے پگھلتی جاتی..

لیکچر کے اختتام کے بعد.. جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے پھر سے انہیں گلے

لگالیا.. تو ایک طالبہ نے فرمائش کی کہ ذرا ٹھہریئے میں آپ دونوں کی ایک تصویر اتارنا چاہتی ہوں.. گالینا نے اس درخواست کو پسند نہ کیا اور کہا: "نہیں ایسی فرمائشی تصویر نہیں ہونی چاہیے.."

انہوں نے کیوں اس درخواست کو رد کیا..؟ مجھے گمان ہے کہ وہ ایک آخری تصویر نہیں اتروانا چاہتی تھیں.. یہ تو تقریباً طے تھا کہ یہ میری اور ان کی نہ صرف پہلی بلکہ آخری ملاقات بھی تھی..

اور وہاں میری دوست ڈاکٹر لڈمیلا واسلووا بھی آ چکی تھیں..

اور ہم پہلی بار نہیں مل رہے تھے بلکہ میں ان کی رفاقت سے لاہور.. اسلام آباد اور ٹورنٹو میں بھی "فیض" یاب ہو چکا تھا.. ماسکو پہنچنے پر سب سے پہلا ٹیلی فون لڈمیلا کا آیا تھا.. وہ اپنے شعبے کے امتحانوں میں شدید طور پر مصروف اور الجھی ہوئی تھیں اور اس کے باوجود ان سے ایک لمحاتی چھٹکارا حاصل کر کے صرف مجھ سے ملاقات کی خاطر پہنچ گئی تھیں.. اگرچہ ان کا کہنا تھا کہ وہ صرف میمونہ سے ملنے آئی ہیں..

لڈمیلا جنہیں ہم لوگ الفت سے صرف میلا پکارتے ہیں.. ایک ایسی قادرالکلام خاتون ہیں جن کے آگے دلی کے گلی کوچے پانی بھرتے ہیں.. ان کے زبان و بیان پر اعتبار ہی نہیں آتا کہ بھلا ایسی شیرینی اور گھلاوٹ کہاں ممکن ہے.. اگر دلی کے گلی کوچے ان کی اردو کے سامنے پانی بھرتے تھے تو لکھنؤ کی گلیاں ان کے سامنے جھک کر باقاعدہ آداب بجالاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ.. محترمہ پہلے آپ.. مجھ ایسے لاہوریئے کی تو ان کے سامنے کیا مجال تھی.. اگرچہ اتنی مجال تھی کہ میں زبان کے بارے میں ان سے اختلاف کا اظہار کر سکتا تھا کہ میلا دلی کی اردو کم از کم ہمارے لیے نہیں ہے.. اسے نصاب میں تو پڑھایا جا سکتا ہے لیکن اسے عہد موجود کے اظہار کا ایک وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا..... میں شاید پہلے بھی کہیں تذکرہ کر چکا ہوں کہ جب لڈمیلا لاہور آئیں اور مجھ سے ملنے میرے گھر آئیں تو کہنے لگیں.. "آپ جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک فیض صاحب کی قبر پر حاضری نہیں دی.. تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے ان کے پاس لے جائیں.."

ماڈل ٹاؤن کے اس قبرستان کی نیم شکستہ دیوار کے قریب جب ہماری کار رکی جس کے اندر فیض صاحب دفن تھے تو لڈمیلا نے باہر آتے ہی فیض صاحب کی ایک غزل "غم گسار چلے" بلند آواز میں پڑھنی شروع کر دی.. وہ قبروں کے درمیان میں سے چلتی گئیں اور پڑھتی گئیں.. اور ان

کی آواز میں کیسی اداسی اور جدائی تھی جو دل پر اثر کرتی تھی.. جیسے ایک مرید.. مرشد سے ملنے جاتا ہو.. جیسے کوئی محبوب سے ملاقات کرنے جاتا ہو.. میلا کی آنکھوں میں نمی تھی اور ان کی آواز میں ایسی اثر انگیزی تھی کہ قبرستان کے خاردار درختوں میں کوکتی ایک فاختہ بھی چپ ہو گئی تھی.. میں اگرچہ فیض صاحب کے جنازے میں شریک ہوا تھا لیکن اس کے بعد کبھی دوبارہ ادھر آنا نہ ہوا تھا.. ہم نے ان کے سیاہ مرقد پر جہاں کوئی کتبہ نہ تھا' پھول بکھیرے اور پھر میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میلا نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے..

میلا سے زبان کے علاوہ میرا ایک اور شدید اختلاف تھا.. میں رسول حمزہ توف کی شاعری اور "میرا داغستان" کا شیدائی تھا پر میلا رسول سے صرف اس لیے خفا تھیں کہ جب کبھی وہ اور فیض صاحب روس میں اکٹھے ہوتے تو رسول ان کو بہت شراب پلا دیتے اور مجھے ان کے پاس جانا پڑتا اور انہیں روکنا پڑتا.. اور میرا موقف یہ ہوتا کہ فیض صاحب کوئی ایسی معصوم اور پاکیزہ روح تو نہ تھے کہ رسول انہیں صراط مستقیم سے بھٹکا دیتے.. پر وہ ہمیشہ رسول کو ہی مورد الزام ٹھہراتیں..

لڈمیلا ایک سدابہار بیل تھیں جو اگرچہ فیض صاحب سے لپٹی ہوئی تھیں لیکن ان کی مہک سے ہم سب فیض یاب ہوتے تھے..

میں لڈمیلا کے لیے اپنی کتاب "غار حرا میں ایک رات" لے کر گیا تھا اور جان بوجھ کر لے کر گیا تھا کہ ایک عرصے سے ملحد معاشرے میں سانس لینے والی ایک دانشور خاتون اگر ایک سراسر مذہبی کیفیت کی کتاب پڑھتی ہے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے.. جب میں نے اسے اس کتاب کے موضوع کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ ایک خوش رنگ انار کی مانند چھوٹی مسکراہٹ بکھیر کر کہنے لگیں.. "مجھے نہیں معلوم تھا کہ مستنصر کے اندر ایک داڑھی بھی موجود ہے.."

"بس یہی تو اس حیات کا المیہ رہا ہے میلا.." میں نے اس کے ردعمل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا.. "اپنے بیگانے سب مجھ سے تنگ ہیں.. سبھی ناخوش ہیں.. بلھے شاہ کی مانند میں بھی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں.. نہ میں مسجدوں میں مومن ہوں اور نہ میں کفر کی ریتوں کا پیروکار ہوں.."

اس پر میلا نے فوری طور پر غالب کے ایک فارسی شعر کا حوالہ دیا' جس کے ایک مصرعے کا مفہوم کچھ یوں تھا.. اور میلا نے کہا کہ یہ تمہارے بارے میں ہے کہ.. تم ایک ایسی کتاب ہو جس کے بہت سے اوراق ابھی ناخواندہ ہیں.. تو ایک ورق یہ بھی ہے کہ مستنصر کے اندر ایک

واژھی ہے..

اور وہاں.. گالینا ڈشکوا اور لڈمیلا واسلووا کے علاوہ ماریناسکندر بھی تھیں..

ماریناماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی سربراہ تھیں..

میں ان سے پہلے بھی مل چکا تھا..

بہت برس پیشتر میری اور ان کی ملاقات ایک نہایت سنسنی خیز انداز میں اسلام آباد میں ہوئی تھی.. اور یہ ملاقات نہ ہوتی اگر ڈاکٹر اعجاز راہی مرحوم میرا قریبی دوست نہ ہوتا.. ایک روز اعجاز کا فون آیا.. ''تارڑ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری کچھ تحریریں ادھر ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں..؟''

''ہاں.. مجھے معلوم ہے..''

تو اعجاز نے اپنے پینڈو اور شدید نظریاتی لہجے میں کہا.. ''تو تم نے مجھ سے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا..؟''

''اس لیے کہ ایک نقاد کے طور پر تمہیں علم ہونا چاہیے تھا.. اب میں ڈھول بجا کر اعلان کرنے سے تو رہا.. لیکن اب تمہیں کیسے علم ہو گیا..؟''

اعجاز کہنے لگا.. ''دراصل میں ''انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف فارن لینگویجز'' میں لیکچرز کے سلسلے میں آتا جاتا رہتا ہوں.. تو وہاں ایک روسی میاں بیوی ہیں ماریناور سکندر.. جو پاکستانیوں کو روسی زبان پڑھاتے ہیں اور اردو بھی جانتے ہیں تو انہوں نے ایک روز گفتگو کے دوران مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ تارڑ نام کے ادیب کو بھی جانتے ہیں.. ہم اس سے ملاقات کے خواہش مند ہیں.. تو مجھے ذرا دھچکا سا لگا کہ وہ تمہیں کیسے جانتے ہیں اور میں نے ان سے پوچھا کہ آخر آپ اس تارڑ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم دونوں نے آج سے بیس برس پیشتر ماسکو یونیورسٹی سے اردو میں ڈگری حاصل کی تھی اور ہم اپنے نصاب میں اس ادیب کی تحریریں پڑھا کرتے تھے.. ہم جب سے پاکستان آئے ہیں اسے تلاش کر رہے ہیں..

قصہ مختصر.. رابطہ ہوا.. اور مارینا اور سکندر نے ایک شب مجھے اور میرے خاندان کو اپنے ہاں شام کے کھانے کے لیے مدعو کر لیا..

اور جب ہم اپنی سفید خیبر سوزوکی پر سوار اس سیکٹر اور اس گلی میں گئے جہاں وہ رہائش پذیر تھے تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے کہ وہ سوویت یونین کے سفارت خانے سے ملحقہ کمپاؤنڈ میں

رہائش پذیر تھے.. ہماری کار کا سامنا ایک دیوار ہوتے آہنی گیٹ سے ہوا اور وہ گیٹ شاید خودبخود کھلتا گیا اور ہم نے دیکھا کہ اس شب کی سیاہی میں بھی بہت سے ایریل اور آہنی مینار سے ملحقہ سفارت خانہ سے ابھرتے ہیں اور ظاہر ہے ادھر کی خبریں اُدھر تک پہنچاتے ہیں.. محسوس تو ہو گیا کہ حماقت ہو گئی ہے پر آگے بڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا.. یاد رہے کہ ان دنوں سوویت سفارتخانے کے آس پاس اگر کوئی پرندہ بھی پر مارتا تھا تو خفیہ ادارے اس پرندے کے نہ صرف پَر گننے لگتے تھے بلکہ اس کے انڈوں پر بھی نظر رکھتے تھے کہ یہ ابھی تو سفید ہیں تو کہیں یہ سرخ سرخ نہ ہونے لگیں..

مارینا اور سکندر کے ہاں وہ کیسی یادگار اور محبت بھری رات تھی.. جو آج تک لوحِ دل پر محفوظ ہے.. مارینا نے ہماری فرمائش پر صرف روسی خوراکوں کا اہتمام کیا تھا اور وہ کیا ہی انوکھا اور پرذائقہ اہتمام تھا.. میرے بچے اردو اور پنجابی بولتے رہے اور ان دونوں کے بچے روسی بولتے رہے اور اس کے باوجود ایک دوسرے کو سمجھتے رہے اور بہت خوش رہے..

اس شب کے اختتام پر مارینا اور سکندر نے ہمیں کچھ تحفے دیے اور ان میں دوستووسکی کے ضخیم ناول ''ایڈیٹ'' کا اردو ترجمہ بھی تھا.. اور اس کے پہلے ورق پر روسی زبان میں کچھ لکھ کر اسے پیش کیا گیا.. میں نے گزارش کی کہ آپ نے روسی میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگر اردو میں بھی لکھ دیں تو میں بھی کچھ سمجھ پاؤں.. تو انہوں نے روسی کا ترجمہ کر کے لکھا.. ''مستنصر حسین تارڑ کے نام جو سوویت یونین میں اردو کے سب سے پسندیدہ ادیب ہیں..''

عین ممکن ہے کہ دوستووسکی کے تمام ناولوں میں سے صرف ''ایڈیٹ'' کا چناؤ کر کے ان دونوں نے مجھے کوئی علامتی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو.. ورنہ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی..

مارینا اور سکندر کا عطا کردہ ''ایڈیٹ'' کا یہ نسخہ میں نے اپنے بک شیلف کی سب سے بلند شیلف پر دھول پھانکنے کے لیے رکھا ہوا ہے تاکہ نہ کوئی اس تک پہنچے اور نہ کوئی اس پر درج عبارت کو سنجیدگی سے لے..

اس شب اسلام آباد کے بعد آج اتنے ڈھیر سارے برسوں بعد مارینا سے پھر ملاقات ہوئی تھی..

وہ اب بھی ایک خوش شکل سیب رنگت رخساروں والی دل پذیر خاتون تھیں لیکن تب..

جب وہ اسلام آباد میں تھی تب تو ان کا رنگ روپ ہی کچھ اور تھا۔۔

''اور سکندر کہاں ہیں۔۔؟''

''وہ ان دنوں کاروبار کے سلسلے میں افریقہ میں ہیں اور ہم دونوں آپ دونوں کو اکثر یاد کرتے ہیں۔۔آپ کے بچے تو اب بڑے ہو گئے ہوں گے۔۔''

''نہ صرف بڑے ہو گئے ہیں بلکہ اپنے ذاتی بچے بھی پیدا کر رہے ہیں۔۔''

لاہور سے چلتے ہوئے قابل فہم طور پر میں اپنی چند کتابیں بھی سامان میں رکھنا چاہتا تھا تا کہ اردو دان روسی دوستوں کو پیش کروں۔ افتاد یہ آن پڑی کہ آخر اپنی پچاس کتابوں میں سے کون سی کتابوں کا چناؤ کروں کیونکہ بقول مونا میری کل کتابوں کا وزن ایک ناتواں ہی سہی گدھے کا بوجھ تو تھیں۔۔ بہر حال میں نے تقریباً ایک چوتھائی گدھے کا بوجھ اپنے سامان میں شامل کر لیا۔۔

جس روز ہم دونوں دوسرے لیکچر کے لیے ہوٹل سے باہر آئے تو حسب معمول ہاتھ لٹکاتے باہر نہ آئے بلکہ ہم نے کتابوں کے تھیلے اٹھا رکھے تھے اور ان کا وزن اتنا زیادہ محسوس ہو رہا تھا جیسے سنگ میل نے انہیں کاغذ کی بجائے پتھر کی سلوں پر شائع کیا ہے۔۔ چونکہ ہم یہ بار باری باری اٹھاتے تھے اس لیے مونا کی باری آتی تو وہ بڑبڑانے لگتی۔۔کیا ضرورت تھی اتنی ڈھیر ساری موٹی موٹی کتابیں لکھنے کی۔۔ تمہیں اپنی پہلی دو چار کتابوں سے ہی ادب میں تھوڑی بہت جگہ مل گئی تھی تو صبر شکر کر لیتے۔۔اتنی جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی۔۔

ان دو طویل لیکچرز کو جو میں نے ماسکو یونیورسٹی میں دیئے یہاں من و عن درج کر دینا میرے لیے بھی صبر آزما ہو گا اور آپ کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ۔۔ یوں جانئے کہ یہ کوئی نہایت تحقیقی' عالمانہ اور فاضلانہ یا دانشورانہ نوعیت کے لیکچرز نہ تھے۔۔بس گفتگو تھی اردو ادب اور روس کے بارے میں۔۔ مجھے طالب علموں کی ذہنی استعداد اور ان کی اردو زبان کی محدود صلاحیت کو بہر طور مدنظر رکھنا تھا۔۔میں نے زیادہ گہرائی میں جانے سے اجتناب کیا اور ادب کے سمندر کی تہ میں جو حیران کن تخلیقی رنگوں کی حیات تھی' اسے بیان کرنے کی بجائے اس سمندر کے پانیوں کی سطح پر جو بادبانی کشتیاں تیرتی تھیں اور آسانی سے نظر آ جاتی تھیں انہیں فوکس میں لانے کی کوشش کی۔۔

میرے پہلے لیکچر کا موضوع ''اردو ادب پر روسی ادب کے اثرات'' تھا جو انگریزی

زبان میں اس لیے دیا گیا کہ اس میں اردو کے طلبہ کے علاوہ ہندی۔۔ سنسکرت۔۔ترکی اور تامل زبانوں کے طلبہ اور ان کے پروفیسر بھی شرکت کر رہے تھے۔۔دوسرا لیکچر جو صرف شعبہ اردو اور اس کے اساتذہ کے لیے مخصوص تھا اس کا موضوع ''روس آج اور پچاس برس پیشتر'' تھا اور اردو زبان میں تھا۔۔

دونوں لیکچرز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ تھا۔۔ایک بے راہرو نوعیت کی گفتگو تھی جو بھی کسی راستے پر چل نکلتی اور کبھی کوئی اور رُخ اختیار کر لیتی۔۔تو ان لیکچرز کا ایک نہایت مختصر متن کچھ یوں ہو گا کہ ''روس کا چہرہ یورپی ہے لیکن اس کی روح سراسر مشرقی ہے۔۔'' اور یہ کیسے مشرقی ہے' اس کا انکشاف مجھ پر آج سے پچاس برس پیشتر آپ ہی کے شہر ماسکو میں ہوا۔۔جب میں نے تانیا اور لینا سے فرمائش کی کہ میں نے آپ کی کلاسیکی فلمیں تو بہت دیکھی ہیں۔۔سرجی آئن سٹائن جسے ہدایت کاری کا بابا آدم مانا جاتا ہے اس کی ''بیٹل شپ پوٹمکن'' دیکھی ہے اور ''کرینز آر فلائنگ'' نے مجھے رلا دیا تھا لیکن میں ایک نارمل عام سی فلم دیکھنا چاہتا ہوں جسے نارمل عام سے روسی لوگ پسند کرتے ہیں۔۔تو وہ مجھے ایک فلم دکھانے کے لیے لے گئیں۔۔وہ ایک نہایت ہی آپا رضیہ بٹ قسم کا جذبات سے پگھلتا ہوا' آنسو بہاتا' شدید المیاتی رومان تھا جس کے آخر میں ہیرو اور ہیروئن کی جدائی آہوں اور سسکیوں میں بہ چشم نم ہو رہی ہے۔۔وائلن کی ماتم بھری صدائیں پکار رہی ہیں اور جانے کہاں سے خزاں رسیدہ پتے ان کے نم آلود غمگین چہروں پر برس رہے ہیں اور شاید ہیروئن خودکشی کا ارادہ کر چکی ہے۔۔میں نے محسوس کیا کہ اس آخری منظر کے دوران ہال میں کچھ عجیب کھسر پھسر ہو رہی ہے۔۔کچھ ہچکیاں سی سنائی دے رہی ہیں اور جب فلم کے اختتام پر سینما ہال کی روشنیاں جل اٹھیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیشتر تماشائی' کیا جوان کیا بوڑھے مرد و زن سسکیاں بھرتے ناکیں پونچھ رہے ہیں اور آنسو بھی پونچھ رہے ہیں ساتھ ساتھ۔۔ادھر تانیا اور لینا بھی رونے دھونے میں مشغول ہیں۔۔تب مجھے احساس ہوا کہ روسی بنیادی طور پر ایک جذباتی اور مشرقی لوگ ہیں۔۔ اور اگر ان زمانوں کے سوویت یونین میں ہندوستانی فلموں پر لوگ جان و دل سے فدا ہوتے تھے تو کیوں ہوتے تھے۔۔سرخ چوک میں اکارڈین کی دھنوں پر ''آوارہ ہوں'' اور ''گھر آیا میرا پردیسی'' پر کیوں جھوم جھوم جاتے تھے۔۔اس لیے کہ ان کے چہرے تو یورپی تھے پر ان کی روح خالص مشرقی تھی۔۔

تب ماسکو سے رخصت ہونے کے موقع پر ہمارے دونوں روسی مترجم جب ہم سے

چیخیں مار کر بھوں بھوں رونے لگے تو ہم نہایت پریشان ہو گئے تھے کہ ہم تو انگلستان سے آئے تھے اور وہاں اگر بہت ہی قربت ہو جاتی تھی تو جدائی کے موقع پر قدرے گرمجوشی سے مصافحہ کر لیا جاتا تھا یا بہت ہی جان پر کھیل گئے تو رخساروں پر ایک ہلکی سی تھپکی دے دی جاتی تھی..

اس جذباتی اور رومانوی فلم کو دیکھنے اور ایک عام روسی پر اس کی اثر انگیزی کا مشاہدہ ایک ایسی کنجی ثابت ہوا جس سے نہ صرف روسی تاریخ بلکہ ادب کے تمام دروازے کھلتے چلے گئے..روسی ادب کے کردار کیوں ہمیں اپنی سرزمین کے کردار لگتے ہیں..ہم کیوں مغرب کے ادب کے مقابلے میں ان سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں' صرف اس لیے کہ ان میں بھی وہی مشرقی شدت..لا ابالی پن..اور کبھی وحشت اور محبت میں شدت اور کبھی نفرت اور بے رُخی میں اس سے بڑھ کر شدت..ان کے مقہور اور مجبور لوگ ہمارے ہاں کے ہی ذلتوں کے مارے لوگ تھے..

دوستووسکی کے بیشتر کردار ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں شک گزرتا ہے کہ دراصل یہ تو پاکستان میں پیدا ہوئے تھے..یہیں کے تھے اور روس میں عارضی طور پر جا بسے تھے..

اردو ادب پر روسی ادب کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ یہ دونوں ایک مقام پر آ کر یوں مدغم ہوتے ہیں کہ ان کی الگ الگ پہچان مشکل ہو جاتی ہے..

ہم نے ہوش سنبھالا تو ہمارے گھروں میں گورکی کی ''ماں'' موجود تھی اور شولوخوف کا ''اور ڈان بہتا رہا'' بہہ رہا تھا..

ہمارے ہاں اگر کسی نثر نگار کی آخری تعریف کرنی ہو تو اسے پاکستانی چیخوف کے نام سے پکارا جاتا ہے..

اور اگر کسی ناول کی توصیف مقصود ہو تو اس میں ''وار اینڈ پیس'' یا ''کرائم اینڈ پنشمنٹ'' کی جھلکیاں نظر آ سکتی ہیں..

میرے امریکہ کے سفرنامے میں گورکی کے ''زرد شیطان کے شہر'' کے اثرات ہیں اگرچہ میں نیویارک کے بارے میں اس کے نکتہ نظر سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کرتا..

میں نے روسی ادب کے حوالے سے ان تراجم کا ذکر بھی کیا جو اردو زبان میں ڈھالے گئے..

میری دانست کے مطابق روسی ادب کی کوئی ایک کہانی بھی ایسی نہیں ہے جس کا اردو

ترجمہ نہ کیا گیا ہو اور یہاں میں نے خاص طور پر برادرم شاہد حمید کے ایک یونانی معبد ایسے عظیم تمکنت لیے ہوئے ''وار اینڈ پیس'' کے اردو ترجمے کا حوالہ دیا جو کسی ستائش اور صلے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی پاگل پن اور وحشت کے لیے برسوں میں کیا گیا تھا..میں نے ایک مختصر سا حوالہ اپنے ناول ''ڈاکیا اور جولاہا'' کا بھی دیا جس کا مرکزی خیال ترگنیف کا ''رودین'' تھا' امریکہ ایک پاکستانی نتالیہ ایک ان دیکھے رودین کے عشق میں ایسے فنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی شب عروسی میں یہ خواہش کرتی ہے کہ کوئی غیبی طاقت اسے یہاں سے اٹھا کر رودین کے پاس لے جائے اور وہ اس سے کہے..''اس سے پیشتر کہ کوئی اور میرے ان چھوئے بدن کو اپنے اختیار میں لے لے..تم مجھے داغدار کر دو..یہ میری درخواست ہے..''

ان دونوں لیکچروں کے بعد حسب روایت جو سوال پوچھے گئے ان میں سے کچھ بہت انوکھے اور جدا تھے..

تانیا چکیلی تنی نے وہی سوال پوچھا کہ ایک کردار کیسے جنم لیتا ہے جس کے نتیجے میں بورس کا ظہور ہوا..

اتنے عرصے سے تقریباً چھتیس برس سے ماسکو یونیورسٹی کے اردو نصاب میں شامل ہونا کیسا لگتا ہے..؟

آپ کے ماں باپ کیسے تھے..ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں..

کیا آپ طالبان کے حق میں ہیں..کیونکہ آپ نے ایک ناول ''قلعہ جنگی'' نام کا بھی لکھا ہے..؟

آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں..؟

ہمارے نصاب میں شامل ابن انشا ہمیشہ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جب کہ آپ کے ہاں صرف ''میں'' ہوتی ہے تو کیوں ہوتی ہے..

آپ کی نثر اور پریم چند کی نثر میں اتنا فرق کیوں ہے..

آپ کی تحریروں میں کہیں کہیں جو پنجابی ہے تو وہ کیوں ہے..ہمیں لگتا ہے کہ آپ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں پنجابی سیکھنی ہوگی..

اور کیا آپ جنس کے بغیر محبت پر یقین رکھتے ہیں..؟

اور ہم فیض کو جانتے ہیں اور آپ کو جانتے ہیں تو کیا شاعری بڑی ہوتی ہے یا نثر..؟

ان شدید دھچکے دینے والا سوالات کے جواب میں نے جو کچھ بھی دیے.. لڈمیلا کی آنکھوں میں شرارت اور بے یقینی کے شرارے پھوٹتے رہے.. میں نے جن بھی مضامین کو اپنے لیکچر میں باندھا وہ نہایت آسانی سے انہیں کھول کر مجھے بے توقیر کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے آداب میزبانی کو ملحوظ خاطر رکھا اور کچھ بھی نہ کھولا.. بلکہ انہوں نے اپنے دل کو کھول کر جو کہاں کسی پر کھلتا تھا میرے لیکچر کی بہت توصیف کی اور پھر کہنے لگیں۔ "آپ نے میرے غریب خانہ پر کب آنا ہے..؟"

"چونکہ میں ذاتی طور پر ایک غریب خانہ میں رہتا ہوں تو مجھے کسی ایک اور غریب خانہ میں جانے کا کچھ چاؤ نہیں ہے۔"

"مستنصر.. میں واقعی مبالغہ نہیں کر رہی.. واقعی میرا خانہ ایک غریب خانہ ہے.. بلکہ کبوتر خانہ ہے۔"

"تو پھر آپ کبوتروں کو میرا سلام کہیے۔"

"آپ بھی تو ایک پرواز کرتے رہنے والے کبوتر ہیں تو آ جائیے.. ویسے میں پہلے سے خبردار کر دینا چاہتی ہوں کہ میرے کبوتر خانے تک آنے کے لیے آپ کو چار منزلوں کی سیڑھیاں طے کرنی ہوں گی۔"

"وہاں کوئی لفٹ وغیرہ نہیں ہے..؟"

"نہیں.. اسی لیے تو وہ کبوتر خانہ ہے۔"

"میلا.. آپ مجھے یہ کہنے کی کیا حاجت ہے ایک بین الاقوامی شہرت کی مالک سکالر ہیں.. تو آپ ایک کبوتر خانے میں کیوں رہائش رکھتی ہیں..؟"

"مجبوری ہے.." اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ آپ جانتے ہیں کہ کمیونزم کے زمانے میں سوویت یونین میں رہائشی جگہوں کی شدید قلت تھی.. پورے خاندان ایک کمرے میں گزر اوقات کرتے تھے اور دیگر خاندانوں کے ہمراہ ایک ہی غسل خانہ استعمال کرتے تھے.. تو ان زمانوں میں نکیتا خروشچیف نے یہ طے کیا کہ ہر روسی خاندان کو ایک ذاتی فلیٹ ملنا چاہیے' چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو.. اور اپنا غسل خانہ ہونا چاہیے' چاہے اس میں سر جھکا کر نہایا جائے اور کموڈ پر بیٹھنے سے گھٹنے دروازے کو جا لگیں.. اس منصوبے کے تحت ہنگامی طور پر پورے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے فلیٹ تعمیر کیے گئے جو ایک نعمت سے کم نہ تھے.. ایک ایسا ہی فلیٹ میرے حصے میں بھی آ گیا.. میری شدید خواہش ہے کہ میں اب کسی بہتر فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں.. میں نے کچھ رقم بھی پس

انداز کر لی لیکن اس دوران نظام بدل گیا اور فلیٹوں کی قیمتیں میرے بس سے باہر ہو گئیں.. اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ ایک نئے فلیٹ کے خواب دیکھ سکوں.. امید کی واحد کرن یہ ہے کہ شاید کوئی تعمیراتی فرم ہمارے فلیٹوں والی عمارت خرید کر وہاں ایک پلازہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لے اور ہمیں معقول معاوضہ مل جائے.. ویسے امکان یہی ہے کہ میں اسی کبوتر خانے میں رحلت فرما جاؤں گی۔"

"یعنی مجھے اس سانحے سے پیشتر وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"ہاں بالکل.. اور ہاں.. نتالیا پریگارینا یاد ہے..؟ آپ کو جب قطر میں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ سے نوازا گیا تھا 2003ء میں تو پریگارینا کو بھی اسی برس ایوارڈ ملا تھا بہترین غیر ملکی سکالر کے طور پر.. وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔"

"ہاں نتالیہ.. وہ تو میری سب سے پرانی گرل فرینڈ ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

پریگارینا سے جب قطر میں طویل ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے انہیں بتایا کہ "1959ء میں ماسکو میں یوتھ فیسٹیول منعقد ہوا تھا اس میں میں شریک تھا" تو ان کے چہرے پر ایک عجب سا تحیر پھوٹا اور کہنے لگیں.. کیا آپ لینن سٹیڈیم میں منعقد ہونے والے فیسٹیول کی افتتاحی تقریب میں شامل تھے..؟"

"بالکل تھا.. اور کچھ دیر کے لیے اپنے ملک کا پرچم تھام کر پاکستانی وفد کی قیادت بھی کی تھی۔"

"کیا واقعی..؟" وہ شدید حیرت میں تھیں.. "میں بھی وہاں تھی۔"

"کہاں..؟"

"آپ نے ضرور نوٹ کیا ہو گا کہ جب افتتاحی تقریب جاری تھی تو سٹیڈیم کے درمیان میں ہزاروں روسی لڑکیاں جمناسٹک کے مظاہرے کر رہی تھیں.. میں ان میں سے ایک تھی۔"

مجھے ایک ایسا دھچکا لگا اور زمانے کے گزرنے سے اور اس کے عجائبات سے لگا.. یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں طلسم ہوشربا کے کوئی کردار ہیں.. یہ کیسے ممکن تھا کہ ہزاروں کے ہجوم میں لاکھوں لوگوں میں وہاں ایک پاکستانی لڑکا ہو اور آس پاس کہیں ایک روسی لڑکی کرتب دکھا رہی ہو اور پھر وہ دونوں ہی ادب کی جانب مائل ہوں اور سینتالیس برس بعد کسی اور چھوٹے سے ملک میں ان کی خدمات پر ایوارڈ دیے جائیں اور وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے سامنے آئیں.. اسے اتفاق تو نہیں کہا جا سکتا یہ کوئی سحر.. کوئی جادو ہو سکتا ہے.. لیکن ایسا ہوا.. میرے سامنے ایک فربہ ادھیڑ عمر لیکن خوش مزاج عورت بیٹھی تھی جو کبھی ایک لچکیلے بدن والی خوش نظر لڑکی ہوا کرتی تھی اور وہ لینن سٹیڈیم میں

قلابازیاں لگا رہی تھی اور اس لمبے ایک پاکستانی لڑکا پرچم تھامے اپنے وفد کے آگے چل رہا تھا..

پہلی ملاقات کے بعد پریگاریناا ور میں جہاں بھی اکٹھے ہوتے وہ میرا تعارف کرواتے ہوئے کہتی 'یہ میرے سب سے پرانے بوائے فرینڈ ہیں..

''پریگاریناان دنوں مولانا روم کے حوالے سے ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے استنبول گئی ہوئی ہیں..دو چار روز میں واپسی متوقع ہے..تو پھر میں ان کو بھی مدعو کر لوں گی تا کہ آپ اپنی سب سے قدیمی گرل فرینڈ کو میمونہ کی موجودگی میں مل لیں..تو آپ آئیں گے ناں میرے کبوتر خانے میں..''

''جس کبوتر خانے میں لدمیلا ایسی دوست غٹرغوں غٹرغوں کر رہی ہو وہاں کون کافر جانے سے انکار کر سکتا ہے۔

اپنے لیکچر کے دوران میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہندوستان میں ابھی تک کلاسیکی اردو کا چلن ہے جس کی چاشنی سے انکار ممکن نہیں لیکن اگر آپ عہد جدید کے ادبی کے تقاضوں میں ڈھل جانے والی زبان کی قربت میں ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکستان آنا ہوگا..خاص طور پر نثر کے معاملے میں جب تک آپ پنجاب کے قریب نہیں آتے تب تک بڑی اور بین الاقوامی سطح کی نثر سے متعارف نہیں ہو سکتے..

لیکن بعد میں مارینا نے نہایت شکایت آمیز لہجے میں یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کر دیا کہ تارڑ صاحب..ہم کیا کریں..اردو زبان کی ترویج کے لیے ہندوستان جتنی معاونت کرتا ہے پاکستان نہیں کرتا..ہمارے طالب علموں کو وظیفے دیے جاتے ہیں تا کہ وہ دلی یا لکھنؤ میں جا کر زبان سیکھیں..ہر ماہ ڈھیروں کتابیں اور رسائل ہمیں روانہ کیے جاتے ہیں..ہم کیا کریں..البتہ اگلے برس ہمارے شعبے کی تین طالبات کو پنجاب یونیورسٹی نے مدعو کیا ہے..دیکھیے اس دعوت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے..

چند روز بعد جب میں نے پاکستانی سفارت خانے کے پریس کونسلر اعجاز صاحب سے مارینا کا شکوہ بیان کیا تو وہ کہنے لگے..میں اپنے تئیں پوری کوشش کرتا ہوں..محدود وسائل کے باوجود بھاگ دوڑ کرتا رہتا ہوں..بلکہ ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا ایک نیا شعبہ متعارف ہوا ہے اور میں نے پاکستان بھر سے کتابیں مانگ تانگ کر وہاں پہنچائی ہیں..لیکن طلبہ کے لیے پاکستانی وظائف کے بارے میں مجھے کچھ اختیار نہیں..''

اور ہاں..میں ناشکری کا مرتکب ہوں گا اگر میں اس سنہری میڈل کا تذکرہ نہ کروں جو مجھے ماسکو یونیورسٹی کی جانب سے مارینا اور گالینا ڈشکو نے پیش کیا جس پر ''لومونوسوف ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی..انسٹی ٹیوٹ آف رشین اینڈ افریقن سٹیڈیز'' کے حروف ابھرے ہوئے ہیں..اور بقول ان کے یہ میڈل ان شخصیات کو پیش کیا جاتا ہے جنہوں نے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دی ہوں..

سترہواں باب

”بیٹیاں میری بہترین پروڈکشن ہیں اور قدیم روسی خوراک“

یونیورسٹی کے اندر.. شعبہ اردو کے کمرے میں.. اگرچہ وہاں مہاراج گنیش کا ایک مجسمہ بھی تھا.. پھر بھی اندر ایک چھوٹا سا پاکستان تھا.. اردو کے چرچے تھے.. آنیا نے چائے کی دعوت کے لیے ٹولا کی کسی قدیم بیکری سے ایک خصوصی روسی کیک منگایا تھا.. میمونہ گالینا اور ماریا کے ساتھ اردو میں چہکیں ہانک رہی تھیں اور طالبات اگرچہ اٹک اٹک کر بول رہی تھیں لیکن یہ روسی کیسی پیاری بولی بول رہے تھے جو ہماری بولی تھی.. اور جب ہم یونیورسٹی سے باہر آئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک پرسکون آرام دہ مکان کا دروازہ کھولا ہے تو باہر تیز جھکڑ چل رہے ہیں.. ایک طوفان اترا ہوا ہے.. کیونکہ باہر ماسکو تھا.. اس کی ٹریفک اور شور کے تھپیڑے ہمارے چہروں پر پڑے تو ہوش آیا کہ ہم تو ایک اجنبی شہر میں ہیں.. پاکستان میں نہیں ہیں.. اور باہر فٹ پاتھ کے کناروں پر ٹہلتا منتظر ایک ایسا پیار کرنے کے لائق پرخلوص شخص تھا جسے میں نے ہمیشہ لاہور میں اپنی سٹڈی میں دیکھا تھا.. مسٹر.. مسلانسر.. آپ کے روسی دورے کے تمام انتظامات مکمل ہو رہے ہیں.. آپ فکر نہ کریں.. سامان پیک کر لیں اور ماسکو آ جائیں.. ایک ایسا شخص جس نے ساری سردردی مول لے لی اور میری ماسکو یاترا کو ممکن بنا دیا..

ژوگینی ذخاروف..

آنیا آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی کہ وہ اس کی چہیتی بیٹی تھی..

جسے ہمیشہ لاہوری منظر میں دیکھا تھا اسے ماسکو کے پس منظر میں منتظر پایا تو عجیب سا لگا

بلکہ کچھ نا آشنا سا لگا..

”میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے..“ میں نے ذخاروف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا..

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں تمہیں جانتا ہوں..“ اس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے سر ہلایا.. ”لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ ہم کہاں ملے تھے..“

اس کی بیوٹن مسکراہٹ ماسکو کے پس منظر میں کچھ زیادہ ہی بیوٹن لگتی تھی..

وہ پاکستان سے روانگی سے پیشتر متعدد بار معذرت کر چکا تھا.. وضاحتیں پیش کر چکا تھا کہ وہ کاروباری مصروفیات کے باعث ماسکو نہ آ سکے گا.. میرا دھیان نہ رکھ سکے گا.. مجھ سے ملاقات نہ کر سکے گا اور اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک مہربان شرمندگی تھی.. میں نے اسے تسلی دی کہ اس کی ماسکو میں غیر موجودگی مجھے محسوس ہی نہیں ہوئی اور اس کی بیٹی آنیا اور اس کی بریگیڈ نے اپنی مسلسل نگہداشت اور مہمان نوازی سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا.. زندگی اجیرن کر رکھی تھی.. آنیا اور ساشا اس کی دو بیٹیاں ایسے فرشتے تھے جو ہر وقت میرے دائیں اور بائیں منڈلاتے رہتے تھے اور مجھے سکھ کا سانس نہ لینے دیتے تھے..

وہ.. ذخاروف ہر چند لمحوں کے بعد آنیا سے لپٹ کر اس کے رخساروں پر بوسے دیتا اور کہتا..

”مسٹر مستنصر.. کیا تم جانتے ہو کہ میری بیٹیاں میری بہترین پروڈکشن ہیں اور میں ان سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں..“

”میں خوب جانتا ہوں..“

ہمارے ہاں جو بے شمار خود فریبی کے مفروضے ہیں جن کے سہارے ہم اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے مغرب اور امریکہ کو مطعون کرتے رہتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بس ہم ہیں جو اپنی آل اولاد سے محبت کرتے ہیں ورنہ یہ گورے لوگ تو اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی ان سے غافل ہو جاتے ہیں.. انہیں قطعی طور پر پیار نہیں کرتے.. جب کہ ہم تو اپنی اولاد پر نچھاور ہو جاتے ہیں.. مجھے ایک نہایت دکھ بھری زندگی یاد آتی ہے کہ ایک لڑکی.. ڈاکٹروں کے بقول ایک سبزی ہو جاتی ہے یعنی وہ زندہ تو ہے.. سانس تو لیتی ہے لیکن اس کے سوا اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں.. جیسے ایک بند گوبھی ہوتی ہے جو ہے تو سہی.. سرسبز دکھائی دیتی ہے لیکن نہ بول سکتی ہے اور

نہ پہچان سکتی ہے.. بس ہے.. اور اس کی ماں.. پچھلے تیس برس سے اپنی جوانی کی خوشیاں تیاگ کر.. تیس برس سے ایک کمرے میں اپنی بیٹی کے سرہانے بیٹھی ہے.. اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ نہ تو یہ تمہیں دیکھتی ہے.. نہ سنتی ہے اور نہ ہی تمہاری موجودگی سے آگاہ ہے تو کیوں اتنی مدت سے یہاں بیٹھی ہو تو وہ.. ایک انگریز ایک گوری.. ایک مغربی ماں کہتی ہے.. ''آپ سمجھ نہیں سکتے یہ میری بیٹی ہے.. ہر دو چار ماہ کے بعد یہ آنکھیں کھولتی ہے.. اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنی آنکھوں سے کہہ رہی ہے کہ.. تھینک یو ممی.. اور بس وہی لمحہ میری کل کائنات ہے.. جب اس کی آنکھیں ''تھینک یو ممی'' کہتی ہیں..''

ذخاروف اگرچہ آنیا اور ساشا کی ماں اکسانہ سے الگ ہو چکا تھا.. اور اکسانہ ایسی سحر انگیز مسکراہٹ والی خاتون سے کیسے الگ ہو گیا تھا.. بس یہ ہے کہ شادیاں صرف جادوئی مسکراہٹ کے سہارے دور تک نہیں چل سکتیں.. تو ذخاروف اگرچہ دوسری شادی کر چکا تھا اور مزید دو بیٹیاں پیدا کر چکا تھا اور اس کے باوجود آنیا اور ساشا کے لیے وہ اتنی بے دریغ اور بے مہار محبت رکھتا تھا کہ اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی..

اور صرف باپ ہی نہیں بلکہ دونوں بیٹیاں بھی اس کی محبت میں نڈھال ہیں.. اور اس سے لپٹ لپٹ جاتی ہیں..

''آپ جانتے ہیں ناں کہ میری بیٹیاں میری بہترین پروڈکشن ہیں.. آنیا اور ساشا نے اپنی پڑھائی میں ہمیشہ گولڈ میڈل حاصل کیے.. اور وہ جو دو چھوٹی چھوٹی ہیں ان کی ٹیچر بھی ان سے پوچھتی ہے کہ تم کس باپ کی بیٹیاں ہو.. وہ ابھی سے اتنی لائق ہیں چنانچہ مسٹر مستنصر تم دیکھ سکتے ہو کہ میری بیٹیاں میری بہترین پروڈکشن ہیں..''

''درست کہ آپ نے ایک پروڈکشن ہاؤس کھولا ہوا ہے لیکن آج ہم ماسکو میں پہلی بار ملے ہیں.. اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہے تو یہاں سے ہم کہاں جائیں گے..؟''

''ہم پہلے کھانا کھائیں گے..'' ذخاروف نے حسب عادت ماتھے پر تیوری چڑھا کر نہایت سنجیدہ شکل بنا کر کہا.. کے جی بی کے ایک ایسے ایجنٹ کی طرح جو ان دنوں بیکار ہے اور خواہ مخواہ سنجیدہ شکل بنائے پھرتا ہے.. ''آپ یہ بتایئے کہ آپ کیا کھانا پسند کریں گے.. مجھے معلوم ہے لاہوری لوگ خوراک کے بغیر سوچ بھی نہیں سکتے..''

''اسی لیے میرے آج کے لیکچر میں جان نہیں تھی کہ میں بھوکا تھا..'' میں نے ہنس کر کہا..

''ذخاروف ہم روس میں ہیں اور اب تک ہم امریکی.. اطالوی اور میکسیکن کھانے وغیرہ کھا رہے ہیں تو کیا روس میں روسی کھانے بھی ہوتے ہیں..''

''ہوتے ہیں..'' اس نے سر ہلا کر انگلی کھڑی کر دی اور اس کے اس انداز سے مجھے اپنا اطالوی دوست پیئر لوجی یاد آ گیا جو اسی طرح بات کیا کرتا تھا.. ''اور مجھے معلوم ہے کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے..''

ماسکو میں آج بھی پھوار پڑ رہی تھی.. تقریباً روزانہ بارش ہو رہی تھی اور یہ ان بادلوں کا بدلہ تھا جنہیں ہوائی جہازوں سے کوئی محلول وغیرہ چھڑک کر آسمان سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا تا کہ ''وکٹری ڈے'' پر موسم صاف رہے اور دھوپ چمکدار رہے اور اب وہی بادل ماسکو واپس آ رہے تھے..

ہم جس ریستوران میں گئے وہ ایک معمولی درجے کے سپر سٹور کے ایک گوشے میں واقع تھا اور قدیم روسی خوراک کے حوالے سے بہت شہرت رکھتا تھا.. اس کے اندر داخل ہوئے تو گویا پرانے زاروں کے زمانے میں چلے گئے اور وہ بھی دور دراز کے برف اور سردی سے ستائے کسی ایسے گاؤں میں جہاں بجلی نہ تھی اور اس گاؤں سے ہٹ کر برچ کے جنگلوں میں پوشیدہ لکڑی کا ایک پرانا کیبن تھا جہاں ڈاکٹر ژواگو کے ایک منظر میں جولی کرسٹی سے ملنے ایک برف بار رُت میں عمر شریف جاتا ہے.. اس ریستوران بلکہ کیبن کی چھت سے لہسن.. پیاز اور سوکھی ہوئی کھمبیوں کی لڑیاں لٹکی تھیں.. ایک دیوار پر ایک ریچھ اوندھا پڑا تھا یعنی اس کی سیاہ کھال آویزاں تھی.. ریچھ کے بغیر روس کا تصور مکمل نہیں ہوتا.. ایک جانب چولہے گرم تھے جہاں تین دہقان بنی عورتیں سر پر رومال باندھے جانے کیا اُبال رہی تھیں اور متعدد ہانڈیوں میں بیزاری سے ڈوئیاں چلا رہی تھیں.. ویٹر حضرات بھی نہایت اور جنگل حالت میں تھے یعنی روسی لوک لباس میں تھے اور ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ خوراک کی طشتری زمین پر دے ماریں گے اور اٹھک بیٹھک والا رقص شروع کر دیں گے.. حسب روایت نہ تو ان باورچنوں نے ہماری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی ویٹروں نے کچھ پذیرائی کی..

''مسٹر مستنصر..'' ذخاروف نے پھر تیوری چڑھائی.. ''آپ کیا کھانا پسند کریں گے..؟''

مجھے تو صرف دو ڈشیں ہمیشہ سے مرغوب رہی ہیں.. بیف سٹراگنوف اور چکن اے لا کیو

جن کے کم از کم نام تو روسی ہیں.. لیکن میرا تجربہ ہے کہ ایک زمانے کے "شیزان اور نیشنل" میں جو کوئی بھی شیف ہوا کرتا تھا اس سے بہتر دنیا بھر میں اور کوئی باورچی یہ ڈشیں نہیں بنا سکا.. میں نے یورپ اور امریکہ میں جب کبھی ان میں سے کوئی ڈش آرڈر کی تو اسے کھاتے ہوئے شیزان کے اس شیف کو ضرور یاد کیا.. میں یہاں بھی ان میں سے کسی ایک ڈش کی خواہش کر سکتا تھا لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا کہ بیف کے لیے جو گائے ہوتی تھی اور چکن کے لیے جو چکن ہوتا تھا اس کا سر بیک جنبش چھری وغیرہ قلم کیا گیا ہوتا تھا بغیر کچھ پڑھے.. یعنی وہ حلال نہ ہو سکتے تھے اس لیے یونہی اجتناب کر لیا..

"ذخاروف ہم کسی ایسی خوراک کھانے کے تمنائی ہیں جس کا خمیر مچھلی سے اٹھایا گیا ہو.."

ذخاروف نے تھوڑی تھام کر مینو پر کچھ غور و خوض کیا.. "پہلے تو آپ ایک ایسا سوپ پئیں گے جو سینکڑوں برس پرانے طریقے سے چولہے کی آگ پر تیار کیا جائے گا.. یہ روس کے دہقان بڑے شوق سے نوش کرتے تھے.. اس میں شامل سبزیوں.. لہسن تھوم.. پیاز.. مشروم اور جڑی بوٹیوں کا ذائقہ بالکل اوریجنل ہوگا.."

جب یہ سوپ پیش کیا گیا.. ہم نے اسے چکھا.. تو واقعی ہم کوئی چار پانچ سو برس قدیم روس میں چلے گئے.. ذائقہ ایسا ہی تھا اور واقعی پیاز اور جڑی بوٹیاں بھی تقریباً اصلی حالت میں تھیں.. اس سوپ کو پیتے ہوئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے کہ یہ دھواں اس سوپ میں شامل تھا.. میں نے اپنے آپ کو کچھ کچھ ایک روسی دہقان محسوس کیا جس نے مالک کی زمینوں سے دو چار پیاز اور چقندر وغیرہ چرا کر انہیں شتابی سے اپنے جھونپڑے میں ابال لیا ہو.. ویسے میں نے شکر کیا کہ میں ایک روسی دہقان نہیں ہوں..

مچھلی آئی تو وہ بھی دھواں دھاری تھی..

موتا تو نہیں البتہ میں نے اسے بھی رغبت سے کھانے کا مظاہرہ کیا اور اسے مچھلی تصور کر کے کھایا..

البتہ باسکٹ کی ٹوکری میں جو بریڈ آئی وہ بہت تازہ اور سوندھی مہک والی تھی اور ریچھ کی کھال کی قربت میں جو تندور تھا وہاں سے براہ راست ہماری میز پر آئی تھی..

یہ کہنے کی کچھ حاجت نہیں کہ ہم نے اس قدیمی روسی خوراک کی جی بھر کے توصیف کی کہ ہم اپنے محسن کا دل نہیں توڑ سکتے تھے.. ذخاروف نہ ہوتا تو ہم ماسکو میں نہ ہوتے.. اور ہاں اس ریستوران میں بھی تو نہ ہوتے.. البتہ جب اس نے ہماری تعریف کو قدرے سنجیدگی سے قبول

کر کے یہ کہا کہ اگر آپ کو یہ روسی خوراک اتنی پسند آئی ہے تو ہم کل دوبارہ یہاں آئیں گے.. تو ہم نے سوچا کہ یہ خوراک دوبارہ کھانے کی بجائے بہتر ہے کہ ذخاروف کا دل توڑ دیا جائے.. چنانچہ میں نے ایک نہایت صوفیانہ بیان دیا کہ.. ذخاروف زندگی اور موت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا.. کیا معلوم وہ کل آئے کہ نہ آئے.. ویسے مجھے گمان ہے کہ ہم یہاں دوبارہ کبھی نہیں آئیں گے اگرچہ میری شدید خواہش ہے کہ میں کم از کم وہ سوپ ایک مرتبہ پھر پیوں..

دوستوں کے لیے اگر تھوڑی سی منافقت کر لی جائے تو شاید شرعاً بھی جائز ہے..

اٹھارہواں باب

"ابراہیم نکولائی' ایک اُزبک روسی شریف بدمعاش سے ملاقات"

باہر ابھی تک پھوار جاری تھی..

بادل ابھی تک اپنا بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے کہ ہمیں "وکٹری ڈے" پر کیوں بھگایا تھا..اب ہم آ گئے ہیں اور جی بھر کے برسیں گے..

باہر سامنے کے ایک چوک میں ایک نہایت عالی شان اور پرشکوہ یادگاری ستون بلند ہوتا چلا جاتا تھا اور ناراض بادلوں کو چھوتا تھا..

"یہ کیسی یادگار ہے.."

"یہ ایک ایسی یادگار ہے جو ماسکو اور پورے روس میں جتنی بھی شاندار یادگاریں ہیں' انہیں تخلیق کرنے والے شخص کی یادگار ہے.."

"یعنی یہ کمیونسٹ زمانوں کی ایک یادگار ہے..تو کبھی کسی کا جی چاہا کہ اسے ڈھا دیا جائے؟.."

"ان زمانوں میں اتنی یادگاریں اور مجسمے تعمیر ہوتے تھے کہ ان سب کو ڈھانے میں بہت خرچ ہوگا..بہتر یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے..یوں بھی یہ ہماری تاریخ کا ایک حصہ تو ہیں.."

"اور اب ہم کہاں جائیں گے..اگر کہیں جائیں گے.." میں پیاز کے اس قتلے کو اپنے ناتواں دانتوں سے چبانے لگا جو سوپ میں نہیں گلا تھا تو میرے منہ میں کہاں گلتا..

"ہم یہاں سے ایک گینگسٹر سے ملنے جائیں گے.."

میں نے وہ کچا پیاز فوراً نگل لیا کہ ذخاروف یہ کیا کہہ رہا ہے کہ ہم یہاں سے..اور میری بیوی بھی میرے ساتھ ہے کسی چھٹے ہوئے بدمعاش سے ملنے جائیں گے.

"ایک گینگسٹر سے ذخاروف..؟"

"ہاں مسٹر مستنصر..آپ نے لاہور میں کہا تھا کہ آپ روس میں اداکاروں..مصوروں..موسیقاروں..ادیبوں اور ثقافتی لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں."

"ہاں کہا تو تھا.." ایک تو میں نے ذخاروف سے جو کچھ بھی لاہور میں کہا تھا اس نے پلے باندھ لیا تھا.

"تو یہ بھی ایک ثقافتی شخصیت ہے..وہ میرا دور پار کا رشتے دار بھی ہے..ابراہیم نکولائی آندرے وچ...اس نے ایک کلچر ہاؤس تعمیر کر رکھا ہے جو پورے ماسکو میں شہرت رکھتا ہے..اگرچہ وہ ایک نامی گرامی بدنام زمانہ بین الاقوامی گینگسٹر رہ چکا ہے لیکن اب کسی حد تک تائب ہو کر ایک اہم ثقافتی شخص ہو گیا ہے..اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے."

یہ ذخاروف ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے..پہلے ہمیں وہ سوپ پلایا مچھلی کھلائی اور اب کسی بدنام زمانہ بدمعاش سے ملوانے جا رہا ہے..

"وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے.." کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا..

"اسے میرے توسط سے علم ہو گیا تھا کہ آپ ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھتے ہیں تو اس کی خواہش ہے کہ آپ اس کے پروڈکشن ہاؤس کے لیے جو بہت بڑا ہے..ڈرامے لکھیں."

"ذخاروف...میں تو اردو اور پنجابی میں لکھ سکتا ہوں' روسی میں نہیں تو وہ کیسے چاہتا ہے کہ میں اس کے لیے ڈرامے تحریر کروں.."

"وہ ایک گینگسٹر رہ چکا ہے..اس لیے اس کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی..آپ بھی نہ کرنا."

"ویسے آپ اپنے اس عزیز..بلکہ عزیز از جان کا کچھ تعارف تو کرواؤ کہ وہ کون ہے..؟"

"ابراہیم کی والدہ روسی تھیں اور والد ایک اُزبک مسلمان..اس نے ایک عرصے تک قانون کی دنیا سے باہر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی..اور ایسی دھاک بٹھانے کے لیے اس نے وہ

سب کچھ کیا جو کرنا پڑتا ہے.. پورا ماسکو اس کے نام سے لرزتا تھا..اب اس نے غلطی یہ کی کہ..اپنا ''رزق حلال'' سارے کا سارا روس میں رکھنے کی بجائے امریکی بینکوں میں جمع کروا دیا اور وہاں کے ہم ذہن دوستوں کی مدد سے جمع کروا دیا..اب ابراہیم غریب روس کو ترک کر کے ایک ایماندار شخص کے طور پر ایک پر آسائش زندگی گزارنے کے لیے نیویارک ایئرپورٹ پر اترا ہے تو اسے پولیس نے خواہ مخواہ دبوچ لیا..اس نے دو برس ایک امریکی جیل میں بسر کیے اور پھر اسے ملک بدر کر دیا گیا..ابراہیم بے شک جرائم وغیرہ سے کچھ شغف رکھتا تھا لیکن اس کی ذات کے گرد ایک رومانوی ہالہ تھا..ایک روسی ماں اور ازبک باپ کا بیٹا جو بہت نڈر اور بے باک تھا..یورپ میں اور خاص طور پر فرانس میں اخباروں اور رسالوں کے سرورق پر اس کی روسی اور ازبک تصویر شائع کی گئی اور اس کے ''کارناموں'' کے بارے میں مضامین لکھے گئے..وہ امریکہ سے ماسکو واپس آیا تو توبہ تائب ہو گیا..کیا آپ یقین کرو گے کہ اس نے یہاں ایک ایسا ''کلچر ہاؤس'' تعمیر کیا جہاں مصوری کی نمائشیں ہوتی ہیں..اداکاروں اور موسیقاروں کو تربیت دی جاتی ہے..دس برس کے بچوں کے لیے بھی فنون لطیفہ کی تربیت کے لیے بندوبست ہے..اس ہاؤس میں ایک مختصر سا تھیٹر بھی ہے جہاں روسی ادب کے شاہکار ڈرامے کھیلے جاتے ہیں..ایک ایسا ریکارڈنگ ہاؤس ہے جہاں روس کے اہم ترین گلوکار اپنے نغمے ریکارڈ کرواتے ہیں..مستنصر وہ اب ایک مختلف انسان ہو چکا ہے اور ہر کوئی اس کا مداح ہے..تم بھی اسے پسند کرو گے..روسی فلموں اور تھیٹر کے اہم ترین اداکار اور ہدایت کار اس کے ہاں آتے ہیں اور اس کی دوستی پر فخر کرتے ہیں۔''

''لیکن اتنا بڑا کلچر ہاؤس تعمیر کرنے کے لیے اتنی بڑی رقم اس کے پاس کیسے آئی..؟''

''مجھے نہیں پتہ..'' ذاخاروف مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ ایسی رقم کہاں سے آ سکتی ہے اس کا تمہیں بھی اندازہ ہونا چاہیے..

''کیا یہ تمہارا دور پار کا عزیز..ابراہیم واقعی فنون لطیفہ کی ترویج میں دلچسپی رکھتا ہے..؟''

''اس میں کوئی شک نہیں..وہ اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے..ویسے وہ ایک اداکار بھی رہ چکا ہے لیکن اس نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک فلم میں کام کیا تھا۔''

''اور اس کا کردار کیا تھا..؟''

''ایک گینگسٹر کا..'' ذاخاروف کی پیوٹن مسکراہٹ پھیلنے لگی..''اور یہ فلم صرف ابراہیم کی وجہ سے سپرہٹ ہو گئی..ہوا یہ کہ فلم کی ریلیز سے چند روز پیشتر روسی پولیس نے اسے کسی جرم میں

ملوث ہونے کے باعث گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا..تو اس فلم کی اشتہار بازی میں پہلے تو اسے فلم میں ایک گینگسٹر کی اداکاری کرتے ہوئے دکھایا گیا اور پھر کٹ کر کے اسے روسی پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے دکھایا گیا اور ساتھ ہی اعلان ہوا کہ خواتین و حضرات ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ ہماری فلم کے کردار زندگی اور حقیقت کے کتنے قریب ہیں کہ جس شخص نے گینگسٹر کا کردار ادا کیا ہے اسے سچ مچ پولیس پکڑ کر لے گئی ہے..چنانچہ فلم سپرہٹ ہو گئی..''

اور واقعی گھنے اشجار کے سائے میں ابراہیم نکولائی آندرے وچ کا کلچرل کمپلیکس دیکھنے کے لائق تھا..اور ابراہیم کیا تھا..؟ وہ استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک دیو میری جانب بڑھتا چلا آتا ہے کہ وہ نہایت کسرتی بدن کا ایک طویل قامت شخص تھا اور میں تصور کر سکتا تھا کہ جب وہ اپنے ''سنہری دنوں'' میں کسی مخالف گینگسٹر کی جانب طیش میں بڑھتا ہو گا تو وہ دہشت کے مارے صرف پسینے سے ہی نہیں بھیگ جاتا ہو گا..اس قد و قامت کے ساتھ اس کی آواز بھی اتنی گونج دار اور گہری تھی کہ جب اس نے روسی میں مجھے کچھ کہا تو تقریباً میری گھگھی بندھ گئی..وہ آسانی سے ایک آپرا سنگر بھی ہو سکتا تھا..ویسے وہ روسی ہرگز نہ لگتا تھا کہ اس کے نین نقش مشرقی تھے اور بال سیاہ تھے..

اس نے نہایت فخر سے مجھے اپنا یہ کلچرل کمپلیکس دکھایا..اس میں بہت سی راہداریاں تھیں جن میں درجنوں دروازے تھے اور ان کے اندر بہت کچھ ہو رہا تھا..

ایک مختصر نیم تاریک تھیٹر تھا جہاں گوگول کے مشہور ڈرامے ''ڈیڈ سولز'' کی ریبرسل ہو رہی تھی..جب اداکاروں سے میرا تعارف کروایا گیا تو انہوں نے مجھے گوگول کے تقریباً ہم پلہ سمجھ کر مجھ سے جھک جھک کر ہاتھ ملائے البتہ نوجوان ہدایت کار کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا اور لاپروائی سے داڑھی کھجلاتا رہا..

ایک ریکارڈنگ روم میں کوئی مقامی پاپ گروپ اپنی نئی البم ریکارڈ کروانے میں مشغول تھا..متعدد کلاس روم تھے جہاں چھوٹے بچوں کو مصوری..گلوکاری اور موسیقی کی تربیت دی جاتی تھی..

راہداریوں میں ان فلمی اداکاروں اور معروف موسیقاروں کی تصاویر ابراہیم کے ساتھ آویزاں تھیں..

اگرچہ ابراہیم شاید ایک مخدوش سا مسلمان تھا لیکن مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا تھا..

اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی سے یکسر ناواقف تھا اور جب کبھی وہ مجھ سے مخاطب ہو کر اپنی پاٹ دار آواز میں کچھ کہتا میرا ''تراہ'' نکل جاتا کہ پتہ نہیں ناراض ہو گیا ہے.. آنیا اس کی گفتگو کا انگریزی ترجمہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی' جتنی دیر میں سوچ سوچ کر اٹک اٹک کر وہ ایک فقرے کو انگریزی میں منتقل کرتی اتنی دیر میں ابراہیم دس فقرے مزید بول جاتا..

اس کے ذاتی دفتر کے باہر اس کی ایک حور پری قسم کی پرائیوٹ سیکرٹری بیٹھی تھی جو ہمیں دیکھ کر ہمارے نہیں ابراہیم کے احترام میں فوراً کھڑی ہو گئی.. ہم اس کے دوست ہوتے ہوئے بھی اس سے ڈرتے تھے' ملازموں کا پتہ نہیں کیا حال ہوتا ہوگا..

دفتر کے اندر ایک مشہور ہدایت کار اور ایک ڈرامہ نگار ہماری آمد کے منتظر تھے اور ایک وسیع میز پر روسی لوازمات سج چکے تھے.. خوراک کی ہموار سجاوٹ میں واڈکا کی بوتلیں زرافوں کی مانند گردنیں اٹھائے کھڑی تھیں.. جس کا جی چاہے ان کی گردن پر ہاتھ ڈال لے اور جس کا فی الحال نہ چاہے وہ سیکرٹری حور پری سے کافی یا چائے کی فرمائش کر دے کہ اس کے فرائض میں میزبانی بھی شامل تھی..

میں نے ذرا فرینڈلی ہونے کی خاطر ابراہیم سے اس کے ''امریکی تجربے'' کے بارے میں دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا.. ''ویسے امریکی جیلیں روسی جیلوں سے زیادہ آرام دہ ہیں.. میرا وقت اچھا کٹا.. اب میں یہاں بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہتا ہوں کہ وہاں کچھ بینکوں میں میری بہت مشقت سے کمائی ہوئی دولت جمع ہے اور مجھے شک ہے کہ میرے امریکی ساتھی اس سے عیش کر رہے ہیں.. اگرچہ میں امریکہ سے ڈیپورٹ ہو چکا ہوں لیکن اگر کبھی میں امریکہ میں پھر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تو وہ لوگ اپنی ماؤں کو یاد کریں گے..''

''بالکل کریں گے اس کا مجھے یقین ہے..'' پتہ نہیں آنیا نے اس فقرے کا روسی ترجمہ کیسا کیا کہ وہ بے دریغ قہقہے لگانے لگا..

اس دوران روسی فلموں کی کوئی معروف ہیروئن کمرے میں داخل ہوئی اور ابراہیم سے ''چھچا'' مار کر ملنے کے بعد اس کے گالوں پر ضرورت سے زیادہ بوسے دے کر ایک صوفے پر اس انداز میں بیٹھ گئی کہ لوگوں کی نظریں بھٹکنے لگیں.. میری نظر صرف ایک مرتبہ بھٹکی' دوسری بار بھٹکنے لگی تو مونا نے مجھے ایک کہنی رسید کر دی..

ہماری میٹنگ کا سرکاری طور پر آغاز ہو گیا.. اس کی مختصر ترین روئیداد یہ ہے..

''برادر مجھے میرے برادر ڈخاروف نے آپ کے ماسکو آنے سے پہلے ہی آپ کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا.. آپ ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں.. میں ایک کامیڈی سٹ کام میں دلچسپی رکھتا ہوں.. کیا آپ ہمارے لیے لکھیں گے..''

''میں تو اردو میں لکھتا ہوں..''

''ہم اسے روسی میں ترجمہ کر لیں گے.. جیسے ہم بیشتر امریکی سٹ کام روسی میں ڈھال کر شوٹ کر لیتے ہیں..''

''ہر زبان اور ملک کے مزاح کا مزاج مختلف ہوتا ہے.. مجھے روسی روائت کا کچھ علم نہیں..''

''اگر ٹیلی ویژن دیکھنے والے امریکی مزاح سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں تو پاکستانی سے بھی ہوں گے..''

''کیا امریکی ڈرامے روس میں پسند کیے جاتے ہیں..''

''ہمارے عوام روسی میں ڈھالے ہوئے امریکی مزاحیہ پروگراموں پر جان دیتے ہیں.. آپ ہمارے لیے ضرور لکھیں تاکہ ماسکو میں بھی آپ کا ایک بینک اکاؤنٹ ہو..''

ابراہیم کیا ہی انوکھا اور غیر روایتی کردار تھا.. ایک عام شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ایسا کردار بھی ہو سکتا ہے.. کہنا تو میں چاہتا تھا کہ ابراہیم بھائی آپ سب کچھ چھوڑیں میں آپ کے بارے میں ایک کامیڈی ڈرامہ لکھتا ہوں کہ کیسے آپ کی شکل دیکھ کر ہی آپ کے حریفوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں.. اور وہ تتر بتر ہو جاتے ہیں.. لیکن میں نے اجتناب کیا اور کہا.. ''ویسے آپ کس نوعیت کے کامیڈی پروگراموں میں دلچسپی رکھتے ہیں.. ساس بہو کے جھگڑے.. نوجوان نسل کی بے راہ روی.. خبطی بوڑھے.. پاگل پروفیسر یا مسخرے سیاستدان..''

''میں صرف پیسے میں دلچسپی رکھتا ہوں.. مجھے دولت سے شدید محبت ہے اور میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا.. مجھے پروگراموں کی نوعیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا.. آپ میرے ذاتی ڈاچا میں قیام کریں اور اطمینان سے ہمارے لیے ڈرامے لکھیں.. اگر آپ چاہیں تو میں پاکستان بھی آ سکتا ہوں اگر میں وہاں کچھ دولت کما سکوں تو..''

یہ ''بزنس میٹنگ'' تقریباً دو گھنٹے جاری رہی.. ابراہیم کے علاوہ اس معروف روسی

ہدایت کار اور ڈرامہ نگار نے بھی نہایت پُرجوش انداز میں اس میں حصہ لیا..اس پُرجوشی کا ایک جواز واڈکا کی بوتلوں کی گردنیں مروڑنے میں بھی پنہاں تھا..

وطن واپسی پر میں کتنے اطمینان سے ایک پریس ریلیز جاری کرسکتا تھا کہ..

"تارڑ صاحب کو روس کے سب سے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں نے نہایت منت سماجت کرکے اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ وہ تاریخ میں پہلی بار روس کے لیے ڈرامے لکھیں اور ایک بین الاقوامی مشترکہ فلم سازی اور ڈرامہ سازی کا آغاز کریں..تارڑ صاحب نے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ میری آمد سے پیشتر ہی پورے روس میں دہائی مچ چکی تھی کہ میں آرہا ہوں..میں نے صرف روس پاکستان دوستی کے جذبے کے تحت ان کی پیش کش قبول کرلی ہے..اگرچہ اس سے پیشتر میں ہالی ووڈ کے متعدد پروڈیوسروں سے معذرت کرچکا ہوں..یہ سب تمہارا کرم ہے آقا.."

ہم رخصت ہونے لگے تو ابراہیم نے میرا ہاتھ اپنے شکنجے میں جکڑا اور کہنے لگا "برادر آپ صرف کافی سے ہی شغل فرماتے رہے..واڈکا کو ہاتھ نہیں لگایا.."

"شاید اس لیے کہ میں ایک مسلمان ہوں.." میں نے کچھ نہیں شدید منافقت کا مظاہرہ کیا.."لیکن ابراہیم بھائی آپ نے بھی تو ہاتھ نہیں لگایا.."

"الحمدللہ.." ابراہیم نے نہایت متانت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا.."میرا باپ ایک ازبک تھا اور مسلمان تھا..میں نہیں پیتا لیکن..دوسروں کو پلا کر خوش ہوتا ہوں.."

انیسواں باب

"طارق چودھری لیل پوری..
اَساں جان کے میٹ لئی اَکھ وے"

سیاہ مرسیڈیز کی نخریلی بلی کیسے بے آواز چلتی جارہی تھی..اس کا اندرون اتنا کشادہ تھا کہ وہاں ایک چارپائی ڈال کر قیلولہ فرمایا جاسکتا تھا..چنانچہ ہم پاؤں پسارتے چلے جاتے لیکن ان کی راہ میں رکاوٹ نہ آتی..

اگلی نشستوں کی پشت پر ہمارے سامنے جو سکرین نصب تھی..اس پر کوئی پرانی وضع کی حیادار خاتون نہایت احتیاط سے رقص کررہی تھیں جو کہ ایک بلیک اینڈ وہائٹ سورن لتا تھیں اور ان کے لبوں میں سے زبیدہ خانم کی رس بھری آواز ایک جھرنے کی طرح پھوٹ رہی تھی کہ "اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے..نجھوٹی مُونجی دا پالیا ای لکھ وے..تے ساڈھے دل تک بجاں..

زبیدہ کا یہ گانا بقول کسے ہمیشہ میرے سینے پر تھاہ کرکے لگتا تھا..اور اگر آپ ا۔ے ماسکو کے بھیگے ہوئے موسم میں..کہ رم جھم رم جھم پڑے پھوار کے موسموں میں ہریاول کے جنگلوں اور برستے مینہ سے دوہرے ہوتے گل بوٹوں میں سے گزرتے ایک نخریلی سیاہ مرسیڈیز کے اندر رہے ہوں تو دل پہ کیا گزرتی ہے..بے شک آپ کی بیوی آپ کے پہلو میں بیٹھی ہو تب بھی کیا گزرتی ہے..

ایک خاص عہد کی پاکستانی پنجابی فلمی شاعری ایسی تھی کہ دنیا بھر کی کسی بھی زبان میں اس کا کوئی جوڑ نہ تھا..وہ کسی بھی ورڈز ورتھ..بائرن..پوشکن یا نرودا کی رومانویت سے کم درجے کی نہ تھی..بس اس کی قدر نہ ہوسکی..نہ اس زبان کے بولنے والوں نے قدر کی اور اگر انہوں نے قدر نہ کی تو پھر غیر کاہے کو کرتے..

"ڈنگ پیار دا سینے تے کھا کے.. ہنجو پلکاں وچ چھپا کے.. چُپ رہیے.. کہے نوں سنائیے ناں.."

"جدوں ہولی جئی لیناں ایں میرا ناں.. میں تھاں مر جانی آں.."

"سیو نی میرے دل دا جانی.."

"شکر دوپہر پپلی دے تھلے میں چھنکائیاں ونگاں.."

"سونے دی تو تیڑی.."

"کھلے دل والے بوہے.. اجے میں نیوں ڈھوئے.."

"میری چنی دیاں ریشمی تنداں.."

"سن ونجلی دی مٹھڑی تان وے.. میں تاں ہو ہو گئی قربان وے.."

"کی دم دا بھروسہ یار.. دم آوے نہ آوے.."

"ساہنوں نہر والے پل تے بلا کے.."

اور اس فہرست کا کوئی انت نہیں.. بس ہم نے قدر نہ کی.. ایمان لگتی کہیے کہ کسی بھی زبان میں کوئی ایسا اظہار ہے کہ.. جدوں ہولی جئی لیناں ایں میرا ناں' میں تھاں مر جانی آں..

تو زبیدہ خانم کی آواز میں بھی پنجابی کا یہی جادو جاگ رہا تھا کہ.. اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے..

ہم ماسکو کی دم گھونٹنے والی بھیڑ اور شور شرابے سے باہر آ چکے تھے اور آس پاس برچ کے سفید تنوں والے جنگل برستے مینہ میں اپنی سفیدی مزید نمایاں کرتے تھے..

میں نے مرسیڈیز کے سٹیئرنگ پر بیٹھے وجیہہ اور سمارٹ پاکستانی ڈرائیور سے پوچھا: "بابر صاحب ابھی ہمیں کتنی دور جانا ہے..؟"

یہ بابر صاحب ہم پر کرم کرتے تھے جو ڈرائیور کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے ورنہ وہ ماسکو میں ہمارا مسلسل خیال رکھنے والے.. اکثر فون کرنے والے کہ ہوٹل میں کوئی پرابلم تو نہیں' ماسکو میں کہیں آنا جانا تو نہیں' وہ اس نوعیت کے ہمارے رکھوالے تھے اور دراصل طارق چودھری کے کاروباری نائب تھے.. انہوں نے دو روز پیشتر رابطہ کیا کہ تارڑ صاحب.. اگر ہفتے کی دوپہر کو آپ کی اور کوئی مصروفیت نہ ہو تو چودھری صاحب.. ڈاکٹر طارق چودھری صاحب آپ کو اپنی رہائش گاہ پر مدعو کرنا چاہتے ہیں..

یہ ڈاکٹر طارق چودھری ابھی تک ایک انویزبل مین تھے.. ایک نظر نہ آنے والے.. غائب قسم کے شخص تھے.. ہر محفل میں ان کا تذکرہ چلتا تھا چرچا ہوتا تھا پر وہ دیکھنے کو نہ ملتے تھے اور اب اگر وہ خود سے ہمیں دیکھنا چاہتے تھے اور اپنے آپ کو عیاں کرنا چاہتے تھے تو اس موقع کو میں کیسے ہاتھ سے جانے دیتا.. "بابر صاحب میں بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا منتظر ہوں.."

"میں آپ کو ہفتے کے روز ٹھیک بارہ بجے ہوٹل سے اٹھا لوں گا.." بابر نے نپے تلے انداز میں اطلاع دی اور حسب وعدہ اٹھا لیا اور اب ہم تقریباً نصف گھنٹے سے رواں تھے..

"اگرچہ یہاں بیشتر لوگ.. جو بہت متمول بھی ہیں فلیٹوں میں رہائش رکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کھلی فضاؤں کے دلدادہ ہیں اور انہوں نے ماسکو سے باہر ایک نہایت مخصوص اور پرفضا علاقے میں گھر بنا رکھا ہے.. آپ کے لائل پور کے رہنے والے ہیں.. اس لیے طبیعت بھی ذرا کھلی فضاؤں والی پائی ہے.."

"اور یہ جو سورن لتا گا رہی ہیں زبیدہ خانم کی آواز میں تو اس مرسیڈیز میں کیوں گا رہی ہیں..؟"

"یہ طارق صاحب کی ذاتی گاڑی ہے.. وہ جب بھی سفر کرتے ہیں تو مسلسل زبیدہ خانم اور نور جہاں کے پنجابی گیت سنتے ہیں.."

ہم بالآخر ایک ایسے مخصوص علاقے میں داخل ہو گئے جہاں جگہ جگہ سکیورٹی بیریئر تھے جو اس مرسیڈیز کو دیکھتے ہی اٹھتے چلے گئے.. درختوں میں گھرے اس علاقے میں مناسب فاصلوں پر ایسی رہائش گاہیں گھنی ہریاول اور جھاڑیوں میں سے کبھی نظر آ جاتیں اور کبھی روپوش ہونے لگتیں.. جن کا ظاہر یہ ظاہر کرتا تھا کہ ان کے مکین آسودہ اور ثروت مند ہیں..

میں نے اپنے آپ کو اس نادیدہ چودھری کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا کہ اگر وہ اتنا معروف ارب پتی کاروباری ہے.. یورپ اور پاکستان میں اس کے دفاتر ہیں. یوکرائن میں لوہے کا بیوپار ہے.. آرٹس کانگرس ایسے ہوٹل کا مالک ہے تو وہ ایک تھری پیس سوٹ میں ملبوس' دراز قد' چشمہ لگائے' معمر سگار پھونکتا قدرے متکبر اور کسی حد تک بور شخص ہو گا..

جب ہم دونوں اس کے محل نما گھر کی چکا چوند میں داخل ہوئے تو چند لمحوں کے لیے میں یہ تعین نہ کر سکا کہ ہماری جانب مسکراتے ہوئے جو لوگ بڑھ رہے ہیں ان میں طارق چودھری کون سا ہے.. اس نے میرے تمام اندازوں اور تصورات کو تہس نہس کر دیا تھا.. وہ ایک بونے سے قد کا

سکون میں آیا ہوا.. چوڑی دوستانہ اور دیسی مسکراہٹ والا.. نیلی جین اور مختصر سفید کرتے میں ملبوس.. ایک ایسا شخص تھا جس کی آنکھوں اور بالوں میں ایک کھلنڈرا پن تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "عمر کھاتا" ہے یعنی اس پر عمر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ نوخیز دکھائی دیتا رہتا ہے..

جس ہال نما ڈائننگ اور ڈرائنگ روم میں ہم داخل ہوئے اس میں سنہری آرائش کا ایک بھڑکیلا پن تھا اور وہ روسی زار کے کسی قریبی عزیز کا بھی ہو سکتا تھا..

یہ گھر اور اس کا مکین میرے لیے غیر متوقع تھے..

ہم ٹیلی ویژن ڈرامے لکھنے والے ہمیشہ سٹیریو ٹائپ کردار تخلیق کر کے اپنے تئیں کمال کرتے ہیں.. گاؤں کا ایک چودھری.. ایک ارب پتی کاروباری.. ایک شاعر.. ایک پروفیسر.. ایک مزدور یا ایک فلمی ہدایت کار.. ان سب کے ہم نے مخصوص ٹھپے بنا رکھے ہیں جنھیں ہم لگاتے چلے جاتے ہیں اور جو کوئی ان سے انحراف کرے اُسے کردار نگاری کے فن سے نابلد سمجھتے ہیں.. حالانکہ حقیقی زندگی میں یہ سب ویسے ہرگز نہیں ہوتے جیسے ہم انہیں تخلیق کرتے ہیں..

اور یہ طارق چودھری اتنا نوخیز اور چلبلا نظر آتا تھا کہ اگر اسے ایک نیلے رنگ کا بلیزر پہنا دیا جاتا تو ایف سی کالج کے طالب علم کے طور پر قبول کر لیا جاتا.. وہ نہایت ٹھیٹھ اور دیہاتی محاوروں سے مزین پنجابی بولتا تھا اور اس کا آبائی لہجہ ابھی تک قائم تھا.. اگر وہ کسی مہمان سے انگریزی میں کلام کرتا تو وہ بہت پتلی اور رواں ہوتی اور روسی تو ظاہر ہے اس کی "مادری زبان" تھی..

ماسکو میں اس کی میزبانی کے اعتراف کے طور پر میں اپنی کتابوں کے سوا کسی اور انداز میں اس کا شکریہ ادا نہ کر سکتا تھا..

طارق نے میری تحفہ کردہ کتابوں پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگا.. "میری لائبریری میں آپ کی تحریر کردہ تقریباً سبھی کتابیں موجود ہیں اور یہ دونوں بھی.. لیکن ان پر آپ نے میرے لیے کچھ لکھا ہے اور دستخط کیے ہیں تو ایسی کتابیں میرے پاس نہیں.. شکریہ..!"

یہ ایک عجیب پُرشکر طمانیت کی کیفیت ہوتی ہے کہ آپ ایک پرائے دیس میں ایک گھر میں مدعو ہوتے ہیں اور میزبان آپ کی تحریروں سے شناسا ہوں.. انہیں پسند کرنے والے ہوں..

میں نے ایک نہایت سنہری اور شاہانہ صوفے میں دھنستے ہوئے طارق سے پوچھا: "آپ کی بیگم صاحبہ کہاں ہیں..؟" میں نے جسارت صرف اس لیے کی کہ مونا مجھے مسلسل

گھور رہی تھی کہ تم نے تو کہا تھا کہ وہاں خواتین بھی ہوں گی.. میزبان کی بیگم بھی ہو گی اور یہاں آس پاس موئے مردوں کے علاوہ اور کوئی نہیں..

"سوری.. وہ ذرا آج کی دعوت کے لیے بندوبست کر رہی ہے اور ملازموں کو ہدایات دے رہی ہے.. ابھی آجائے گی.."

تھوڑی دیر بعد طارق کی بیگم آ گئی..

اور اس نے بھی میرے ڈرامائی تصور کا ستیاناس کر دیا کہ اگر طارق چودھری ایک اصیل لیل پوری ہے تو اس کی بیگم بھی زرق برق لباس میں ہیرے جواہرات بھڑکاتی' قدرے صحت مند بلکہ موٹی لیل پوری خاتون ہو گی.. مجھے دوسرا دھچکا یہ لگا کہ وہ ایک نیلی جین اور سیاہ بلاؤز میں ملبوس منحنی ایک رُوسی خوش نظر بی بی تھی اور وہ بھی "عمر کھاتی" تھی.. اس کے مہاندرے سے شاید عینک کی وجہ سے ذہانت ٹپکتی تھی..

ماسکو میں مقیم اب روسی ہو چکے بیشتر پاکستانیوں کی یہی کہانی تھی..

سوویت یونین کے زمانے میں دنیا بھر میں لاطینی امریکہ' افریقہ یا ایشیا میں جو نظریاتی لوگ تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو ایک انقلاب کے خواب کے لیے وقف کر رکھا تھا تو ان کے بچوں کو یا ان کے تجویز کردہ نوجوانوں کو سوویت یونین کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفے عطا کیے جاتے تھے.. پاکستان میں بھی ایسے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کارکن تھے جن کے بچوں یا ان کے تجویز کردہ نوجوانوں کو ماسکو کے تعلیمی اداروں میں داخل کر لیا جاتا تھا اور ان کے تمام تر اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی..

یہ نوجوان.. اوائل عمری میں ہی ماسکو چلے آئے.. کچھ نے تعلیم مکمل کی اور وطن لوٹ گئے.. اگرچہ وہاں روسی یونیورسٹیوں سے حاصل کردہ ڈگریوں کی کچھ قدر نہ ہوئی حالانکہ ان کا معیار یورپ کی بہترین درس گاہوں کے ہم پلہ تھا.. اور کچھ نوجوان یہیں ٹھہر گئے.. روسی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور یہیں آباد ہو گئے.. کہیں کے نہ رہے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے.. تقریباً روسی ہو گئے..

طارق چودھری کی بھی غالباً یہی کہانی ہو سکتی تھی..

اس نے اپنے متعدد قریبی دوستوں کو بھی آج کی دعوت میں مدعو کر رکھا تھا..

وہاں شہزاد شیخ.. ایک وجیہہ اگرچہ ہوشیار شیخ بھی تھے اور کون سا ایسا شیخ ہے جو کاروبار

کے معاملے میں ہوشیار نہ ہو..اور وہ دیگر کاروباری مشاغل کے علاوہ ماسکو کے واحد اور نہایت بلند درجے کے ریستوران "گندھارا" کے خالق تھے.. اس نہایت ثقافتی اور متاثر کرنے والے ریستوران میں بھی طارق چودھری کا کچھ عمل دخل تھا..اور ان حضرت شیخ کی بیگم بھی چنیوٹ یا نارووال کی نہ تھیں، روسی تھیں..ان کی جڑواں بیٹیاں نیلے ڈینم کے فراکوں میں سب کی منظور نظر تھیں اور وہ "السلام علیکم" کہتی ہوئی کتنی پیاری لگتی تھیں..

ایک عدنان بٹ صاحب تھے..نہایت نوخیز..سمارٹ..چیتے کے پیٹ والے سمارٹ سے بٹ صاحب..وہ ایک فِٹ نیس سنٹر چلاتے تھے کہ خود بھی بہت فِٹ تھے..ایک سپر مارکیٹ کا دھیان رکھتے تھے اور ایک جاپانی ریستوران کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے بلکہ اس کے مالک بھی تھے..ایک اور..اگرچہ نوخیز دکھائی دیتے..اور کبھی ذرا ادھیڑ عمری کا تاثر دیتے..نیلی ٹی شرٹ اور پھیکی پھیکی جین میں ملبوس ذرا بے چارے دکھائی دینے والے حضرت بھی موجود تھے جو طارق کے بزنس پارٹنر شنکر گپتا تھے..

شنکر نے مجھے بڑے فخر سے بلکہ متعدد بار بڑے فخر سے بتایا کہ میری ماں لاہور کی تھیں اور باپ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے..

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خود شنکر گپتا کہاں کے ہیں..

وہ پتہ نہیں کہاں کہاں کے تھے..پیدا کہیں سنگاپور میں ہوئے تھے..پلے بڑھے شاید انگلستان میں تھے..کاروبار روس اور چین میں کرتے تھے..شنکر کے انداز اور اطوار سے بھی قطعی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ٹائیکون ہو سکتے ہیں..

مجھے یہ کہہ لینے دیجیے کہ طارق چودھری کی رہائش گاہ میں میرے لیے جس خصوصی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا اس میں مدعو تقریباً تمام مہمانوں کی نشست و برخواست اور گفتگو نہایت عوامی اور اپنی اپنی زمین سے جڑی ہوئی تھی..وہ سب کے سب روس کے متمول ترین افراد میں شمار ہوتے تھے اور اس کے باوجود مجال ہے کہ ان کی حیثیت کا شائبہ بھی ہو جائے..البتہ کھانے پینے اور مشاغل کی پسند سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بین الاقوامی جیٹ سیٹ میں حرکت کرنے والے لوگ ہیں..

اس صورت حال کا موازنہ ہندوستان اور پاکستان سے کر لیجیے جہاں کسی محفل میں جب ایک ارب پتی داخل ہوتا ہے تو اس کے انداز و اطوار اور نشست و برخواست کی کیفیت ایسی

ہوتی ہے جیسے اس نے اپنے منہ کے سامنے ایک لاؤڈ سپیکر جما رکھا ہو کہ اے لوگو مجھے دیکھو..اے کیڑے مکوڑو مجھے دیکھو..دیکھو کہ میں کیسے لباس میں ہوں اور کیسی بیش قیمت کار میں سے اترا ہوں..اور اس کی بیگم بھی ہیرے جواہرات سے بوجھل چھنکارتی ہوئی چلی آتی ہے..

ذرا تاخیر سے ایک سندھی ہندو اپنی روسی بیگم کے ہمراہ آئے اور حسب سندھی روایت ایک شیشوں کے کام والی رنگین دھاگوں سے کاڑھی ہوئی سندھی ٹوپی اوڑھے ہوئے آئے..اور جب تعارف ہوا تو کہنے لگے.."میں جانی ہوں.."

"ایک سندھی ایک جانی کیسے ہو سکتا ہے.."میں نے ہنستے ہوئے کہا..

"ویسے تو میرا نام اشوک ہے..لیکن دوستوں کے دائرے میں جانی کے نام سے جانا جاتا ہوں.."

"اشوک صاحب آپ کا نام بیک وقت تاریخی اور فلمی ہے..اشوک کمار طرز کا تو آپ ایک معمولی سے انگریزی جانی کیسے ہو گئے..؟"

"تو پھر آپ مجھے اشوک کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں.." وہ مسکراتے ہوئے بولا.."میری ماں بھی مجھے اشوک کہتی ہے.."

اب یہ اشوک بھی ایک عجیب سا جانی تھا..

مجھے کچھ ٹھیک طرح سے تو یاد نہیں کہ اس نے اپنا حسب نسب کیا بیان کیا البتہ اتنا یاد ہے کہ موصوف پیدا فن لینڈ میں ہوئے تھے اس لیے آئس ہاکی کے اتنے شوقین تھے کہ مسلسل کسی دوست سے رابطہ رکھے ہوئے تھے جو ان کے لیے روس اور فن لینڈ کے درمیان کھیلے جانے والے میچ کے لیے ٹکٹوں کے حصول کی کوشش کر رہا تھا..اس دوران ان کی جان پر بنی رہی کہ اگر مجھے ٹکٹ نہ ملے تو میں کیا کروں گا..خودکشی کر لوں گا..کیا کروں گا اور بالآخر جب انہیں اطلاع ملی کہ دو ٹکٹ صرف تین ہزار ڈالر کے عوض مل گئے ہیں تو ان کی جان میں جان آئی..یہ جانی جن کی جان میں جان آئی تھی آئس ہاکی کے علاوہ دیگر سپورٹس کے بھی شدید شیدائی تھے اور انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ روسی ٹینس کھلاڑی سفین ان کا ذاتی دوست ہے..

طارق چودھری کا نوجوان بھتیجا جو ابھی حال ہی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ماسکو آیا تھا میرا بہت دھیان رکھ رہا تھا..

یہ جتنے بھی لوگ تھے ان میں سے بیشتر کروڑ پتی یا ارب پتی تھے لیکن بے وطن لوگ

تھے.. اکھڑے ہوئے بے سہارا لوگ تھے.. اگرچہ وہ بین الاقوامی سطح پر ایک ایسی پرتعیش زندگی بسر کرتے تھے جس کا تصور پاکستان میں کیا ہی نہیں جا سکتا لیکن اس کے باوجود ان کے اندر ان کی آبائی ثقافت' زبان اور مذہب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے لیے ترستے تھے.. ایسی محفلیں سدا نہ جمتی تھیں کہ بقول طارق ہم سب اکثر ایک دوسرے کو ایئرپورٹوں اور ہوائی جہازوں کے اندر ملتے ہیں.. کوئی کسی کاروباری منزل کی جانب رواں ہوتا ہے اور کوئی دنیا کے دوسرے سرے پر کسی میٹنگ میں جا رہا ہوتا ہے.. ہم ایسے آج کی طرح ایک ہی گھر میں سارے دن کے لیے کم ہی اکٹھے ہوتے ہیں.. آپ کا سبب بھی بن گیا تو ایک مدت کے بعد ہم سب مل بیٹھے..

طارق کی شکل حیرت انگیز طور پر میرے ایک مرحوم دوست حنیف چودھری سے بہت ملتی تھی.. اتنی زیادہ کہ اگرچہ اسے کار کے حادثے میں ہلاک ہوئے مدتیں گزر گئیں لیکن میں جب کبھی طارق کی جانب بے دھیانی میں نگاہ کرتا تو ایک لمحے کے لیے میرا دل رک جاتا.. کہ حنیف..! ڈرائنگ روم کے ایک جانب دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طویل میز چلی جاتی تھی جو اشیائے خورد و نوش سے یوں ڈھکی ہوتی تھی' جیسے وہ خوراک سے لبریز ایک جہاز ہو جو ابھی متحرک ہو جائے گا.. دو باوردی روسی نژاد ویٹر ایک مؤدب حالت میں ایستادہ مہمانوں پر نظر رکھے ہوئے تھے اور وہ وہیں کھڑے بھانپ لیتے تھے کہ کس مہمان کا گلاس اب ہونٹوں کی جانب اٹھ رہا ہے اور جب واپس آئے گا تو خالی ہو چکا ہوگا.. چنانچہ اتنی دیر میں وہ پھر سے اس گلاس کو مشروب سے لبریز کر دیتے جو اس مہمان کا من پسند ہوتا.. اور وہ ویٹر مہمان کو اس لبریزی سے اتنے بے خبر رکھتے.. یوں خاموشی سے دبے پاؤں اس کا گلاس پھر سے بھر دیتے کہ مہمان کو شائبہ ہوتا کہ وہ جب سے آیا ہے تب سے پہلا گلاس ہی پی رہا ہے.. اور یہ مشروب بھی وہ نہ تھے جو کسی بھی ریستوران یا خرابات خانے میں میسر ہو سکتے ہیں.. یہ متمول افراد کے مہنگے ذوق والے بہت مہنگے مشروب تھے کہ اگر فرانس کی وائن ہو تو انگوروں کے فلاں باغ کی ہو اور کم از کم تیس برس تک کسی چوبی ڈرم میں اپنے خمار کو پختہ کرتی رہی ہو اور اگر سکاٹ لینڈ کے پانی ہوں تو وہ نہ ہوں جو ہر کوئی پیتا ہے.. وہ ہوں جو اتنے گراں ہوں کہ کوئی نہ پی سکتا ہو..

انسان بے شک گپتا کی مانند سنگاپور میں پیدا ہوا اور اشوک کی طرح فن لینڈ میں پلا بڑھا ہو یا طارق ایسا تقریباً روسی ہو اس کے اندر اس کی قدیم روایت اور اخلاقیات کی جڑیں موجود رہتی

ہیں اور ان جڑوں میں اس کے وطن کی مٹی ہوتی ہے جو کبھی مردہ نہیں ہوتی چنانچہ یہاں.. ماسکو میں بھی زنانہ اور مردانہ ڈبے الگ ہو چکے تھے..

مونا بیگم ایک جانب روسی بیگمات کے ہمراہ نہایت آسودگی کی کیفیت میں گفتگو کر رہی تھیں اور جب ایک روسی ویٹر نے شاید 1922ء میں کشید کردہ فرانسیسی وائن کی بوتل گھما کر نمائش کرتے ہوئے اجازت چاہی کہ میڈم.. تو میڈم مونا نے اسے اس بری طرح گھورا کہ وہ غریب ہراساں ہو کر فوراً کوئی جوس وغیرہ اٹھا لایا..

مہمانوں میں کوئی ایک آدھ دانہ ایسا تھا جو اجتناب کرتا تھا یعنی ٹی ٹوٹلر تھا.. بٹ صاحب بھی ایک ایسے ہی دانے تھے..

مجھے قدرے تشویش ہونے لگی کیونکہ چار بجنے کو تھے اور باقاعدہ کھانے کے کوئی آثار نہ تھے.. اور طارق نے میری تشویش بھانپ لی.. ظاہر ہے وہ بھانپ لینے میں ماہر تھا ورنہ کاروبار کی اس معراج کو کہاں پہنچتا.. "تارڑ صاحب.. میرا ارادہ تھا کہ آپ کے لیے باہر کھلی فضا میں باربی کیو کا بندوبست کیا جائے لیکن ماسکو کے موسم پر میرا کچھ اختیار نہیں.. بارش تھمنے میں نہیں آ رہی".. اور میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ دبیز سنہری پردوں کے پار جو ایک دل کش لان ہے اس کی ہریاول مسلسل بھیگتی چلی جا رہی ہے.. "تو جب تک موسم بہتر نہیں ہو جاتا آئیے کچھ عارضی بندوبست کر لیتے ہیں.."

ڈائننگ ٹیبل پر کچھ نا شناسا سی خوراکیں تھیں اور کثیر تعداد میں تھیں اور آپ جس ڈش کی جانب بھی ذرا غور سے دیکھتے تھے تو ویٹر آگے بڑھ کر اسے آپ کی پلیٹ میں سجا دیتا تھا چنانچہ میں نے اپنی پلیٹ ذرا پوشیدہ رکھی تاکہ پہلے یہ تعین کر لوں کہ ہے کیا کیا اور پھر اپنی پلیٹ کو ظاہر کروں گا..

"تارڑ صاحب.. آپ ذرا یہ ٹینڈے تو چکھیے' ادھر نہیں ہوتے' پاکستان سے منگوائے ہیں.."

مرتا کیا نہ کرتا.. مروت کا معاملہ تھا ایک دو ٹینڈے اپنی پلیٹ میں ڈال لیے کہ انسان ماسکو آئے اور پھر بھی ٹینڈے کھائے تو ماسکو کیوں آئے اپنے چیچو کی ملیاں کیوں نہ چلا جائے.. ابھی میں ان ٹینڈوں کو حلق سے اتارنے کی سعی میں مصروف تھا کہ طارق نے ایک اور ڈش سامنے رکھ دی.. "تارڑ صاحب.. یہ دال کدو بھی چکھ کر دیکھیے.. یہ کدو میں نے دوبئی سے درآمد کیے ہیں.."

اب میں نے ذرا بغاوت کر دی.. "طارق.. آپ روسی ہو چکے ہیں اور ابھی تک دال کدو

نہیں بھولے..''

مسکراہٹ جو طارق کے لبوں پر آئی اس میں وچھوڑا سا تھا' جدائی کی اداسی تھی..''میں ذات کا لیل پوری ارائیں ہوں..اور یہ ہماری مرغوب خوراک ہوا کرتی تھی..میں اسے کھاتا ہوں تو ان دنوں میں پہنچ جاتا ہوں جب میں لیل پور میں بے کار پھرتا تھا..روزگار کے لیے سرگرداں رہتا تھا..''

صرف وہ انسان اپنے معمولی اور تلخ ماضی پر فخر کر سکتا ہے جو اپنی ذاتی ذہانت اور مشقت سے کسی بھی شعبے میں اوج کمال پر پہنچ جائے..چاہے یہ ادب ہو' مصوری ہو یا کاروبار ہو..تب وہ افورڈ کر سکتا ہے کہ اپنے ماضی کو ایک رومان کی صورت کھلے عام بیان کر سکے..اور اگر نصیب ساتھ نہ دے اور زندگی اس کی جھولی میں صرف ناکامیاں اور حسرتیں ڈال دے جن کا کچھ شمار نہ ہو تو وہ اپنے ماضی کو بھی پوشیدہ رکھنے لگتا ہے..میرا عزیز اور پاکستان کا ایک بڑا مصور بشیر مرزا ہمیشہ نہایت فخر سے بتایا کرتا تھا کہ میرے والد صاحب امرتسر میں ریڑھے اور تانگے پینٹ کیا کرتے تھے..ان پر گل بوٹے اور تاج محل بنایا کرتے تھے..یہ جو شوخ و شنگ رنگ میری تصویروں میں ہیں یہ سب ان کی دین ہیں..

ترک ناول نگار یاشر کمال ہمیں بتاتا ہے کہ وہ ایک زمانے میں ڈاک خانے کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دہقانوں کے لیے خط لکھا کرتا تھا..راجندر سنگھ بیدی لاہور کے ایک ڈاک خانے میں خطوں پر مہریں لگایا کرتا تھا..جوزف سٹالن کو فخر تھا کہ وہ ایک موچی کا بیٹا ہے..چنانچہ یہ سب اعتراف صرف کامیابی کا کرشمہ ہیں..

اگر طارق چودھری اپنے ماضی کے بارے میں کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ تھا' اسے بے دریغ بیان کر دیتا تھا تو صرف اس لیے کہ کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے..

کہنے لگا..''میری ماں جی جب اس گھر میں آئیں تو کہنے لگیں پتر گھر کے اردگرد اتنی زمین بے کار پڑی ہے یہاں پیاز کیوں نہیں کاشت کر لیتے..''

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ماں جی نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا یہ صرف طارق کا ایک ارمان تھا کہ وہ اپنی جڑوں کی جانب لوٹ جائے..

''اور انہوں نے کار میں بیٹھتے ہوئے میرے سفید فام روسی ڈرائیور کو دیکھ کر فرمائش کی تھی کہ ہائے پتر تیرا تو نوکر بھی انگریز ہے..اس کے ساتھ میری ایک فوٹو بناؤ تاکہ میں لیل پور

جا کر بتاؤں کہ طارق کا تو ڈرائیور بھی گورا ہے..''

اس بارے میں مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ماں جی نے یہی کہا ہوگا..بھی مائیں ایسی ہوتی ہیں..میری ماں بھی ایسی ہی تھی..

اور جس شخص کا ''ڈاچا'' اس کا کنٹری ہاؤس ماسکو سے باہر کہیں پر فضا جنگلوں میں گھرا ہو..ندیوں کے کنارے..شہر سے دور...کھلی فضاؤں میں اور وہ علاقہ اتنا مہنگا ہو کہ اس کا نزدیک ترین ہمسایہ روس کا صدر پیوٹن ہو تو وہ شخص اپنے معمولی ماضی کو زندہ رکھنا افورڈ کر سکتا ہے..

کچھ لوگ نیچے چلے گئے تھے..

نیچے ایک بلیئرڈ روم تھا اور ایک سوئمنگ پول تھا..

''تارڑ صاحب آیئے..'' بارش تھم چکی تھی..''نیچے لان کے سامنے والے برآمدے میں محفل سجاتے ہیں..میرا پاکستانی باورچی کوئلوں پر کباب اور پران بھون رہا ہے..''

نیچے جاتے ہوئے ہم خواتین کی محفل میں سے ہو گزرے..وہ ایک ڈائننگ ٹیبل پر براجمان کھانا تناول کر رہی تھیں اور میمونہ پنجابی صوفی شاعری کے بارے میں روسنوں کو آگاہ کر رہی تھی..اس نے مجھ پر ایک شک کی نگاہ کی کہ جانے یہ کیا کر رہا ہے..حالانکہ میں وہی کچھ کر رہا تھا جس کا اسے شک تھا..کچھ بھی نہیں کر رہا تھا..

ششیکر گپتا بہت ہی گپتا ہو رہا تھا..یہ تارڑ صاحب لاہور سے آئے ہیں اور میری ماں بھی لاہور کی ہے اور فادر سیالکوٹ کے تھے' اگرچہ میں نے نہ لاہور دیکھا ہے اور نہ سیالکوٹ..گپتا ٹھیٹھ پنجابی بولتا تھا اور بولتا ہی چلا جاتا تھا..

اشوک جو اب جانی سے پھر خالص سندھی اشوک ہو چکا تھا' بار بار اپنے آفس والے رابطے سے دریافت کر رہا تھا کہ ٹکٹ تمہاری جیب میں ہیں ناں..ذرا پھر سے چیک کر لو..

طارق ایک کمال کا لیل پوری سٹائل داستان گو تھا..اس نے بہت سی کہانیاں سنائیں اور ان میں ایک کہانی کسی پٹھانی تصادم کے بارے میں تھی جو مجھے یاد نہیں رہی..یاد ہوتی تو بھی اس کو بیان کرنا مناسب نہ جانتا..صرف اس لیے کہ طارق کو جو کہانیاں میں نے سنائیں اگر وہ بیان کر دے تو کیسا غدر برپا ہو جائے..اس لیے خاموشی ہی مناسب ہے..

بہت بعد میں مجھے علم ہوا کہ طارق چودھری واقعی اپنے لیل پور سے غافل نہیں ہوا اور اس نے وہاں کچھ فلاحی ادارے قائم کر رکھے ہیں اور لاہور کے قریب ایک سٹیل مل صرف اس لیے

بنائی ہے کہ پاکستان کے ساتھ اس کا رشتہ برقرار رہے اور اس کا نام اس نے "سانڈل بار سٹیل مل" صرف اس لیے رکھا ہے کہ وہ پنجابی روایت سے جڑا ہوا ایک شخص ہے..

شہزاد شیخ نے بہت اصرار کیا بار بار درخواست کی کہ آپ بہر صورت کچھ وقت نکال کر میرے "گندھارا ریستوران" میں آئیں اور بے شک اپنے ہمراہ پورے ماسکو کو لے کر آئیں اور بٹ صاحب نے بھی اپنے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑپھڑا کر مجھے دعوت دی کہ آپ نے بہر صورت میرے جاپانی ریستوران میں آنا ہے اور سوشی کھانی ہے..

بٹ حضرات کی خوراک سے رغبت تو ایک طے شدہ تاریخی سچائی ہے کہ کسی بٹ صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کتنا کھاتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ کتنے کا تو پتہ نہیں بس دو گھنٹے کھاتے ہیں..

تو ایک بٹ صاحب اگر نہاری.. سری پائے.. ہریسہ یا حلیم کی دکان کھول لیتے ہیں تو حیرت نہیں ہوتی لیکن ایک جاپانی ریستوران کھول کر کچی مچھلی سوشی فروخت کرنے لگتے ہیں تو بات سمجھ میں نہیں آتی.. لیکن وہ بٹ ہی کیا جس کی کوئی بات سمجھ میں آ جائے..

باہر.. اس برآمدے میں ہوا کی خنکی اور نمی ہمارے تمتماتے چہروں پر سرد پھاہے رکھتی تھی اور وہاں ایک بھیگی ہوئی اداسی تھی جو جس کو چھوتی تھی اسے اپنے وطن واپس لے جاتی تھی..

طارق نے اپنے پاکستانی باورچی پر کچھ اعتبار نہ کیا اور گلے میں ایپرن باندھ کر ایک لیل پوری باورچی ہو گیا.. کوئلوں پر.. آگ کے سامنے کھڑے ہو کر مچھلی.. پران اور نیوزی لینڈ سے درآمد شدہ دنبے کی چانپیں سینکنے لگا.... اور پھر ایک طشتری میں سجا کر ایک مؤدب ویٹر کی مانند ہمیں پیش کرنے لگا..

روسی ویٹر جو بہت ڈرے ڈرے اور افلاس کے مارے ہوئے لگتے تھے آگے بڑھتے تو وہ انہیں ڈانٹ دیتا.. یہ میرے دوست ہیں.. مجھے ان کی خدمت کرنے دو.. تارڑ صاحب یہ والگا دریا کی نہایت لذیذ مچھلی ہے ذرا اسے چکھئے..

باہر ابھی تک روشنی تھی..

ہم دوپہر میں آئے تھے اور اب شام ہو چکی تھی.. اور رات ہونے کو تھی.. نو بجنے کو تھے اور پھر بھی باہر روشنی تھی..

ایک بکر روشنی تھی.

یہ ماسکو کی سفید راتیں تھیں..

شب کو یہاں دن کی سفیدی کا سماں تھا..

سیاہ مرسیڈیز وہی تھی لیکن اب بابر کی بجائے اسے طارق کا ایک دراز قد مسلمان تاتار ڈرائیور خاموشی سے چلا رہا تھا..

رخصت ہوتے ہوئے طارق نے مجھ سے جو کچھ کہا اور جو تحائف پیش کیے وہ سب کچھ حساب دوستاں کے ضمن میں آتا ہے..

میمونہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ بہن جی آپ نے دوبارہ آنا ہے.. بہر صورت آنا ہے..

بہن جی نے کہاں دوبارہ ماسکو آنا تھا.. 22-بے گلبرگ لاہور کے اپنے مختصر گھر کو چلانا تھا.. دودھ والے کا حساب کرنا تھا.. بھنڈیاں پکانی ہیں یا دال کو تڑکا لگانا تھا.. بے وجہ متحرک پنکھوں کو آف کرنا تھا اور ہر کمرے میں جو بلب یونہی روشن ہو رہے ہیں انہیں گل کرنا تھا تاکہ بجلی کا بل کم آئے.. زیادہ سے زیادہ نیو یارک چلے جانا تھا تاکہ اپنے نواسے نوفل کی چاکری کر سکے.. ماسکو کہاں آنا تھا..

سیاہ مرسیڈیز.. ایک بلند قامت تاتار جو اسے خاموشی سے ڈرائیو کرتا جا رہا ہے اور ہم ماسکو کی سفید رات میں چلے جاتے ہیں..

طارق نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے جھک کر زادِ راہ کے طور پر ایک سی ڈی آن کر دی تھی اور اب مرسیڈیز کے اندر زبیدہ خانم کی آواز گونجتی تھی..

اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے..

ان سفید راتوں میں..

اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے..

بیسواں باب

"یانیا، تانیا، کرسٹینا برگیڈ اور کریملن کے تابوت"

آج آنیا نہیں آئی تھی..

آنیا.. برگیڈ کے تین رنگروٹ بلکہ رنگروٹنیاں ہم دونوں کے گرد پریڈ کرتی ہمیں کریملن دکھانے کو جاتی تھیں..

ان میں جھیل بیکال کی چکیلی دانش مند سی تانیا تھی جو سروقد ہو رہی تھی ایک سیاہ جین اور جیکٹ میں..

اور وہ فتنہ ساماں یانیا تھی جو میرے صبر کا امتحان لیتی تھی.. ایک نیلے کوٹ اور سیاہ سکرٹ میں..

اور نئی رنگروٹ کرسٹینا تھی نیلی جین اور سرخ کوٹ میں اور وہ اتنی پیاری اور بھولی بھالی شکل کی تھی اور سدا مسکراتی تھی کہ مجھے عینی یاد آنے لگی..

کمیونزم کے زمانوں میں کسی بھی شخص سے یہ پوچھنا بیکار تھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے کیونکہ مذہب کو افیون قرار دے دیا گیا تھا.. قرار تب دیا گیا تھا لیکن یہ سچ اب ثابت ہو رہا ہے کہ نئے روس کے رہنما عوام الناس کو یہ افیون بے دریغ مہیا کر رہے ہیں تاکہ وہ اونگھتے رہیں اور ہم سے کچھ سروکار نہ رکھیں کہ ہم کیا کرتے ہیں.. تو ان زمانوں میں اگر بہ فرض محال کسی سے پوچھ ہی لیتے تھے کہ آپ کا عقیدہ کیا ہے تو بے شک وہ پانچ وقت کا نمازی ہو.. جیب میں تورات کا صحیفہ ہو یا گلے میں صلیب پوشیدہ کر رکھی ہو تو جواب یہی ہوتا تھا کہ کامریڈ میں تو دل و جان سے مارکس اور اینگلز کی تعلیمات پر یقین رکھتا ہوں.. پکا کمیونسٹ ہوں.. یعنی ان زمانوں میں دراصل مذہب کی بجائے کمیونزم کی افیون کا رواج تھا..

چونکہ ہم کریملن کی چاردیواری کے اندر جا رہے تھے جہاں روس کے قدیم ترین اور متبرک کلیساؤں کا ایک جمگھٹا ہے تو میں نے مناسب جانا کہ اس برگیڈ کی بچیوں کے مذہبی عقیدے کے بارے میں تھوڑی سی تفتیش کر لی جائے..

"کرسٹینا آپ کیا ہو..؟"

"میں.." وہ بھولی صورت مزید بھولی ہو گئی.. "اب میں ایک عیسائی ہوں.."

"پہلے نہیں تھیں..؟"

"نہیں.."

"کیوں..؟"

"پہلے میرے ماں باپ کمیونسٹ تھے لیکن اندر سے مذہبی خیالات رکھتے تھے چنانچہ جب نظام تبدیل ہوا تو انہوں نے تب تک پوشیدہ رکھے عقیدے کو ظاہر کر دیا اور عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا.. اس لیے اب میں بھی عیسائی ہوں.."

"اور تم یانیا.."

اس فتنہ ساماں نے پہلے تو اپنے سینے کو ایک سیاہ رومال سے ڈھکا کہ فتنہ سامانی کا منبع وہی تھا.. اور میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ نظر ہٹنے سے انکاری ہو جاتی تھی کیونکہ اس کے گلے میں جو صلیب تھی وہ نہایت ابتری اور بے چینی سے ادھر ادھر لڑھکتی پھرتی تھی کہ کہیں تو کوئی ہموار سطح ملے جہاں میں آرام کر سکوں.. اور ہموار سطح کہاں ملتی تھی "میں تو عیسائی ہوں.."

"لیکن تم روسی نہیں دکھائی دیتی.. کیونکہ تمہارے بال سیاہ ہیں اور رنگت میں بھی ایک دودھیا گھلاوٹ ہے.. آنکھوں میں بھی سیاہی ہے اور تم اطالوی لڑکیوں کی مانند کیا کہنا چاہیے.. ذرا صحت مند ہو.."

"ہاں وہ تو اس لیے کہ میں یہودی ہوں.."

"لیکن وہ تو تم عیسائی نہیں ہو..؟"

"وہ تو میں ہوں.. لیکن میرے دادا یہودی تھے.. اور ماں باپ عیسائی تھے.."

"یہودی تو عیسائی نہیں ہوا کرتے.."

"وہ تو شاید اس لیے کہ میرے باپ جو کہ یہودی تھے میری ماں سے جو کہ عیسائی تھی شادی کرنا چاہتے تھے.. تو ماں نے ہمیں عیسائی بنا دیا.. میرے ماں باپ دونوں ڈاکٹر ہیں.."

"پھر تو وہ بہت آرام وہ زندگی گزارتے ہوں گے یانیا۔"

"وہ تو آرام وہ زندگی نہیں گزارتے.. بہت کام کرتے ہیں پھر گزارہ ہوتا ہے.. کیونکہ وہ تو سرکاری ملازم ہیں اور ان کی ماہانہ تنخواہ صرف دوسو ڈالر ہے.."

"تو وہ پرائیویٹ پریکٹس کیوں نہیں کرتے اب تو اس کی اجازت ہے۔"

"وہ تو اب اتنے جوان نہیں ہیں اور انہیں سرکاری ملازمت پسند ہے۔"

"کیا وہ آسانی سے امریکہ نہیں جاسکتے جہاں ڈاکٹروں کے وارے نیارے ہیں۔"

"وارے نیارے سے کیا مطلب..؟" یاد رہے کہ یہ گفتگو کسی حد تک اردو میں ہو رہی تھی۔

"مطلب یہ کہ وہاں ڈاکٹر بہت دولت کماتے ہیں۔"

"ان کے کچھ رفیق امریکہ چلے گئے ہیں لیکن وہ دونوں نہیں جاتے.. وہ روس سے بہت محبت کرتے ہیں.. روس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے.. ایسے لوگ ہوتے ہیں۔"

"اور تم تانیا..؟"

تانیا ذرا سیدھی ہوئی اور کہنے لگی.. "میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"کچھ تو ہو گی۔"

"نہیں.. مجھے کوئی سہارا یا عقیدہ درکار نہیں.. میں آزاد خیال ہوں.. صلیب میرے لیے بہت بھاری ہے، میں اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔"

یعنی ہم پانچ دنیا کے تین اہم ترین مذاہب کی نمائندگی کر رہے تھے.. ہم دونوں مسلمان تھے.. کرسٹینا عیسائی تھی.. اور یانیا کی رگوں میں یہودی خون دوڑ رہا تھا.. اور تانیا ایک آزاد پنچھی تھی اسے کسی ایک ڈال پر بیٹھ جانا پسند نہ تھا..

یہ تینوں بھی آنیا کی ہم جماعت تھیں اور اردو پڑھتی تھیں.. ان میں یانیا کے بارے میں پروفیسر ماریانا نے ہمیں خصوصی طور پر بتایا تھا کہ یہ لڑکی سب سے بہتر اردو بولتی ہے اس لیے کوشش کیجیے گا کہ اس کے ساتھ صرف اردو میں بات چیت کریں.. اور واقعی یانیا بہت ہونہار تھی۔

وہ اردو کے ہر فقرے کا آغاز "یہ تو"...... سے کرتی۔

"یانیا یہ کریملن کی دیوار کے سائے میں جو پھول ہیں.. یہ کون سے ہیں..؟"

"یہ تو ٹیولپ ہیں اور یہ تو پیارے ہیں۔"

"اور یہ مجسمہ کس کا ہے..؟"

"یہ تو مارشل ژوخوف کا ہے، جس نے نازیوں کو یہ تو شکست دی تھی.. یہ تو ہمارا ہیرو ہے.."

"اور اس کلیسا کے اندر جو درجنوں تابوت ہیں ان کے اندر کیا ہے..؟"

"ان کے اندر تو صوفی حضرات کا مردہ ہے۔"

"اور کریملن کی دیوار کے نیچے جو دریا بہہ رہا ہے یہ کون سا ہے..؟"

"یہ تو دریائے ماسکو کی ندی ہے.. اس میں تو کشتی تیرتی ہے.. کیا آپ اور میمونہ آئس کریم کھائیں گے کہ یہ تو آئس کریم ہے اور یہ تو بہت مزیدار ہے۔"

کریملن کے احاطے میں داخل ہوتے ہی یانیا نے سنہری گنبدوں والے نہایت عالی شان اور خوش نظر قدیم کلیساؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا.. "یہ تو مسجدیں ہیں۔"

"ہیں.. کیا یہ کلیسا نہیں ہیں..؟"

"کلیسا.. وہ کیا ہوتے ہیں یہ تو مسجدیں ہیں جہاں عیسائی لوگ عبادت کرتے ہیں۔"

"یانیا عیسائی تو کلیسا یا چرچ میں عبادت کرتے ہیں۔"

"اچھا..؟" وہ حیران سی ہوئی.. "یہ مسجدیں نہیں ہیں..؟ کیونکہ ہمیں اردو میں پڑھایا جاتا ہے کہ عبادت کرنے والی جگہ کا نام مسجد ہوتا ہے۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ اے بے راہ رو کر دینے والی لڑکی اگرچہ تم درست کہتی ہو کہ عبادت کے مقام کو مسجد کہتے ہیں لیکن مختلف مذاہب کی عبادت کے مقام مختلف نام رکھتے ہیں..

اگر یانیا کو دیکھ کر مجھ ایسے بزرگ حضرات بے راہ رو ہو جاتے تھے تو جانے جوانوں پر کیا گزرتی ہو گی.. اسے اگر آغا حشر کاشمیری دیکھ لیتے تو یقیناً "یہودی کی لڑکی" کے بعد "یہودی کی پوتی" نام کا ڈرامہ بھی لکھنے پر مجبور ہو جائے۔

کریملن کے وسیع احاطے کے اندر کل سات عدد نہایت محترم اور مقدس کلیسا تھے.. دی ازمپشن کیتھڈرل.. دے انوسی ایشن کیتھڈرل.. دی آرک اینجل کیتھڈرل.. دی پیٹری آرچ.. دی چرچ آف آور لیڈیز ہوسارب اور اسی نوعیت کے دو اور کلیسا..

یہ سب کے سب سنہری گنبدوں والے کلیسا عقیدت اور ایمان کے معجزے تھے.. ان کی چھتوں اور دیواروں کی سنہری اور سیاہ مصورانہ آرائش بے مثل تھی.. کعبہ میرے آگے ہے تو کلیسا میرے پیچھے.. تو کوئی ایسا ہی دل نشیں کلیسا غالب کے پیچھے ہو گا ورنہ وہ کیوں اتنے تذبذب میں پڑتا اور کفر اسے کھینچتا..

ان کلیساؤں کے بام و در پر جو شبیہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہ السلام اور روسی صوفیوں اوتاروں کی نقش ہیں ان سب میں ایک سیاہ سوگواری اور گہرا رنج ہے کہ یہ روسی مزاج میں جو دائمی اداسی اور الم ہے اس کی نمائندگی کرتی ہیں.. ایک ہی عقیدے کو ہر قوم اپنے مزاج اور ثقافتی رویوں میں ڈھال کر اسے اپنا لیتی ہے.. پچھلے برس جب مجھے جرمن حکومت کی جانب سے برلن میں منعقد ہونے والے ایک ادبی سیمینار میں مدعو کیا گیا تو ایک روز میں اور ہندوستانی شاعر ندا فاضلی اور ناول نگار ثریا خان برلن سے کچھ فاصلے پر واقع تاریخی شہر پوسٹ ڈیم گئے جہاں ایک قدیم کلیسا کے صحن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک ایسا مجسمہ نصب تھا جو مسٹر یونیورس کی مانند طاقتور اور توانا بدن رکھتا تھا.. میں نے ایک جرمن سے اس کا تذکرہ کیا کہ عام طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت ناتواں اور لاغر دکھایا جاتا ہے تو یہ عیسیٰ کیسے ہیں جو اپالو دیوتا کی یاد دلاتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ ہر قوم اپنے تاریخی مزاج اور پسند کے مطابق اپنے عقیدے کی تفہیم کرتی ہے.. جرمن ایک لاچار اور الم ناک عیسیٰ قبول نہیں کر سکتے.. ان کا عیسیٰ ایک طاقتور اور فاتح بدن والا ہونا چاہیے..

صرف عیسائیت ہی میں نہیں دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی یہی اصول کار فرما ہے..

گندھارا کا مہاتما بدھ ایک یونانی ناک نقشے والا خوش بدن اپالو دیوتا ہے.. ہندوستان کا بدھ قدرے ناتواں ہے.. چین اور جاپان کا بدھ نہایت موٹا بھدا اور سست بدھ ہے.. افغانستان کے بامیان کا بدھ پر تمکنت اور عالی شان تھا..

چنانچہ اسی طور روسیوں کے حضرت عیسیٰ بھی حزن آمیز سیاہی میں ڈوبے ہوئے ان کے المیاتی مزاج کے پرتو ہیں..

پچھلے برس نیویارک کے شہرۂ آفاق گوگن ہائم میوزیم میں مجھے ایک نہایت تاریخی اور منفرد نمائش ''رشیا'' دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا.. وہاں ٹالسٹائی دوستوؤسکی اور لینن کی مشہور زمانہ پورٹریٹوں کے علاوہ روسی کلیساؤں کے اندر مذہبی مصوری کے جو شاہکار تھے وہ بھی تاریخ میں پہلی بار نمائش پر تھے.. یہ روسی آئی کون بھی اداسی کے سیاہ لبادوں میں روپوش تھے.. ان کی محرومی اور بدنصیبی کی سوگوار کیفیت ایسی تھی کہ امریکیوں جیسی کھلنڈری قوم بھی انہیں دیکھ کر سنجیدہ اور غمناک ہو جاتی تھی..

اب اگر مذہبی مصوری اور بُت تراشی کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یونہی انکشاف سا ہوا ہے کہ دنیا کے بیشتر مذہب سراسر اداس اور غمگین ہیں اور صرف بدھ مت اور ہندو مت میں ہمیں

سوگواری اور مسرت پہلو بہ پہلو دکھائی دیتی ہے.. یعنی جہاں آپ مہاتما بدھ کے نہایت نروان شدہ حالت میں گیان دھیان میں گم سوکھ کر کانٹا ہو چکے بت دیکھتے ہیں وہاں آپ کو نہایت پلے ہوئے موٹے اور مسکراتے بلکہ قہقہے لگاتے بدھ بھی مل جاتے ہیں.. ہندو مت میں جہاں کالی ماتا ایک سرخ زبان نکالے خون کی پیاسی ہوتی ہے اور کھوپڑیوں کے ہار پہنے آپ کی جان نکالتی ہے تو.. اگر آپ اجازت دیں تو میں کالی ماتا کی ایک کرامت بیان کرنا چاہوں گا..

شنید ہے کہ دو سگے بھائی کالی ماتا کے شدید پجاری تھے اور دن رات اس کی کھوپڑیوں کی مالا جپتے تھے.. کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ان میں سے ایک بھائی مسلمان ہو گیا.. اب دوسرے بھائی کے ساتھ یہ ہوا کہ ہر شب کالی ماتا اس کے خوابوں میں آتی اور اسے خوب ہی ڈراتی اور اس کا خون پی جانے کی دھمکیاں دیتی.. چنانچہ ایک شب یہ بھائی بہت خوفزدہ ہو کر کالی ماتا سے کہنے لگا.. ماتا میں تو تمہارا ماننے والا ہوں اور تم ہر شب میرا خون خشک کرتی ہو اور اسے کچھ نہیں کہتی جو مسلمان ہو گیا ہے..

تو کالی ماتا نے کہا۔ ''وہ تو مجھے مانتا ہی نہیں ہے.. جو ماننے والا ہے اسے ہی ڈراؤں گی ناں..''

چنانچہ طے یہ ہوا کہ جو ماننے والے ہیں انہیں ہی ڈرایا جاتا ہے.. اور جو نہیں مانتے وہ موج کرتے ہیں..

بہر حال ہندو مت میں اگر ایک جانب ڈراوا ہے.. کھوپڑیاں کھنکتی ہیں تو دوسری جانب نہایت مزاحیہ قسم کے خوش مزاج ''رامائن'' کے پیار کرنے کے قابل مددگار بندر ہنومان مہاراج بھی ہیں.. اور پھر گنیش مہاراج بھی ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر آپ سنجیدہ نہیں رہ سکتے'' کیونکہ وہ بھی تو ایک غیر سنجیدہ ہاتھی سے ہیں.. اور مہاراج کرشن کے شوخ میک اپ والے مجسمے بھی اکثر مسکراتی ہوئی حالت میں ملتے ہیں.. بلکہ بنسری بجا کر گوپیوں کو مطلع کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ کے کپڑے چرا لینے والا آ گیا.. اب آپ تالاب میں سے برہنہ حالت میں کیسے باہر آؤ گی اے گوپیو..

یہودی.. اپنے سنہری بچھڑے کو بھول کر.. من وسلویٰ کے شکوے فراموش کر کے.. ان زمانوں میں ''ہولوکاسٹ'' کو واحد خدا بنائے بیٹھے ہیں.. وہ اس کی پرستش نہیں کرتے محض اسے بہانہ بناتے ہیں فلسطینیوں کے بچوں اور بوڑھوں کو ہلاک کرنے کے لیے ان کے قدیمی زیتون کے باغ اجاڑنے کے لیے..

میں نہایت بے خطر ہو کر دیگر مذاہب کے بارے میں تو ''موشگافیاں'' کر سکتا تھا لیکن

اپنے مذہب کے بارے میں کچھ بھی کہنا خطرے سے خالی نہیں کہ لے سانس بھی آہستہ۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کو بھی ہر قوم نے اپنے مزاج اور ثقافت کے مطابق ڈھال لیا...
اب اس کے بیان میں بس دو چار سخت مقام آتے ہیں تو میں جان کی امان چاہتا ہوں اور اپنی بزدلی کے باعث اجتناب کرتا ہوں۔ ورنہ جی میں جانے کیا کیا کچھ ہے۔۔

ہم ایک ذی شان پر تقدس اور دل پر اثر کرنے والے ایک کلیسا میں داخل ہوئے جو کلیسا نہ تھا' تابوتوں کا ایک سپر سٹور تھا کہ وہاں سینکڑوں گزر چکے اوتاروں اور ولیوں کے تابوت دھرے تھے' جانے انہیں دفن کیوں نہ کیا گیا' انہیں دو گز زمین بھی نہ ملی تھی کوئے یار میں۔۔ اور ان تابوتوں کے ڈھکنوں پر کیسے ماتمی نقشے اور چہرے تھے۔۔

ایک بلند منقش شاہانہ کرسی جیسے ایک دلہن کی ڈولی ہوتی ہے اور اس ڈولی میں براجمان ہو کر زار روس سر جھکائے وعظ سنا کرتا تھا۔۔

ایک اور ایسی ہی نشست دیدہ زیب حالت میں سکوت میں تھی کہ یہاں زارینہ اپنے ہی چنیدہ "مفتی اعظم" کے ارشادات سے اپنی عاقبت سنوارا کرتی تھی۔۔

یہ جو اوتاروں اور پہنچے ہوئے ولی حضرات کی اجتماعی آرام گاہ تھی وہاں ہر تابوت پر اس میں استراحت فرماتے بزرگ کی حیات کے مقدس پہلوؤں کی تفصیل لکھی تھی۔۔ ان میں سے ایک شہید ایسے تھے جن کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ چھ سو برس پیشتر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ نہایت وحشی قسم کے تاتاریوں کے ہتھے چڑھ گئے' جنہوں نے انہیں اپنے خداؤں کے آگے جھکنے پر مجبور کیا لیکن وہ اپنے ایمان پر پختہ رہے اور نہ جھکے چنانچہ کفار نے انہیں شہید کر دیا۔ پھر فلاں صدی میں جانے کیسے ان کی ہڈیاں تاتارستان میں دریافت ہوئیں اور انہیں نہایت عزت و احترام سے یہاں ماسکو میں لا کر دفنا دیا گیا۔ بلکہ دفنایا نہیں گیا ہڈیوں کو اس تابوت میں بند کر کے اس کلیسا میں رکھ دیا گیا۔۔

اب میں تو آسانی سے ان وحشی تاتاریوں کے "خداؤں" تک پہنچ گیا کہ تاتار مسلمان تھے' اسی لیے وحشی کہلائے اور شاید انہوں نے ان بزرگ کو کلمہ پڑھنے کے لیے درخواست کی ہو اور جب بزرگ نے اس درخواست پر کان نہ دھرا ہو تو انہیں فارغ کر دیا گیا ہو۔۔ یا پھر بزرگ طبعی موت مرے ہوں اور انہیں ولی ثابت کرنے کے لیے اس نوعیت کی داستان گھڑی گئی ہو کیونکہ جب تک کسی بزرگ کے حالات زندگی میں ایمان پر ڈٹے رہنے کا تڑکا نہ لگایا جائے وہ پہنچے ہوئے ثابت نہیں ہو سکتے۔۔

میں نے میمونہ کی توجہ اس تابوتی داستان کی جانب مبذول کروائی تو وہ ہمیشہ کی شکی عورت کہنے لگی۔ "ہمیں کیا پتہ کہ اس تابوت میں اسی بزرگ کی ہڈیاں ہیں جنہیں تاتاریوں نے اگر شہید کیا تو اچھا ہی کیا کہ کلمہ پڑھ کر جان بچا لینے میں کیا حرج تھا۔۔ ہڈیوں پر نقش تو نہیں ہوتا کہ یہ کس کی ہڈیاں ہیں اور پورے تاتارستان میں انہوں نے ان کی ہڈیاں کیسے کھوج نکالیں۔۔ مجھ سے شرط لگا لو اس تابوت میں کسی نوعیت کی بھی ہڈیاں نہیں ہیں' خالی ہے' بے شک چوری چھپے ڈھکنا اٹھا کر دیکھ لو۔"

"اور اگر وہاں ہڈیوں کی بجائے وہ بزرگ بہ نفس نفیس استراحت فرما رہے ہوں تو۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔۔

اگر مونا کو کسی خطاب سے نوازا جا سکتا ہے تو وہ مونا معترض کا ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اعتراض کرنے سے باز نہیں آتی۔۔

ایک اور تابوت کے ڈھکن پر درج قدیم رسم الخط میں لکھی گئی عبارت پڑھ رہے تھے تو کہنے لگی۔ "ان بزرگ کے حالات زندگی پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ ان کے داتا صاحب ہوں گے اور ان کے برابر میں شاید ان کے نظام الدین اولیا محو خواب ہیں۔"

اگرچہ ہسپانیہ اور اطالیہ میں مذہبی تصاویر بنانے کی جو قدیم روایت ہے وہ بھی عیسائیت کا ایک مقدس ورثہ ہے لیکن روس میں پچھلے کئی سو برسوں میں بنائی جانے والی مذہبی تصاویر جنہیں "آئی کون" کا نام دیا جاتا ہے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے کہ ان میں جو سیاہ سوگواری ہے اس میں بھی ایک روحانی زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔۔ بین الاقوامی آرٹ مارکیٹ میں ایسی تصاویر جب بھی فروخت کے لیے پیش کی جاتی ہیں تو ان کی قیمت کروڑوں ڈالروں تک پہنچتی ہے۔۔

ان متعدد کلیساؤں کی تفصیلی زیارت کرنے کے بعد ہم کھلی فضا میں آ گئے جہاں ان کے سنہری گنبد دھوپ میں لشکتے ہماری آنکھوں کو چندھیا رہے تھے۔۔

کلیساؤں کے جمگھٹے سے پرے کریملن کے محلات کی قربت میں جہاں گل لالہ کے تختے بچھے تھے' وہاں دنیا کی سب سے بڑی گھنٹی "دے کریملن بیل" ایک چبوترے پر خاموش پڑی تھی۔۔

"یہ تو حکمران کا گھنٹہ ہے۔" تانیا نے مطلع کیا۔ "اور یہ تو دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ ہے اور اس کا وزن دو سو ٹن ہے۔۔ اور یہ جو اس کا ایک ٹوٹا ہوا لوہے کا ٹکڑا ساتھ پڑا ہے تو اس کا وزن بھی گیارہ ٹن ہے۔"

ایک اور بلیک وہائٹ تصویر ماضی کی دھند میں سے نمودار ہونے لگی..

اسی گھنٹی پر ہاتھ رکھے ایک پاکستانی مین ایجز پھول دار بش شرٹ اور ایک ڈھیلی پتلون میں آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے تصویر اتروا رہا ہے اور وہ تصویر لینا تارا رہی ہے.. پچاس برس پیشتر.. ماسکو میں چلتے پھرتے.. سٹورز میں بازاروں میں گھومتے دوسری جانب سے آنے والے لوگوں کو دیکھتے مجھے اکثر خیال آتا کہ اگر وہ ابھی تک زندہ ہے تو یہیں کہیں اس شہر میں ہوگی.. اور اگر وہ سامنے سے آ بھی جائے تو وہ ایک عمر رسیدہ اور موٹی روسی عورت ہوگی.. شاید اپنے کسی پوتے پوتی کے ساتھ.. ہوسکتا ہے وہ سامنے سے آ کر میرے قریب سے گزر بھی گئی ہو.. میں کیسے جان سکتا تھا اور نہ وہ جان سکتی تھی..

''اچھا تو حکمران کا گھنٹی ہے یانیا..''

''ہاں.. وہ.. یہ تو..'' وہ تذبذب میں پڑ گئی.. ''یہ تو راجہ کا گھنٹی ہے..''

یانیا یقیناً زار یا ایمپرر کے مختلف اردو ترجمے آزما رہی تھی..

''یانیا یہ راجہ لوگ اتنا بڑا گھنٹی کیوں بناتے تھے..؟''

''اس لیے کہ وہ تو راجہ تھے..''

''اور یہ جو گیارہ ٹن وزنی ٹکڑا پڑا ہے تو یہ گھنٹی سے کیسے الگ ہوگیا..''

''وہ تو حکمران نے یہ دنیا کا سب سے بڑا گھنٹی بنوایا تاکہ اپنی مسجد پر.. کلیسا پر اور گنبد کے پاس لگا دے تاکہ وہ ٹن ٹن کرے تو پورے ماسکو میں پتہ چلے کہ یہ تو حکمران کا گھنٹی بجتا ہے.. تو جب اس کو اوپر لگانے کے لیے اٹھایا گیا تو یہ گر گیا اور ٹوٹ گیا..''

اس گھنٹی کی قربت میں ہی ایک ایسی منقش توپ دھری ہے جسے ڈھالنے کے لیے پورے روس کا لوہا جھونک دیا گیا ہوگا.. بلکہ پورے روس کے لوہے سے صرف ایک گھنٹی اور ایک توپ تیار کرلی گئی ہوگی.. یہ توپ بہت توپ ہے.. بہت بڑی اور موٹی تازی.. قریب ہی اس کے سائز کے تین تنومند آہنی گولے دھرے ہیں.. معلوم ہوا کہ یہ توپ ابھی تک کنواری حالت میں ہے اور اسے کبھی داغا نہیں گیا.. یعنی توپ اور گولوں کا آج تک وصال نہیں ہوا تبھی دونوں قدرے اداس سے لگتے تھے.. آپ اتنی بڑی توپ ہو اور آپ کو کبھی داغا نہ جائے.. نہ کبھی بدن شعلہ بار ہو اور نہ دھواں نکلے تو اداسی تو ہوتی ہے.. اور ہاں یانیا نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بھی کہا.. یہ تو حکمران کا توپ ہے..

آپ بھی یانیا سے مخاطب ہو کر کہہ سکتے تھے کہ تم تو بڑی توپ شے ہو..

سورج کی تمازت.. نصف درجن کلیساؤں کی سوگواری ان میں رکھے سینکڑوں تابوتوں کے دیدار.. ہزاروں مذہبی تصاویر کو غور سے دیکھنا اور بالآخر حکمران کا گھنٹی اور اس کا توپ نے ہمیں.. یعنی مجھے اور مونا کو بے حد نڈھال کر دیا تھا اور ہم سب کریملن کے اس گلزار گوشے میں آ بیٹھے جہاں ٹیولپ کے پھولوں کی رنگا رنگ کیاریاں نظر نواز ہوتی تھیں..

تانیا بیکال نے پوچھا.. ''آپ آئس کریم کھائیں گے..؟''

''نہیں..''

''اور آپ..؟'' اس نے میمونہ سے دریافت کیا تو اس نے بھی انکار میں سر ہلا دیا..

پھر یانیا نے بھی یہی سوال دہرایا اور یہی جواب پایا اور آخر میں کرسٹینا نے نہایت بھولپن سے کہا.. ''آپ واقعی آئس کریم نہیں کھائیں گے.. اگر آپ نہیں کھائیں گے تو ہم کیسے کھائیں گے..''

روسی آئس کریم کے دیوانے ہیں.. برف باری کے موسموں میں بھی آئس کریم کھانے سے باز نہیں آتے اور یہ بچیاں آداب میزبانی کو ملحوظ خاطر رکھ رہی تھی ورنہ دل میں مری جاتی تھیں.. آئس کریم کھانے کے لیے چنانچہ ہم نے بھی ہامی بھر لی کہ ہاں کھائیں گے..

ہم وہاں گل لالہ کے جھرمٹوں میں بیٹھے کیا ہی زبردست مزے والی روسی آئس کریم کھاتے رہے.. جب ہم کریملن کی دیوار کے کناروں پر پہنچے جس کے نیچے دریائے ماسکو کی روانی تھی تب میں نے جان بوجھ کر یانیا سے پوچھا تھا کہ.. ''یہ کیا ہے..؟''

تو وہ کہنے لگی.. ''یہ تو ندی ہے.. آپ نے اس ندی کا سیر نہیں کیا؟''

''نہیں کیا..''

''تو میں کرا دوں گی..''

میں نے سوچا کہ کاش یہ کرا دے.. امید بہار رکھنے میں کیا مضائقہ ہے..

اکیسواں باب

"پوشکن کا انشاء اللہ مجسمہ اور ابن انشاء... اللہ"

کریملن بہت ہو چکا تو ہم اس کے در و دیوار سے رخصت ہو کر شہر کے بھیتر میں چلے آئے اور میٹرو کے ذریعے ایک بار پھر ارباط پہنچ گئے کہ وہاں ان لڑکیوں کی اطلاع کے مطابق چند نہایت مناسب قیمت اور مناسب خوراک ریستوران تھے' جہاں ماسکو بھر کے مصور اور ادیب پائے جاتے تھے..

ہم جس ریستوران میں گئے وہ کچھ کچھ فرانسیسی لگتا تھا اور کھانے کے حصول کے لیے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا.. ہم تھکاوٹ کی وجہ سے کھڑے ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھے' اس لیے جو پوزیشن میں تھیں وہ کھڑی ہو گئیں اور ہمارے لیے بھی خوراک لے آئیں..

میں نے نوٹ کیا کہ تانیا بہت احتیاط برت رہی ہے.. باقاعدہ کھانا نہیں کھا رہی' سلاد کے چند پتے چبا رہی ہے اور کافی پی رہی ہے.. کرسٹینا کی پلیٹ میں بھی کچھ بے جان سے کھیرے اور ٹماٹر تھے..

"یہ لڑکیاں صرف سلاد اور کافی وغیرہ پر گزارہ کر رہی ہیں.." میں نے مونا سے کہا..

"تو آپ فکرمند کیوں ہیں..؟"

"بھئی یہ کھائیں گی نہیں تو زندہ کیسے رہیں گی.."

"یہ اگر کھائیں گی ناں تو دیگر روسی عورتوں کی مانند موٹی تازی ہو جائیں گی' اس لیے احتیاط کر رہی ہیں.."

میری نظر یانیا کی پلیٹ کی جانب گئی اور وہ ہرگز احتیاط نہیں کر رہی تھی.. "لیکن یہ یانیا تو خوب کھا رہی ہے.."

"ہاں.."

"شاید اسی لیے تو خوب ہو رہی ہے.."

"تم بہت پراگندہ خصلت کے ہو.. مجھے خوب معلوم ہے کہ تم خوب ہو رہی ہے کیوں کہہ رہے ہو.."

"صرف اس لیے کہ وہ تو خوب ہے.."

شام ہونے لگی تھی..

ہمارے ہوٹل کی شٹل سروس پورے آٹھ بجے تورسکایا سٹریٹ کے کونے سے چلتی تھی اور ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ تینوں ہمارے ساتھ چلی آئیں..

ابھی کوچ آنے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے.. اور وہ تینوں کلیساؤں کی مذہبی تصاویر کی مانند سوگوار اور رنجیدہ سی ہو گئیں.. "کیا آپ کے جانے سے پہلے ہم آپ سے ایک مرتبہ پھر مل سکیں گے..؟"

"انشاءاللہ.."

"مطلب..؟" یانیا نے اپنے سیاہ بال جھٹکے..

"اس کا مطلب ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے.."

"یہ تو اچھا مطلب ہے.."

صاف ظاہر ہے کہ ان کے نصاب میں اردو کی جتنی بھی تحریریں تھیں ان میں ابھی تک کہیں انشاءاللہ نہیں آیا تھا' اس لیے وہ اس کے معانی نہیں جانتی تھیں.. اب وہ تینوں انشاءاللہ کہنے کی مشق کرنے لگیں اور مختلف فقروں میں انشاءاللہ ٹانکنے لگیں.. اور اس کے نتائج بہت پرلطف برآمد ہونے لگے..

"شہر کے درمیان میں سے انشاءاللہ دریائے ماسکو بہتی ہے.."

"میکڈانلڈ کا برگر تو بہت انشاءاللہ مزیدار ہے.."

"آپ تو انشاءاللہ ہمارے پسندیدہ پاکستانی ہیں.."

"کیا آپ نے ٹالسٹائی کا ناول انشاءاللہ 'وار اینڈ پیس' پڑھا ہے.."

"میرا دادا انشاءاللہ ایک یہودی تھا اور ماں باپ انشاءاللہ ڈاکٹر ہیں.."

"میں تو جھیل بیکال کے کناروں سے انشاءاللہ ماسکو آئی ہوں.."

"آپ نے پوشکن کا انشاء اللہ مجسمہ دیکھا ہے۔۔"

یہ ایک پرلطف مشق تھی اور ان تینوں نے نہایت سنجیدگی سے انشاء اللہ کے موزوں استعمال کے لیے پریکٹس کی۔۔اور اس دوران میں بھی کچھ فقروں کا اضافہ کرتا رہا۔لیکن ہم دونوں انہیں سمجھاتے رہے کہ آپ انشاء اللہ کا بہت بے دریغ استعمال کر رہی ہیں مثلاً میکڈونلڈ کے برگر کے ساتھ انشاء اللہ جائز نہیں ہے تو وہ کہتیں کہ کیوں۔۔اگر اللہ چاہے تبھی تو برگر مزیدار ہو سکتا ہے۔۔

ان میں سے تانیا اور یانیا کو تو کچھ دشواری نہ ہوئی لیکن کرسٹین کی زبان پر انشاء اللہ جاری نہ ہوتا تھا۔۔وہ انشاء بھول جاتی اور اللہ اللہ کرتی رہ جاتی۔۔اور مونا نے اس کی یہ مشکل حل کر دی "آپ اپنے نصاب میں پریم چند کے علاوہ ابن انشاء کو بھی پڑھتے ہیں ناں۔"

"وہ تو ہم مستنصر کو بھی پڑھتے ہیں۔" یانیا نے فوراً کہا۔۔

"ہاں ہاں۔۔پتہ نہیں کیوں پڑھتے ہیں تو آپ نے ابن انشاء کے حوالے سے صرف انشاء یاد رکھنا ہے اور اس کے بعد لگا دینا ہے اللہ۔۔اور یوں یہ انشاء اللہ ہو جائے گا۔"

اس جادوئی ترکیب سے وہ تینوں انشاء اللہ میں رواں ہو گئیں۔۔

اسی لمحے مجھے ایک عجیب اداس یاد نے گرفت میں لے لیا۔کیا ابن انشاء کو اس لمحے شائبہ بھی ہو سکتا تھا کہ آج سے سینتیس برس بعد یہ جو میرے ساتھ ایک جھینپا ہوا مؤدب سا نوجوان کھڑا ہے،کبھی روس میں اس کی بیوی میرے نام کے ساتھ "اللہ" لگا کر اردو کی طالبات کو انشاء اللہ سکھائے گی۔۔اور وہ کون سا لمحہ تھا۔۔

لاہور کے جم خانہ کلب کے ہال میں نیشنل بک کونسل نے کتابوں کی ایک نمائش کا اہتمام کیا تھا۔۔ذوالفقار احمد تابش جو لاہور میں اس کونسل کا سربراہ تھا اس نمائش کا منتظم تھا۔۔ابن انشاء بھی کراچی سے آئے تھے اور انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا تھا۔نمائش کے اختتام پر درجنوں طالبات نے انشاء کا گھیراؤ کر لیا اور ان کے آٹوگراف حاصل کرنے کے لیے دھکم پیل ہونے لگی۔۔تو انہوں نے طالبات سے کہا۔"دیکھو اس نوجوان تارڑ نے بھی ایک سفرنامہ لکھا ہے۔۔" نکلے تری تلاش میں" جس کی نثر میں شاعری کا لطف ہے تو اس نے جب مشہور ہو جانا ہے تو اس کے آٹوگراف حاصل نہیں کر سکو گی تو آج ہی موقع ہے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یہ قابو نہیں آئے گا۔"

ایک دو طالبات نے نہایت بیزاری سے اپنی آٹوگراف بکس میرے آگے کر دیں صرف اس لیے کہ ابن انشاء نے میری سفارش کی تھی۔۔

یہ میری ادبی زندگی کے پہلے آٹوگراف تھے۔۔

ابن انشاء سے بہت تو نہیں چند ملاقاتیں ہوئیں۔۔وہ میرے والد صاحب چودھری رحمت خان تارڑ کی زرعی کتب کے بھی بے حد مداح تھے۔۔مال روڈ کے شیزان اور کیفل میں وہ مجھے رچرڈ برٹن کے بارے میں اپنی تحقیق کے بارے میں بتاتے کہ کس طرح وہ شخص جس نے الف لیلیٰ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا سندھ کی تاریخ میں بھی کمال رکھتا تھا اور وہاں کے کھنڈروں کے بارے میں بھی تحقیق کر رہا تھا۔۔ایک ایسی ہی ملاقات کے دوران میں نے انہیں اپنے ذہن میں کلبلاتے ایک عجیب سے داستانوی ناول کے بارے میں بتایا کہ کس طرح ایک کوہ نورد رتی گلی کی برف پوش چوٹی کے پار اترتا ہے تو وہاں اس کے سامنے دھند میں سے موئنجوداڑو کا شہر ابھرتا ہے۔۔وہ اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کر سکتا اور جب اس میں داخل ہوتا ہے تو وہاں موئنجوداڑو کی رقاصہ اسے ہر گلی میں اس پر نظریں رکھتی دکھائی دیتی ہے اور پھر ایک معبد میں سے باہر آتا بڑا پروہت اسے بتاتا ہے کہ جب آریائی حملہ آور آئے تو ہم نے اپنا شہر ترک کیا اور ان بلند پہاڑوں کے درمیان اس دور افتادہ وادی میں ایک اور موئنجوداڑو بسا لیا۔ہمیں کچھ خبر نہیں کہ باہر کی دنیا میں کیا ہے اور وہ کیسے تبدیل ہو چکی ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی آج تک اپنے اس موئنجوداڑو سے باہر نہیں گیا۔۔اور باہر 1972ء کے زمانے تھے۔۔ابن انشاء میرے اس عجیب اور انہونے خیال سے اتنے متاثر ہوئے کہ کہنے لگے "تم ابھی گھر جا کر یہ ناول شروع کر دو۔۔اور پھر ہر ملاقات پر دریافت کرتے کہ اس ناول کا کیا ہوا۔۔

سچی بات ہے میرے پاس نہ تو تحریر کا کوئی معجزہ تھا اور نہ تحقیق کے لیے درکار ایک زرخیز ذہن ایسا تھا کہ میں ایک ناول لکھنے پر قادر ہوتا۔۔البتہ ایک مدت کے بعد 1991ء میں جب میں نے "بہاؤ" لکھا تو اس میں اس ناول کے موئنجوداڑو کے پرتو تھے۔۔تو اسی لمحے جب میمونہ ماسکو یونیورسٹی کی اردو طالبات کو انشاء اللہ سکھانے کے لیے انشاء جی کا نام لے رہی تھی تو مجھے وہ لمحہ یاد آ گیا۔انشاء۔اور۔۔اللہ۔۔

ہمارے ہوٹل آرس کاگرس کی کوچ ماسکو کی ٹریفک سے الگ ہو کر کسی زمانے کی گورکی سٹریٹ اور آج کی تورسکایا سٹریٹ کے کونے میں آ رکی۔۔وہاں رکی جہاں ہم فٹ پاتھ پر کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔۔ہم رخصت ہونے لگے تو وہ تینوں خدا حافظ اور انشاء اللہ کہتے ہوئے ذرا جذباتی ہو گئیں بلکہ تانیا تو آبدیدہ ہو گئی اور مونا بھی انہیں گلے لگاتے ہوئے ذرا روسی ہو کر اداس ہو چلی۔۔

جب ہوٹل کی کوچ کے نہایت خاموش اور خفا سے لگتے سیاہ سوٹ میں ملبوس ڈرائیور نے اسے حرکت دی تو ان تینوں کے اداس بھی اور مسکراتے ہوئے بھی چہرے کھڑکی میں تصویر ہوتے اوجھل ہو گئے..

''مونا..ہم اپنے باقاعدہ بچوں کے بیاہ شیاہ کر کے فارغ ہو گئے ہیں اور اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے ہیں تو کچھ تو کریں..یہ کریں کہ ان پیاری بچیوں میں سے کسی ایک کو گود لے لیں اور ذرا پالیں پوسیں..''

''ہاں اب تو احساس ہوتا ہے کہ غلطی ہو گئی ہے..ہمارے تین بچے نہ ہوتے کوئی درجن بھر تو ہوتے..ویسے کرسٹینا بھی اچھی بچی ہے..''

''اور یانیا..''

''اسے تو میں ہرگز تمہیں گود لینے کی اجازت نہ دوں گی..'' میمونہ ہنسنے لگی..

باہر ماسکو کی ایک اور رات کی سفیدی اترتی تھی..فٹ پاتھوں پر چلتے لوگ..عمارتیں..شجر..محبت کرنے والے اور آسمان سب کے سب سفید ہو رہے تھے..

بائیسواں باب

''سینٹ سرجی پرساد کی ہڈیوں سے شفا کی دعا''

''صرف روس کی سرزمین پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس راہب خانے کا کوئی اور ثانی نہیں..''

(آرک ڈیکن پال آف ایسیو)

ہم ماسکو سے بہت باہر آ چکے تھے اور اس نہایت قدیمی اور پوتر سرگی پرساد راہب خانے کی جانب رواں تھے جس کا بقول اس آرک ڈیکن کے پوری دنیا میں کوئی اور ثانی نہ تھا..

ویسے ان پادریوں کی باتوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے لیکن ہم نے کر لیا اور اب سرگی پرساد کی زیارت کو جا رہے تھے..اس لیے بھی جا رہے تھے کہ تنویر بخشؔ جو لاہور میں کم اور ماسکو میں زیادہ ہوتا ہے' بار بار تاکید کرتا تھا کہ تارڑ صاحب آپ نے کچھ وقت نکال کر سرگی پرساد ضرور جانا ہے آپ بہت متاثر ہوں گے..

جب میں نے پہلی بار تنویر سے سرگی پرساد کا نام سنا تو مجھے وہ کوئی ہندو پرشاد لگا' راجندر پرشاد وغیرہ..

چونکہ ماسکو کے قیام کے دوران میں لڈمیلا سے مسلسل رابطے میں رہتا تھا اور اس سے مشورے طلب کرتا رہتا تھا کہ کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں تو میں نے جب اسے خبر کی کہ میں کل سرگی پرساد جا رہا ہوں تو وہ بہت ہی پرشوق ہوئی'' مستنصر آپ تو نہایت خوش نصیب ہیں کہ کل کے دن سرگی پرساد جا رہے ہیں' کیونکہ روسی عیسائیت کے دو فرقے جو ایک عرصے سے آپس میں اختلاف رکھتے تھے کل سرگی پرساد میں صلح صفائی کر کے پھر سے متحد ہو رہے ہیں..ان میں سے ایک فرقہ کیمونزم سے فرار ہو کر امریکہ میں جا آباد ہوا تھا جبکہ دوسرا فرقہ روس میں ہی مقیم رہا تھا تو کل ان

کا ملاپ ہو رہا ہے اور خوب رونق ہو گی۔"

میں ہوٹل کی لابی سے صبح سویرے "دے ماسکو ٹائمز" کا تازہ شمارہ حاصل کر لیتا تھا اور اس روز 18 مئی 2007ء کے شمارے کے سرورق پر ایک نہایت ہی ایمان افروز تصویر تھی جس میں ایک سفید ریش سانتا کلاز کی شکل کا پادری سر پر ایک شاندار جڑاؤ تاج جمائے کوئی مذہبی نسخہ تھامے کھڑا تھا اور صدر پیوٹن اس نسخے میں اپنی ناک دفن کیے اسے بوسہ دے رہے تھے۔۔ "صدر پیوٹن ایک آئی کون کو بوسہ دے رہے ہیں جو انہیں فلاں چرچ کی جانب سے پیش کیا گیا۔" اس تصویر تلے ایک اہم خبر کی سرخی کچھ یوں شائع ہوئی تھی۔۔

"کلیسا اسی برس کے بعد متحد ہونے کو ہے۔" گھنٹیاں گونج اٹھیں۔۔اگربتیوں کی مہک ہر سو معطر ہوئی جب روسی آرتھوڈوکس چرچ کے لیڈروں نے ایک اسی برس کی نااتفاقی ختم کر دی۔۔ حضرت عیسیٰ نے مردوں میں سے زندہ ہونے کے بعد پہلا فقرہ کہا تھا کہ۔۔خوشی مناؤ اور پھر فرمایا تھا۔۔امن تمہارے ساتھ ہو۔۔ آج کے مبارک دن ہم یہ دونوں فرمان ہواؤں میں گونجتے سن رہے ہیں۔۔

تو بقول لڈمیلا اسی سرجی پرساد میں آج ایک یادگار تقریب منعقد ہو رہی تھی جہاں یہ دونوں روٹھے ہوئے چرچ پھر سے صلح کر رہے تھے۔۔اور وہ اتنی پر جوش ہو رہی تھی جیسے عیسائیوں کے شیعہ اور سنی آج متحد ہو رہے ہیں۔۔

آج جو شخص اپنی نہایت بنیادی اور اوریجنل روسی کار "ماسکووچ" میں سرجی پرساد لے جا رہا تھا اور یہ کار مضبوط تو بہت تھی لیکن نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے اور نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے اس کی خوبی تھی' ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہرتی تھی اور چلتے چلتے چلتی تھی اور پھر چلتی جاتی تھی۔۔اے سی کی سہولت اس مزدور مزاج کی کار کو پسند نہ تھی اور دروازے بھی اپنی مرضی سے کھلتے تھے اور کبھی نہیں بھی کھلتے تھے اور جس کا دروازہ اتفاقاً کھل جاتا تھا وہ باہر نکل کر باقی سواریوں کو آزاد کرتا تھا۔۔تو وہ شخص اشرف کمال تھا۔۔اور وہ اتنے کمال کا تھا کہ ہم اس کی کار کی یادگاری اور بے آرام تاریخی نوعیت کو بھول گئے۔۔

وہ اٹھارہ برس کی عمر میں ماسکو آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔۔اور ایک روسی بیوی کا ہو کر رہ گیا تھا جس کے بطن سے اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔۔

"روسی لڑکی سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔۔" اس نے مجھے خبردار کیا۔۔

میں ذرا چوکنا ہو گیا کہ اس نے میری نیت کیسے بھانپ لی ہے۔۔ "یہ اچھی بیویاں نہیں ہوتیں۔۔؟"

"بہت وفادار اور مشکل وقت میں ساتھ دینے والی ہوتی ہیں لیکن پاکستانی بیویوں کی طرح نہیں ہوتیں۔۔ذرا خودسر ہوتی ہیں اور خاوند کے آگے پاکستانی بیویوں کی مانند سر تسلیم خم نہیں کرتیں۔"

چونکہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں ماسکو آ گیا تھا اس لیے شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ اس دوران پاکستانی بیویوں کی خصلت بھی بدل چکی ہے۔۔بلکہ جس روز میری شادی ہوئی تھی بس اسی روز بدلی تھی کہ میمونہ نے کہاں آج تک میرے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔۔

"تو آپ ایک روسی بیوی ریکمنڈ نہیں کرتے۔۔؟"

"نہیں تارڑ صاحب۔۔اگر مجھے کبھی دوبارہ موقع ملا تو سر تسلیم خم ہے والی پاکستانی لڑکی سے شادی کروں گا۔"

"کچھ ارادہ ہے۔۔؟"

"نہیں جی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میری روسی بیوی میرا گلا گھونٹ دے گی۔"

میں اشرف کمال کو روس کی مجموعی صورت حال اور نئے نظام کے بارے میں کریدتا رہا اور اس سفر کے دوران اس کرید کے نتیجے میں بہت کچھ برآمد ہوا۔۔

"میرا تو خیال ہے کہ یہاں پہلے حالات اچھے تھے۔۔لوگ بڑے سادہ اور ہمدرد تھے۔۔ اور ان میں نسلی تعصب نام کو نہ تھا۔۔اب لگتا ہے سب لالچی ہو گئے ہیں۔۔ ہر کوئی دوسرے کی کھال اتارنے کی فکر میں ہے۔"

بقول اشرف کمال یہ جو سنٹرل ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئی ہیں تو اپنی من مرضی سے نہیں ہوئیں بلکہ روس نے انہیں اپنی گود سے اتار دیا کہ اب خود کماؤ اور کھاؤ بہت ہو چکی۔۔ پہلے تو وہ آزادی کے چاؤ میں بہت پر مسرت ہوئے لیکن اب وہ برے حالوں میں ہیں۔۔بے روزگاری اتنی زیادہ ہے کہ ازبک اور تاجک وطن ترک کر کے ماسکو کی جانب یلغار کر رہے ہیں اور یہاں پولیس پکڑ دھکڑ کرتی رہتی ہے کہ اپنے وطن جاؤ اور وہ جاتے نہیں کہ وہاں جا کر کیا کریں۔۔اس دوران اشرف کمال نے شاہراہ کے کناروں پر فٹ پاتھوں پر جمگھٹوں کی صورت بیکار کھڑے ازبک مزدوروں کی جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ "یہ لوگ ہمیشہ ایک جمگھٹے کی صورت۔۔ پانچ دس کی تعداد میں اکٹھے حرکت کرتے ہیں۔۔کبھی اکیلے نہیں ہوتے کیونکہ انہیں مقامی نسل پرست گنجوں یعنی

سکن ہیڈز کے حملے کا خدشہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو ایک زمانے میں انگلستان میں پائے جاتے تھے.. غیر ملکیوں کو زدوکوب کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔"

"ہاں تارڑ صاحب.. اب وہی ذہنیت یہاں جنم لے چکی ہے.. نہ صرف یہ کہ وہ ازبک اور افریقیوں کو مارتے پیٹتے ہیں بلکہ ہلاک کر دینے سے بھی نہیں چوکتے.. ہم لوگ.. یعنی جو غیر ملکی ہیں پرانے عہد میں بے خطر اور محفوظ زندگی بسر کرتے تھے.. ساری ساری رات ماسکو میں گھومتے پھرتے تھے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا بلکہ ہر کوئی ہم سے دوستی گانٹھنا چاہتا تھا اور اب احتیاط کرنی پڑتی ہے.. میں رات کو تنہا کبھی نہیں نکلتا اور شام ڈھلے گھر واپس چلا جاتا ہوں۔"

"تو فٹ پاتھوں پر منڈلاتے یہ لوگ کرتے کیا ہیں..؟"

"بس منتظر رہتے ہیں کہ کوئی روسی انہیں مزدوری کے لیے ساتھ لے جائے اور جو روسی ہیں وہ ان سے جانوروں کی طرح مشقت لیتے ہیں.. بھاری بوجھ اٹھواتے ہیں.. کھدائی پر لگاتے ہیں.. گھروں کی مکمل صفائی کرواتے ہیں اور انہیں پانچ چھ ڈالر سے زیادہ مزدوری نہیں دیتے۔"

"اتنی رقم میں تو ماسکو میں ایک وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا۔"

"صاحب وہ کھانا وغیرہ باقاعدہ کہاں کھاتے ہیں.. ان کے لیے اتنی رقم بھی بہت ہوتی ہے.. اگر اپنے خاندان کو ازبکستان میں ساٹھ ستر ڈالر ماہانہ بھی روانہ کر دیں تو گزارہ ہو جاتا ہے.. اور ہر روز مزدوری بھی نہیں ملتی اور کبھی روسی دھتکار بھی دیتے ہیں کہ کوئی مزدوری نہیں چلے جاؤ ورنہ پولیس کو رپورٹ کر دوں گا کہ تم نے چوری کی ہے.. ازبک اور تاجک کے علاوہ تاتار لوگ بھی ماسکو میں بڑی تعداد میں آباد ہیں کیونکہ تاتارستان اب بھی روس کا ایک حصہ ہے اور انہیں یہاں آنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی.. تاتار بہت پکے مسلمان ہیں۔"

"اور یہ جو قزاقستان ہے اس کی حالت کیسی ہے۔"

"تارڑ صاحب ان کی تو عیاشی ہو گئی ہے.. وہ تو مزے کر رہے ہیں.. ان کے ہاں تو تیل اور گیس کے وسیع ذخائر ہیں اور ان کی آبادی بہت قلیل ہے.. چنانچہ سوویت یونین کے منتشر ہونے کا انہیں بہت فائدہ ہوا ہے.. بلکہ ازبک اور تاجک لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قزاقستان میں سمگل ہو جائیں کہ وہاں کام کی کچھ کمی نہیں.. ازبک وغیرہ تو روس سے الگ ہو کر یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کسی بچے کو تنہا چھوڑ دیا جائے.. آپ جانتے ہیں کہ جب

تاشقند میں زلزلہ آیا تو پورا شہر زمیں بوس ہو گیا اور یہ روسی انجینئر اور ماہر تعمیرات تھے جنہوں نے اسے ریکارڈ ٹائم میں دوبارہ تعمیر کر دیا.. بے شک ان روسیوں نے ان کے اسلامی تشخص کو ملیامیٹ کر کے مارکس کے نظریات لاگو کر دیئے لیکن اس عہد میں وہاں ترقی بھی بے مثال ہوئی۔"

اور یہ ایک حقیقت ہے.. جب میں "یاک سرائے" کی کوہ نوردی کے دوران جھیل کرومبر کے آس پاس تھا تو افغانستان کی واخان پٹی کے پار ازبکستان تھا اور وہاں سے لوگ ادھر پاکستانی علاقے چترال میں آتے جاتے رہتے تھے.. خاص طور پر گھی.. آٹا.. چائے اور چینی حاصل کرنے کے لیے.. یہ بہت پس ماندہ اور غربت کے مارے ہوئے لوگ تھے.. ان سے بات چیت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ادھر ازبکستان میں بھی اسی نوعیت کے بلند پہاڑ اور دشوار گزار وادیاں ہیں لیکن وہاں سڑکوں کا ایک جال بچھا ہے.. ہر گھر تک بجلی پہنچائی گئی ہے اور ٹرانسپورٹ کا ایک وسیع نظام ہے.. جب کہ ادھر پاکستانی علاقے میں یہ سب سہولتیں ایک ناممکن خواب ہیں.... چنانچہ سوویت یونین کے ایام میں ان علاقوں میں ترقی بہر حال ہوئی ہے.. ہوسکتا ہے اشرف کمال نے ان ریاستوں کی زبوں حالی میں کچھ مبالغے سے کام لیا ہو.. یہ ایک یک طرفہ نکتہ نظر ہے جس میں اختلاف کے پہلو نکل سکتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عبوری دور ہے.. پہلے ان کی ایک ماں تھی جو بے شک ایک ظالم اور اپنے بچوں کو نہر میں ڈبو دینے والی ماں تھی لیکن تھی.. اور اس نے انہیں ترک کر دیا ہے اور وہ بلک رہے ہیں کہ کم از کم وہ دودھ تو پلا دیتی تھی.. لیکن وقت گزرنے سے ان ریاستوں کو احساس ہو گا بلکہ ہو رہا ہے کہ اب انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے' اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر آزاد قوموں کی صف میں کھڑے ہونا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس عبوری دور کے بعد ایسا ہی ہو گا اور تب وہ اپنے قدیم اسلامی تشخص کو دریافت کر کے بحال کریں گی اور اس پر بجا طور پر فخر کریں گی.. اس صورت حال کا موازنہ کسی حد تک برصغیر کی آزادی سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ انگریز کے فوری طور پر چلے جانے سے ہم بھی بے آسرا ہو گئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ سنبھل گئے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے.. جیسے تیسے بھی کھڑے ہوئے کھڑے تو ہو گئے.. یہ ریاستیں بھی عبوری دور کی ابتری سے نکل آئیں گی اس کا مجھے یقین ہے۔

میں نے سفر کے آغاز میں ہی حیرت سے دیکھا تھا کہ اشرف کمال ایک بھاری اونی جیکٹ پہنے ہوئے ہے جب کہ ہم دونوں گرمی کی وجہ سے عام سوتی کپڑوں میں ملبوس تھے۔

''تارڑ صاحب.. مجھے سردی بہت لگتی ہے..'' اس نے ذرا ٹھٹھر کر کہا تھا..

''اگر آپ کو ان گرم موسموں میں سردی لگتی ہے تو روسی جاڑوں میں آپ کا کیا حال ہوتا ہوگا..''

''مت یاد دلائیں سر..'' وہ تو باقاعدہ کپکپانے لگا..

شاہراہ کے دائیں بائیں نہایت دل کش مناظر تھے.. سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں زرد پھولوں کے کھیت دور تک چلے جاتے تھے.. پتہ نہیں یہ خودرو تھے یا انہیں خصوصی طور پر کاشت کیا جاتا تھا کیونکہ اشرف کی اطلاع کے مطابق یہ زرد پھول کسی خاص دوا کے بنانے میں استعمال ہوتے تھے..

''باس آپ نہیں جانتے ہوں گے کہ یہاں کی بڑی بڑی دواساز کمپنیاں یہودیوں کی ملکیت ہیں..''

''پوری دنیا میں بہت کچھ یہودیوں کی ملکیت میں ہے..''

''لیکن تارڑ صاحب.. آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ روس میں یہودیوں کو شدید ناپسند کیا جاتا ہے.. اگر آپ نے کسی روسی سے دشمنی مول لینی ہو تو اسے ''تم یہودی'' کہہ دیجیے وہ آپ کو کبھی نہیں بخشے گا.. اور اس کے باوجود بہت کچھ ان کے قبضے میں ہے..''

''سرمایہ دارانہ نظام میں تو یہودیوں کی کاروباری فراست اور ایمانداری ہی حکمران ہوتی ہے..''

''اور وہ یہاں بھی حکمران ہے.. ماسکو کے امیر ترین لوگ یہودی ہیں.. تمام بڑے بڑے بین الاقوامی کاروبار اور بینک یہودیوں کے ہیں.. پیوٹن بھی انہیں ایک خالص روسی ہونے کے ناتے سے پسند نہیں کرتا اور ان کی گرفت کو ڈھیلا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا.. یہودی پیوٹن سے سیانے ہیں اور انہیں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی پشت پناہی حاصل ہے جن کے بغیر روسی معیشت حرکت نہیں کر سکتی..''

ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت روس میں یہودیوں کے ساتھ زیادہ تعصب برتا گیا.. اسی لیے اسرائیل کے قیام کے بعد روسی یہودی دھڑا دھڑ وہاں منتقل ہونے لگے اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل میں ہیبرو کے بعد روسی سب سے بڑی زبان ہے اور دوسرے اسرائیلی اس بات پر احتجاج کر رہے ہیں کہ روسیوں نے اسرائیل کو اپنی

ثقافت میں رنگ دیا ہے..

ماسکو سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر اکثر دیہات کی قربت میں ہمیں لکڑی سے بنے ہوئے سینکڑوں ڈربہ نما کمروں کی قطاریں دکھائی دینے لگیں.. یہ مڈل کلاس لوگوں کے ''ڈاچا'' یعنی گرمائی گھر تھے.. ایک ریڈی میڈ ڈربہ خریدا اور شہر سے کچھ دور اسے زمین میں نصب کیا.. اس کے آگے ایک مختصر کیاری میں چند پھول اور سبزیاں کاشت کیں اور لیجیے غریب آدمی کا ''ڈاچا'' تیار ہے.. ماسکو کی گھٹن بھیڑ اور آلودگی سے دور یہاں کھلی فضا میں ایک دن گزار لینا بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے..

میں نے ایک روسی کاروباری سے دریافت کیا تھا کہ یہ جو ماسکو میں معدودے چند لوگ بے تحاشا امیر ہو گئے ہیں تو کیسے ہو گئے ہیں.. اس کا کہنا تھا کہ کمیونزم کا تانا بانا بکھرا تو جس کے پاس جو کچھ بھی تھا اور سرکاری تھا وہ اس پر قابض ہو گیا. حکومت نے ان لوگوں سے معمولی رقم وصول کر کے ان کی ملکیت کو تسلیم کر لیا.. ایک صاحب دریائے ماسکو میں سٹیمر چلاتے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم یہ سٹیمر خریدنا چاہتے ہو.. لاؤ جیب میں جتنی بھی رقم ہے وہ سرکار کے خزانے میں جمع کرا دو اور سٹیمر تمہارا.. جو فیکٹریاں تھیں ان کے منیجر بھی معمولی رقم ادا کر کے ان کے مالک ہو گئے یعنی نجکاری کا عمل شروع ہو گیا.. یہاں تک کہ مسلح افواج نے ٹینکوں اور توپوں کی لوٹ سیل لگا دی..

اب اشرف کمال بھی اسی نوعیت کی داستانیں سنا رہا تھا.'' تارڑ صاحب آپ نے سرخ چوک کے اردگرد اور عوامی مقامات پر عارضی طور پر ایستادہ نیلے پلاسٹک کے ٹائلٹ دیکھے ہوں گے..''

میں نے دیکھے کیا تھے استعمال بھی کیے تھے.. ہمیشہ نیلے رنگ کے پلاسٹک کے مختصر کمرے.. پانچ چھ کی قطار میں اور باہر ایک بوڑھی مائی براجمان آپ انہیں ادائیگی کر کے ان کے اندر داخل ہو کر اپنا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں.. اور ان کے اندر کیسے مہک آور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے بیان کر کے میں نے جی نہیں خراب کرنا.. یورپ اور امریکہ کی مانند روس میں پبلک ٹائلٹس کی سہولت میسر نہیں.. اور جہاں یہ سہولت ہے وہاں بھی اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے خاصے روبل ادا کرنے پڑتے ہیں چنانچہ آپ بوجھ کو تب تک سہارتے چلے جاتے ہیں جب تک بے قراری کے بے اختیاری میں بدل جانے کا خدشہ پیدا نہ ہونے لگے..

''تو ماسکو میں ایسے تمام ٹائلٹ جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں صرف ایک شخص کی ملکیت.

ہیں.. وہ شخص اپنی سیاہ مرسیڈیز پر شام کو شہر کا چکر لگاتا ہے اور لاکھوں روبل اکٹھے کر کے چلا جاتا ہے.. ان نیلے عارضی ٹائلٹس پر اس کی اجارہ داری ہے.. اسی طور تربوزوں کے موسم میں آپ کو ہر جگہ تربوزوں کے کھوکھے ملیں گے اور ان تربوزوں کا ٹھیکہ بھی ایک شخص کے پاس ہے اور وہ بھی روزانہ لاکھوں روبل کماتا ہے.. اب یہاں بھی پاکستان کی مانند قبضہ گروپوں کا زور ہے جو سرکاری پشت پناہی سے نہایت آسانی سے کسی پارک کے کونے میں ایک شاندار پلازہ تعمیر کر لیتے ہیں.. اور یہ سب کے سب پیوٹن کو کلکشن ہیں۔"

اشرف نے ماسکو میں مقیم پاکستانیوں کی امارت کی کہانیاں بھی سنائیں.. ایک پاکستانی نوجوان ایسا بھی تھا جس نے روس کی خفیہ پولیس کے جی بی کے ایک جنرل کی بیٹی سے شادی کی اور ظاہر ہے اس پر بھی تمام دروازے کھل گئے..

"ویسے تارڑ صاحب آپ کو اس قصبے سرگی پرساد میں کیا دلچسپی ہے اگر آپ برا نہ مانیں تو۔"

"سُنا ہے کہ بہت خوبصورت اور قدیم قصبہ ہے اور اس کا راہب خانہ پورے روس میں مشہور ہے۔"

"اچھا۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے.. اگرچہ وہ ایک باشعور نوجوان تھا لیکن یقیناً تاریخی شعور سے بے بہرہ تھا ورنہ سرگی پرساد کی اہمیت سے آگاہ ہوتا..

"اشرف.. روس میں بچے بہت کم دکھائی دیتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔"

"بچے کہاں سے پیدا کریں شراب جو اتنی پیتے ہیں۔"

میں نے مونا کی موجودگی میں یہ دریافت کرنا مناسب نہ جانا کہ شراب تو پورا یورپ اور امریکہ پیتا ہے تو پھر روسی شراب میں خاندانی منصوبہ بندی کا خودکار خمار کیوں ہے۔

"ویسے بھی ان دنوں بچے پالنا کوئی آسان کام ہے.. کمیونسٹ نظام میں تو بچے ریاست کی ذمہ داری ہوتے تھے.. بلکہ زیادہ بچے پیدا کرنے پر والدہ صاحبہ کو سرکاری اعزازات اور انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا.. اب اپنا گزارہ نہیں ہوتا تو بچے کہاں سے پالیں۔"

بہت دور ایک ندی کے کنارے گڑیوں کے گھروندوں ایسے پرانے مکانوں والا ایک قصبہ نظر آ رہا تھا جس کی شباہت اتنی روسی تھی کہ وہ تاریخ کی کتابوں کی ایک تصویر لگتا تھا.. اس کے

آس پاس گھنے اور بہت گہرے سبز رنگ کے شجر تھے.. دائیں جانب زرد پھولوں کے کھیتوں کے پار چوبی مکانوں پر مشتمل ایک گاؤں تھا جس کے درمیان میں ایک کچا راستہ تھا جس پر چند دہقان چلے جا رہے تھے.. ہم کسی حد تک ماسکو کی زندگی اور اس کی عمارتوں سے ان کی یکسانیت سے تنگ آ چکے تھے اور روسی ثقافت کے امین یہ پرانے گاؤں ہمیں یاد دلاتے تھے کہ روس صرف ماسکو نہیں ہے اس کا اصل یہ گاؤں ہیں..

سرگی پرساد بھی ایک ایسا ہی خاموش طبع قصبہ تھا جو سرسبز پہاڑوں کے دامن میں پھیلا ہوا آپ کے دل میں خوشی بھرتا تھا.. اور اس قصبے کی وجۂ شہرت سینٹ سرجی لاورا کا قدیم راہب خانہ تھا جو ایک دبیز قلعہ نما فصیل کے اندر واقع تھا..

سینٹ سرجی 1314ء میں ایک نہایت مالدار گھرانے میں پیدا ہوا اور روایت کے مطابق وہ بچپن سے ہی ایک تنہائی پسند' عبادت گزار' روزے رکھنے والا اور مشقت کرنے والا لڑکا تھا.. جب وہ تیئس برس کی عمر کو پہنچا تو اس کے والدین وفات پا گئے تو اس نے اپنی پرتعیش زندگی ترک کر کے ویرانوں میں جا آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا.. اس کے بڑے بھائی سٹیفن نے بھی اس کی پیروی کی.. دونوں بھائی ایک بلند مقام پر واقع ایک گھنے جنگل کے اندر گوشہ نشین ہو گئے.. رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنایا.. اس کے برابر میں ایک کلیسا تعمیر کیا.. اور یہی اس عظیم راہب خانے کا آغاز تھا..

سٹیفن یوں دنیا سے کٹ کر ایک ویرانے میں دن رات بسر کرنا اور ایسی حیات کی مشقتیں زیادہ عرصے کے لیے نہ سہہ سکا اور وہ اپنے بھائی کو چھوڑ کر ماسکو لوٹ گیا..

اب سرجی اس بیاباں میں بالکل تنہا تھا.. وہ سارا دن بائبل کے مطالعے میں محو رہتا' سبزیاں کاشت کرتا اور مسلسل عبادت کرتا..

دھیرے دھیرے اس گوشہ نشین شخص کی پاکیزگی اور پارسائی کی شہرت آس پاس کی بستیوں میں پھیل گئی اور لوگ اس کی زیارت کو آنے لگے.. اس کے مشوروں اور دعاؤں کے طالب ہوئے.. پھر جو معتقد ہوئے تو اپنے گھروں کو واپس جانے کی بجائے اس درویش کے جھونپڑے کے آس پاس بس گئے.. اور یوں ایک گاؤں وجود میں آ گیا..

ان دنوں روس پر منگولوں کی یلغار ہو رہی تھی اور لوگ اپنی جانیں بچانے کی خاطر اپنی

بستیاں چھوڑ کر بے آباد علاقوں کا رخ کر رہے تھے..

سینٹ سرجی کے خوابوں میں سفید کبوتر اڑان کرتے اور یہ ایک اشارہ تھا کہ اتنے لوگ تمہارے پاس آئیں گے اور تمہارے قدموں میں زندگی گزاریں گے..

وہ اپنے راہب ساتھیوں کے جوتے گانٹھتا' ان کے جھونپڑوں تک پانی پہنچاتا..وہ جھونپڑے جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیے تھے..وہ ایک انتہائی مشقت کرنے والا شخص تھا..بیمار اور لاچار لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی دعا سے شفا پاتے..

جنگل کے جانور اس سے اتنے مانوس ہو گئے کہ وہ بھوکے یا پیاسے ہوتے تو اس کی جھونپڑی کے باہر آ کر اسے پکارنے لگتے..اس راہب خانے کے صدر دروازے کی دیواروں پر اس درویش کی حیات سے وابستہ کچھ پر اثر تصویریں ہیں..ایک تصویر میں سینٹ سرجی ایک بیمار کے سرہانے کھڑا اس کے لیے دعا کر رہا ہے..ایک اور تصویر میں ایک بہت بڑا ریچھ اس بوڑھے برگزیدہ شخص کے آگے تھوتھنی جھکائے کھڑا ہے جیسے وہ بھی بیمار ہے اور سرجی کی دعاؤں کا طالب ہے..

اس راہب خانہ نے ملک گیر شہرت تب حاصل کی جب ماسکو کا پرنس دمتری ڈونسکی سینٹ سرجی کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اے بزرگ یہ وحشی منگول ہمیں پچھاڑ رہے ہیں' روس کو اجاڑ رہے ہیں اور پچھلے سو برس سے ہمیں روند رہے ہیں تو میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں ان ظالموں کو روک سکوں' ان پر فتح حاصل کر سکوں..

منگولوں کی بربادی کی دعائیں کرنا ان دنوں ہر سینٹ کا فل ٹائم مشغلہ تھا چنانچہ سرجی بھی پیچھے نہ رہا اور فوراً دمتری کے حق میں اور منگولوں کے خلاف دعا کی..چنانچہ پرنس دمتری سینٹ سرجی کی دعاؤں سے لیس ہو کر کلی کووا کے جنگی میدان میں اترا اور تاتار نسل کے خان ماما ئی کے مقابلے میں فتح یاب ہوا..اس کے بعد اس دور افتادہ راہب خانے کے بھاگ جاگ اٹھے..اور سینٹ سرجی کی اولیائی پر مہر ثبت ہو گئی..

سینٹ سرجی 1392ء میں راہیٔ ملک عدم ہوا..

بھوک کی وجہ سے ہماری روح پژمردہ ہو رہی تھی اور اسے روحانی نہیں جسمانی غذا پہلے چاہیے تھی..اور اس غذا کے لیے ہم نے میکڈونلڈ کا انتخاب اس لیے بھی کیا کہ اس کے واش روم روس بھر میں سب سے زیادہ ستھرے قرار دیے جاتے تھے اور داخلہ بھی مفت تھا..

دبیز قلعہ نما فصیل کو متعدد گھنگنے اور موٹے برج سہارے ہوئے تھے اور ان کے اندر سینٹ سرجی کی خانقاہ تھی اور ایک ہجوم سیاحوں کا صدر دروازے کے اندر بہتا ہوا جا رہا تھا.. اور ان میں سوائے ہم تینوں کے سب کے سب جاپانی تھے..میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے ڈھیر سارے جاپانیوں کو سینٹ سرجی میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے..لیکن ان دنوں جاپانیوں کو دنیا کی ہر شے سے دلچسپی ہو گئی ہے..امریکہ..کینیڈا اور یورپ میں غول کے غول جاپانیوں کے مسکراتے جھکتے پھرتے ہیں..ڈالریوں تو کرنسی امریکیوں کی ہے لیکن اسے خرچ اور بے دریغ خرچ جاپانی کرتے ہیں..

خانقاہ کے باہر ایک وسیع پارک اور پارکنگ لاٹ ہے جہاں اشرف کمال کی کار کھڑی تو ہو گئی لیکن اس کے دروازے نہ کھلتے تھے' بمشکل ایک دروازہ کھلا جس میں سے اشرف جھینپتا ہوا برآمد ہوا اور پھر ہمیں آزاد کیا..

صدر دروازے کی دیواروں پر سینٹ سرجی کی حیات کی چند پرتاثیر تصویریں نقش ہیں جن کی تفصیل بیان ہو چکی ہے..داخلے کے قریب سوونیئرز کی دکانیں تھیں اور وہ سب کے سب ظاہر ہے سینٹ سرجی سے متعلق تھے..سینٹ سرجی کی حیات اور افکار کے بارے میں مذہبی کتابیں' بروشر' بائبل کے نسخے..راہب خانے کے ماڈل اور نہایت پرکشش صلیبیں..البتہ لکڑی..قیمتی پتھروں اور چاندی کی یہ صلیبیں اتنی مہنگی تھیں جیسے اس صلیب کی لکڑی میں سے تراشی گئی ہوں جس پر حضرت عیسیٰ کو چڑھایا گیا تھا..

میں نے احاطے پر نگاہ دوڑائی تو وہاں دو بچھڑے ہوئے کلیساؤں کے ملاپ کی تقریبات کے کوئی آثار نہ تھے..وہاں سیاحوں اور سیاہ پوش راہبوں کے سوا اور کوئی نہ تھا..البتہ وہاں ایک پرسکون ٹھہراؤ ضرور تھا..متعدد کلیساؤں کے سنہری اور نیلے گنبد..راہبوں کی رہائش گاہیں..ایک بہت بلند بیل ٹاور جو ہمیں قصبے میں اترتے ہوئے نظر آیا تھا..

اس پورے کمپلیکس میں ٹرنٹی کیتھڈرل اور سینٹ نکون کے چرچ کے در و دیوار اور گنبد بے حد خوشنما اور دل کو ایک سنہری مسرت سے آشنا کرنے والے تھے..سکول کے بچوں کا ایک پرتنظیم گروپ اس تصویر میں معصومیت کے رنگ بھرتا تھا..نئی نسل کو مذہب سے روشناس کروایا جا رہا تھا..

ہم سینٹ سرجی کے یادگار کلیسا کے اندر داخل ہوئے تو اس کے پاکیزہ اور سوگوار

ماحول نے ہم دونوں پر بہت اثر کیا۔ کلیسا کے در و دیوار پر جو تصاویر نقش تھیں وہ روح کو اسیر کرتی تھیں۔ لیکن ابھی ہم کلیسا کے مرکزی گنبدوں تلے نہیں گئے تھے بلکہ ایک ایسے خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے تھے جہاں مرد و زن سر جھکائے نہایت احترام سے کھڑے تھے۔۔ خواتین نے اپنے سروں کو سیاہ رومالوں سے ڈھانپ رکھا تھا اور ان کے رخساروں پر آنسو بہتے تھے۔۔ بچے بھی جان گئے تھے کہ یہ کوئی خاص مقام ہے جہاں انہیں چپ رہنا ہے اور سر جھکانا ہے۔۔

خاموش پاکیزگی کے اس ماحول نے ہم پر اس لیے اثر کیا کہ وہاں جتنے بھی عقیدت مند تھے۔۔ سینٹ سرجی کے مرید اور چاہنے والے تھے وہ سب کے سب اس لمحے کھرے اور ستھرے لوگ تھے۔۔ وہ دنیا کی آلائشیں اور خواہشیں ترک کر چکے تھے۔۔ جہاں کہیں بھی عقیدے کی پختگی اور محبت اور شرمندگی کی کیفیت ہو وہ مقام دل پر اثر کرتا ہے۔۔ چاہے وہ ایک مندر ہو یا کلیسا۔۔ مسجد ہو یا معبد۔۔ ایک مدفن ہو یا تقدس کے آثار۔۔

البتہ شاید اس ماحول کے زیر اثر ہم سے اس کلیسا کے اندر کچھ شرک ہو گیا۔ عقیدے کی سیاہ سحر انگیزی کچھ یوں دل میں اترتی تھی۔۔

دائیں جانب ایک سیاہ پوش میز کے گرد بہت سے لوگ۔۔ بچے۔۔ بوڑھے۔۔ عورتیں کھڑے تھے اور وہ میز پر جھکے وہاں موجود کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ رہے تھے۔۔ کچھ لاچار اور بیمار تھے اور جو لکھ نہ سکتے تھے اور اپنے عزیزوں سے کچھ لکھوا رہے تھے۔۔ ان پرزوں اور پرچیوں کو تہہ کر کے لوگ وہاں کھڑے ایک راہب کے حوالے کر رہے تھے جو انہیں جمع کر کے کلیسا کے اندر چلا جاتا اور پھر خالی ہاتھ لوٹ آتا۔۔

میں نے اشرف کمال کی مدد چاہی۔۔ آپ ذرا روسی میں کسی سے دریافت تو کیجیے کہ یہ لوگ کیا لکھ رہے ہیں۔۔

اس نے میز کے قریب بیٹھی ہوئی ایک خاتون سے دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو کی۔۔

''تارڑ صاحب۔۔'' اس نے سرگوشی میں بتایا۔ ''سینٹ سرجی بقول ان کے مسیحائی رکھتے تھے۔۔ بیماروں کو شفا دیتے تھے۔۔ اور یہاں دور دور سے ایسے لوگ آتے ہیں جنہیں طبیب لاعلاج قرار دے چکے ہوتے ہیں اور وہ ان پرچیوں پر اپنے نام اور بیماری کی نوعیت لکھ کر سینٹ سرجی سے شفا کے طلب گار ہوتے ہیں۔''

میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ میمونہ ایک عرصے سے۔۔ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس کی کسی حد تک تشخیص تو ہو چکی ہے کہ اس کے کانوں کے پردوں میں جو پانی انسان کو توازن کی حس عطا کرتا ہے' سوکھ چکا ہے' لیکن اس کا کوئی حتمی علاج نہیں ہے۔۔ دوائیوں سے کسی حد تک افاقہ ہو جاتا ہے لیکن مکمل شفا ممکن نہیں۔

''مونا۔ تم بھی ایک پرچی لکھ دو کیا حرج ہے۔۔''

''توبہ کرو ایک پادری سے شفا کی طالب ہوں۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔؟''

''کیا پتہ کس کی دعا قبول ہو جائے۔۔ اہل کتاب ہیں۔۔ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔''

میمونہ نے میرے کہنے پر اپنا نام۔۔ مذہب۔۔ قومیت اور بیماری ایک پرچی پر لکھ کر اسے نوجوان راہب کے سپرد کر دیا۔۔

ہم کلیسا کی مرکزی عمارت کے اندر آ گئے۔۔ اس کا اندرون بھی بہت متاثر کن اور پاکیزگی کی مہک والا تھا۔۔ لوگ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصاویر کے سامنے موم بتیاں روشن کر رہے تھے۔۔ ہونٹوں پر جو دعائیں لرزاں تھیں ان کی ہلکی سرسراہٹ سنہری گنبد میں ایک خفیف سی گونج کے ساتھ اٹھتی تھی۔۔

ایک جانب جہاں بہت سے عقیدت مند سر جھکائے کھڑے تھے وہاں کوئی سنہری زیارت تھی جس کی جالی کو لوگ عقیدت سے چومتے اور پھر پیچھے ہٹ کر دعا مانگنے لگتے۔۔ اس زیارت کی قربت میں ایک سیاہ پوش راہب سرنگوں حالت میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔۔ وہ نوجوان راہب جو بیماروں کی پرچیاں وصول کرتا تھا وہ آیا اور سیاہ پوش کے سامنے ان کا پلندہ رکھ دیا۔۔ ان میں میمونہ کی پرچی بھی شامل تھی۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔۔ ایک پرچی اٹھا کر اس پر لکھا ہوا نام زیر لب دہرایا اور پھر اسی طور سر ہلاتے ہوئے دعا کی۔۔ پھر دوسری پرچی اٹھائی۔۔ وہ لوگ جن کی پرچیاں سیاہ پوش کے سامنے تھیں وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔۔

چونکہ وہ دھیمی آواز میں نام اور بیماری کی نوعیت پڑھتا تھا اس لیے ہم نہیں جان سکتے تھے کہ اس نے کب میمونہ کی پرچی اٹھائی اور اس کے لیے دعا کی۔۔ ہاں یہ ہے کہ جب اس کی نظر اس پرچی پر لکھے نام اور مذہب پر پڑی ہو گی تو وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا ضرور ہو گا کہ یہ والنٹینا۔۔ گالینا۔۔ ساشا اور نتاشا میں کوئی میمونہ کہاں سے آ گئی۔۔ اور دور دیس سے

آ گئی.. اور پھر مسلمان.. مجھے یقین ہے کہ اس سیاہ پوش نے صدق دل سے میمونہ کے لیے دعا مانگی ہوگی..

پاکستان واپس ہوئے تو ایک روز میں سرجی پر ساد کے راہب خانے کی تاریخ کے بارے میں ایک تعارفی کتابچے کی ورق گردانی کر رہا تھا تو اس میں ایک انکشاف تھا ''میمونہ.. تمہیں یاد ہے کہ تم نے سرجی پر ساد کے کلیسا میں ایک پرچی پر اپنا نام اور بیماری لکھ کر دی تھی..''

''ہاں مجھے یاد ہے.. میرا جی تو نہ چاہتا تھا لیکن تم نے اصرار کیا تھا تو میں نے لکھ دیا تھا..''

''اور ایک سنہری زیارت کے سامنے سرنگوں سیاہ پوش راہب پرچیاں پڑھ کر دعائیں مانگتا تھا.. تو اس تعارفی کتابچے میں درج ہے کہ وہ سنہری زیارت سینٹ سرجی کی قبر ہے.. جس میں اس کی ہڈیاں دفن ہیں اور وہ سیاہ پوش راہب نام پڑھ کر سینٹ سرجی سے شفا کا طالب ہوتا تھا.. یعنی ایک میمونہ کے لیے بھی..''

میمونہ تو بہت ہی خفا ہوئی..

''توبہ توبہ.. تم نے مجھے شرک کا مرتکب کیا.. مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ پادری سینٹ سرجی کی قبر پر میرے لیے دعا کر رہا ہے.. ویسے صرف دعا مانگنے میں تو حرج نہ تھا لیکن ایک عیسائی سینٹ کی ہڈیوں سے میرے لیے دعا مانگی جائے.. توبہ توبہ.. روزِ حشر تم نے جواب دینا ہے..''

مونا اپنے کانوں اور دماغ میں گونجتے مسلسل شور سے مفاہمت کر چکی ہے.. مجھے نہیں معلوم کہ سینٹ سرجی کی مسیحائی نے اس پر کچھ اثر کیا ہے یا نہیں.. اگرچہ یہ راہب خانہ سینٹ سرجی پر ساد کا ایسا نہ تھا کہ میں اسے نہ دیکھتا تو میری زندگی ادھوری رہتی لیکن اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک قرار سا آ گیا تھا.. اور اس کی سب سے اثر انگیز یاد میمونہ کا ایک پرچی پر نہایت سنجیدگی سے اپنا نام اور بیماری لکھنا تھا اور پھر اس سیاہ پوش کا عاجزی سے دعا کرنا تھا.. اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ دعا قبول ہوئی یا نہیں..

ہم اگر ہر برس حج کے موقع پر.. پچیس لاکھ لوگ عاجزی اور صدق دل سے رو رو کر امت مسلمہ کی سربلندی اور کشمیر.. چیچنیا اور فلسطین کی آزادی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں تو کیا وہ قبول ہو جاتی ہیں..؟

تو اگر سینٹ سرجی کے سحر طراز کلیسا کے پُر اثر ماحول میں ایک سیاہ پوش سینٹ کی ہڈیوں

کی قربت میں میمونہ کے لیے دعا کرتا ہے اور وہ بے اثر رہتی ہے تو اس کا کیا غم..

جن دعاؤں نے قبول ہونا ہوتا ہے ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے.. مسجد.. مندر یا کلیسا کہیں بھی مانگی جائیں قبول ہو جاتی ہیں..

اور جن دعاؤں نے قبول نہیں ہونا ہوتا' وہ بے شک مقدس ترین مقامات پر مانگی جائیں قبول نہیں ہوتیں.. سینٹ سرجی بے چارے کا کیا اختیار..

تیسواں باب

"ماسکو میں مہاتما بدھ سے ملاقات"

طارق چودھری کے ہاں گزارے ہوئے دن کی جہاں بہت سی یادیں ہمارے پاس تھیں وہاں بہت سی ملاقاتیں بھی یاد آتی تھیں اور ان میں ایک شہزاد شیخ سے ملاقات بھی تھی جس نے بار بار درخواست کی تھی کہ ہم بہر صورت اس کے پاکستانی ریستوران "گندھارا" سے بھی ملاقات کریں اور بے شک اپنے ہمراہ ماسکو یونیورسٹی کی تمام اردو طالبات کو بھی لے آئیں تا کہ وہ بھی پاکستانی خوراک کے ذائقے سے آشنا ہوں۔ شہزاد جان گیا تھا کہ گندھارا میرے دل کے بہت قریب ہے اور میں اس کے ٹوٹے پھوٹے آثار اور مجسمے جمع کرنے کے خبط میں مبتلا ہوں۔

"چونکہ ماسکو میں اس سے پیشتر کوئی پاکستانی ریستوران نہ تھا اس لیے میری خواہش تھی کہ اس پہلے ریستوران کو پاکستان کی قدیم اور درخشاں تہذیب کی نمائندگی کرنی چاہیے۔۔ چنانچہ میں نے ٹیکسلا کے ایک بُت تراش سے تقریباً تیس چالیس گندھارا عہد کے مجسمے بنوائے اور ان میں سے کچھ انسانی قامت کے برابر تھے اور انہیں ماسکو کے لیے بُک کروایا تو کسٹم حکام نے روک لیا کہ یہ تو انٹیک ہیں اور انہیں ملک سے باہر لے جانا بہت بڑا جرم ہے۔۔ میں نے بہت ثبوت پیش کیے کہ جناب یہ تو نقل بہ مطابق اصل ہیں یعنی ریپلیکاز ہیں فلاں بت تراش نے تراشے ہیں اور اگر یہ اصلی ہوتے تو کیا میں اتنا احمق ہوں کہ کھلے عام ماسکو کی فلائٹ پر بک کروا دیتا مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ آثار قدیمہ کے ماہر انہیں جانچیں گے اور وہ فیصلہ کریں گے کہ یہ نقل ہیں یا اصل تو اس جانچ پڑتال میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے اور بالآخر کسی نے انہیں سمجھایا کہ ایک بچہ بھی انہیں دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ نقل ہیں تب جا کر اجازت ملی۔۔"

"یہ مجسمے آپ نے ٹیکسلا کے کس بت تراش سے بنوائے تھے۔" میں نے کچھ ماہر بت تراشوں کے نام گنوائے تو شہزاد قدرے شک بھرا ہوا کہ یہ جو تارڑ صاحب ہیں یہ کیسے ان سے واقف ہیں۔۔ غالباً گندھارا کی سمگلنگ میں ملوث ہیں۔۔

"ہاں میں نے یہ مجسمے مصطفیٰ سے بنوائے تھے جو ان دنوں امریکہ میں کسی گاہک کے لیے کوئی کام کر رہا ہے۔۔"

اس مصطفیٰ کا والد بابا زردار میرا دوست ہوا کرتا تھا اور وہ کیا ہی کمال کا ایک آذر بت تراش ہوا کرتا تھا۔۔ بے شک وہ چٹا ان پڑھ تھا اور اپنی تازہ ترین بیوی کے آگے دم نہ مارتا تھا لیکن اس کے مجسموں میں اتنا دم تھا کہ وہ سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔۔ خاص طور پر "فاسٹنگ بدھا" تو ایسا کمال کا اتنی کاملیت سے تراشتا تھا کہ اگر اسے لاہور عجائب گھر والے اصلی فاسٹنگ بدھا کے برابر میں رکھ دیا جائے تو اصل مہاتما بدھ بھی ہاتھ جوڑ دیں کہ بابا تم اصل ہو اور میں نقل ہوں۔۔

"گندھارا" ماسکو کے ایک آسائش زدہ مخصوص علاقے میں واقع ہے۔۔ صدر دروازے کے دونوں جانب بلند قامت مہاتما بدھ کے مجسمے ایستادہ ہیں اور ریستوران کے اندر ایک خانقاہی سا منظر اور ماحول ہے کہ وہاں ہر سو گندھارا عہد کے بیل بوٹے، نقش و نگار اور مجسمے نظر آتے ہیں۔۔ اس عہد کے آثار قدیمہ کی تصاویر آویزاں ہیں اور اس کی تاریخی تفصیل سے آگاہی کے لیے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔۔

اگر مسلسل روسی خوراک اور برگرز کے بعد پشاوری چاپیں۔۔ مرغ کڑاہی۔۔ سندھی بریانی اور تندور کی روٹی نصیب میں آ جائے تو کیا ہی اچھے نصیب ہوتے ہیں۔۔

برابر کے حصے میں جہاں شراب خانہ آباد کرتی تھی وہاں کسی سالگرہ کی پرشور تقریب برپا ہو رہی تھی۔۔ ایک سنہری بالوں والی خاتون ایک جنسی انداز میں مائیک سختی سے تھامے کوئی روسی پاپ سانگ الاپ رہی تھی اور عوام الناس خوب موج میلہ کر رہے تھے۔۔ بقول کسے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔۔ طاقچوں اور محرابوں میں متعدد مہاتما بدھ گیان دھیان میں گم تھے۔۔ گندھارا کے بت بنے بیٹھے تھے۔۔ چلے کاٹ رہے تھے۔۔ فاقہ کشی کر رہے تھے اور ان بے چاروں کی پسلیاں نمایاں ہو رہی تھیں اور انہوں نے تو ترکِ دنیا کا درس دیا تھا اور یہ دنیا اب ان کے سائے تلے ان کے اس راج محل کی تصویر ہو رہی تھی جہاں ہر شب رقص و سرود کی محفلیں شہزادہ سدھارتھ کے لیے سجتی تھیں، شراب کے

دور چلتے تھے اور وہ اس دنیا سے بیزار ہو کر ایک شب جب موسیقار اور رقاصائیں نیند میں مدہوش تھے اپنے گھوڑے کنتھکا پر سوار ہو کر راج پاٹ تیاگ کر جنگلوں کو نکل گئے تھے.. اور وہ موسیقار اور رقاصائیں پھر سے بیدار ہو گئے تھے اور مہاتما بدھ ان کو بت بنے تکتے تھے پر کچھ کہہ نہ پاتے تھے کہ ان کے لب پتھر ہو چکے تھے..

چوبیسواں باب

''نکولین کے سرکس میں' میرے ابا جی''

کیا کوئی مسخرہ بھی ایک قوم کا ہیرو ہو سکتا ہے..؟

میں مسخرہ پن نہیں کر رہا سنجیدگی سے سوال کر رہا ہوں کہ کیا کوئی مسخرہ بھی ایک قوم کا ہیرو ہو سکتا ہے..؟

اب میرے اس سادہ سے سوال کے جواب میں سنجیدگی سے اُن بے شمار مسخروں کے نام نہ گنوانا شروع کر دیجیے گا جو ہماری قوم کے ہیرو ہو گئے تھے.. اور ان دنوں بھی ہیں.. آپ انہیں اکثر ٹیلی ویژن پر جلوہ گر دیکھتے ہیں' اخباروں میں ان کے بیان پڑھتے ہیں اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں.. عام قسم کے ایماندار اور مسخروں کو تو لوگوں کو متوجہ کرنے کی خاطر بہروپ بھرنا پڑتا ہے.. ایک رنگین پھندنوں والی ترچھی ٹوپی اوڑھنی پڑتی ہے.. ناک پر ایک سرخ گیند چپکانا پڑتا ہے.. مزاحیہ پھولدار لباس پہننا پڑتا ہے.. ایک پہیے کی سائیکل پر سواری کرنی پڑتی ہے اور اچھل کود کرنی پڑتی ہے جب کہ یہ مسخرے اکثر تھری پیس سوٹوں' قمیض شلواروں اور کوٹوں اور وردیوں میں ملبوس تماشے دکھاتے ہیں.. کالے باغ اور سبز باغ دکھاتے ہیں.. کوئی فیلڈ مارشل ہو جاتا ہے.. اور کوئی روٹی کپڑا مکان کے کرتب دکھاتا ہے اور کوئی نوے دن کے وعدے کر کے مکر جاتا ہے اور امیر المومنین ہو جاتا ہے.. کوئی پاکستان کو ایشیا کا ٹائیگر بنا دیتا ہے اور کسی کا اذان بجنے لگتا ہے اور کوئی امریکہ کی گود میں بیٹھ کر دہشت گردی کے خلاف جنگ کا انگوٹھا چوسنے لگتا ہے.. لیکن میں تو اُن بے چارے مسخروں کی بات کر رہا ہوں جو رزق حلال کماتے ہیں.. جو لوگوں سے خوشیاں چھینتے نہیں بانٹتے ہیں.. اندر سے چاہے کتنے دکھی ہوں اپنے دکھ کو مزاحیہ لباس میں چھپائے' اپنے آنسو روکے خلق خدا کو سکھ دیتے ہیں' دکھ سے آزاد کر کے ہنساتے ہیں..

بس یہ فرق ہوتا ہے دونوں قسم کے مسخروں میں.. پہلے والے خود اپنے غیر ملکی سرمائے اور جائیدادوں اور امریکی رانچوں کے تکبر میں مسکراتے ہیں اور لوگ روتے ہیں..

اور دوسرے والے بے شک اندر سے رو رہے ہوں پر وہ خلق خدا کو مسکراہٹیں عطا کرتے ہیں..

ایک ایسا ہی مسخرہ روسی قوم کا ہیرو تھا اور اب بھی ہے جس کا نام نپولین سے ہم قافیہ نکولین تھا.. روسی نپولین سے نفرت کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ اس نے انہیں بہت دکھ دیے اور نکولین سے محبت کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ وہ ایک سکھ دینے والا تھا..

یہ ایک کلیشے ہے کہ بچپن کے دنوں کی پرستش کی جاتی ہے' ان کی آرتی اتاری جاتی ہے اس کی یاد میں آہیں بھری جاتی ہیں اور گیت گائے جاتے ہیں کہ بچپن کے دن بھلا نہ دینا.. اور میرا بچپن کوئی لوٹا دے مجھے وغیرہ.. اگرچہ میرا بچپن نہایت سہولت اور آسودگی سے گزرا کہ میں ماں باپ کا سب سے بڑا اور لاڈلا برخوردار تھا.. مجھے تمام تر آسائشیں اور محبتیں میسر تھیں.. کسی شے کی کمی نہ تھی کوئی ناآسودگی نہ تھی اور اس کے باوجود مجھے بچپن کچھ زیادہ پسند نہ تھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب میں بڑا ہو گیا.. میں نے کبھی نہ چاہا کہ کوئی مجھے میرا بچپن لوٹا دے.. اگر چاہا تو یہی چاہا کہ نوجوانی کے بخار کے کچھ دن لوٹ آئیں..

البتہ ایک دو یادیں بچپن کی ایسی بھی ہیں جنہیں میں عزیز رکھتا ہوں اور یاد کرتا ہوں.. اور ان میں سے ایک سرکس کی یاد ہے..

میرے اباجی میری انگلی تھامے میکلوڈ روڈ چوک اور مسجد مائی لاڈو کے درمیان اس زمانے میں واقع پٹیالہ گراؤنڈ میں منعقد ہونے والی ایک نمائش میں لے جا رہے ہیں جہاں کُل لاہور.. اس زمانے میں جتنا بھی تھا امڈتا چلا آ رہا ہے لیکن کاروں پر نہیں سائیکلوں.. تانگوں پر اور پیدل چلا آ رہا ہے. نمائش کا سب سے سنسنی خیز لمحہ وہ ہے جب ایک بازی گر ایک آسمان تک بلند ہوتی سیڑھی پر چڑھتا چلا جا رہا ہے.. وہاں ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنے بدن پر پٹرول چھڑک کر آگ لگاتا ہے اور اس بلندی سے شعلوں میں بھڑکتا.. لاہور کے تاریک آسمان میں ایک آتش فشاں کی مانند چکا چوند کرتا وہاں سے چھلانگ لگاتا ہے اور جلتا ہوا نیچے جہاں ہم کھڑے ہیں وہاں ایک تالاب میں آ گرتا ہے اور بجھ جاتا ہے..

اور اس آتش فشاں کرتب کی قربت میں ایک مخروطی ٹینٹ ہے جس کے اندر ہم جاتے

ہیں.. یہ ایک سرکس ہے سرخوشی اور حیرت کی ایک عجیب کائنات ہے.. رنگارنگ لباسوں میں مسخرے قلابازیاں لگاتے ہیں.. ایک پہیئے کی سائیکل چلاتے ہیں اور ہم بچہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے' اپنے ماں باپ کے قابو میں نہیں آتے' کرسیوں سے گرتے جاتے ہیں' وہاں جھولے جھولتے بازی گر بھی ہیں.. جنہیں اُس جھولے سے جھولتے مخالف سمت سے آنے والے خالی جھولے کی جانب فضا میں لپکتے اور اسے گرفت میں لیتے دیکھ کر دل رک جاتے ہیں.. اور پھر وہاں بہت ہی دھاڑنے والے شیر ببر تھے جن کی دھاڑ سن کر ہم بچوں کی تو پوپھٹ گئی.. کسی بچے سے استاد نے سوال کیا کہ بیٹے: ''پو پھٹ جانے'' کو فقرے میں استعمال کرو تو اس ذہین بچے نے بہت سوچنے کے بعد کہا.. میں جنگل میں جا رہا تھا اور سامنے سے شیر آ گیا تو میری پو پھٹ گئی.. تو اس سرکس میں بھی آج سے ساٹھ برس پیشتر کے لاہور میں پٹیالہ گراؤنڈ میں جو سرکس تھا اس میں ایسے ہی شیر تھے جنہیں دیکھ کر پو پھٹ جاتی تھی.. اور اب یاد کرتا ہوں تو جھولوں پر جھولتی کچھ مختصر لباس لڑکیاں بھی تھیں اور ایک گھوڑے پر کھڑی کرتب دکھاتی اسے بھگاتی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے لبادے کے بارے میں سرکس کی نشستوں پر براجمان ہزاروں لاہوری تماشائیوں نے کچھ اعتراض نہ کیا کہ یہ غیر شرعی ہے.. تب گمان بھی نہ تھا کہ یہ لباس ایسے ہیں' اب جا کر ایمان کے امتحان میں سے گزرے ہیں تو احساس ہوا ہے کہ بچپن میں کیسی غلط کاریاں کرتے رہے ہیں.. سرکس کی لڑکیوں کو دیکھتے رہے ہیں.. تیرا کیا بنے گا کالیے..

ویسے اُن دنوں کسی مدرسے کی سیاہ پوش ڈنڈہ بردار' ہاتھوں میں بھی پلاسٹک کے دستانے چڑھائے ''طالبات'' کو اگر کسی ایسے سرکس میں لے جایا جائے تو وہ ان بے حیا نیم عریاں خاتون بازی گروں کو کس نظر سے دیکھیں گی.. اگر وہ اپنی پردہ پوشی کے سوراخوں سے کچھ دیکھ سکتی ہوں تو وہ جو کچھ دیکھیں گی اس پر فدائین حملے کرنے کا اعلان کر دیں گی اور غالباً ان بے حیا بازی گر خواتین کو اغوا کر کے لے جائیں گی اور جب تک وہ ایمان کی روشنی سے منور نہیں ہو جاتیں.. برقے نہیں اوڑھ لیتیں انہیں آزاد نہیں کریں گی..

یہ طے ہے کہ چینی اور روسی سرکس کے کرتب اور کمالات دنیا بھر میں بہترین ہیں..

چنانچہ جب روس کی سرزمین پر قدم رکھا تو میرے اندر کا بچہ شور مچانے لگا کہ مجھے سرکس دکھاؤ' مجھے مسخرے اور شیر دکھاؤ.. بے شک مختصر لباس والی دوشیزائیں نہ دکھاؤ پر ایک آدھ ہاتھی ہی دکھا دو..

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی بچے کے لیے یا ایسے بڑے کے لیے جس کا دل پتھر کا نہیں ہو

چکا اور اس میں زندگی کی کچھ حرارت موجود ہے تو اس کے لیے بے پایاں مسرت سے ہمکنار کرنے والے صرف دو مقام ہیں.. چڑیا گھر اور سرکس..

بہر حال میں نے اپنی ہمہ وقت میزبان آنیا سے جب اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی: "مستنصر.. ماسکو میں دو قسم کے سرکس ہیں.. ایک تو بہت ہی جدید نوعیت کی عمارت میں واقع ہے اور دوسرا پرانا سرکس ہے.. آپ کون سا دیکھنا پسند کریں گے..؟"

"چونکہ میں خود ذرا پرانا ہوں اس لیے پرانا سرکس دیکھنا پسند کروں گا.."

آنیا فوراً متحرک ہو گئی اور اس نے اگلے روز کے لیے نکولین کے یادگار سرکس کے تین ٹکٹ حاصل کر لیے..

سرکس کی تھیٹر نما عمارت کے آگے جو چوڑا فٹ پاتھ ہے وہاں ایک پرانی وضع کی کار ہے اور اس کا دروازہ نکولین کھول رہا ہے اور آپ کو کہہ رہا ہے 'تشریف رکھیے..

آپ اس کی دعوت قبول کر لیتے ہیں' میمونہ سٹیئرنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور میں نکولین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنیا سے تصویر اتروانے لگتا ہوں..

کار کا یہ جستی ماڈل اور مسکراتے ہوئے مسخرے نکولین کا مجسمہ دیکھ کر پہلی نظر میں تو دھوکا ہوتا ہے کہ یہ دونوں اصلی ہیں کہ وہ اتنے زندہ دکھائی دیتے ہیں اور پھر احساس ہوتا ہے کہ نہیں یہ تو ایک خوبصورت یادگار ہے..

سڑک کے پار ایک خوش نظر پارک ہے جہاں نکولین کے مسخرے پن کے مختلف روپ آہنی مجسموں میں ڈھلے نمائش پر ہیں اور یہ بھی متحرک اور ہونٹوں پر یکدم مسکراہٹ لانے والے روپ ہیں.. ایک اچھلتے فوارے کے درمیان میں ایک پہیے کی سائیکل پر سوار ڈھیلے ڈھالے مسخرے لباس میں ایک پچکا ہوا چھاتا سر پر تانے نکولین ایسا پیارا کردار ہے کہ آپ اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے..

کہیں وہ کمر تک جھکے ایک اور مسخرے پر سے چھلانگ رہا ہے..

اور کہیں پارک کے فرش پر ٹانگیں پھیلائے قہقہے لگاتا ایک اور نکولین ہے..

ابھی اگلے شو کے آغاز میں کچھ وقت تھا اس لیے ہم ایک بنچ پر بیٹھ کر ان بے حساب شور مچاتے' چیخیں مارتے روسی بچوں کی حرکتوں سے محظوظ ہونے لگے جو نکولین کے مجسموں سے لپٹ

رہے تھے.. اُن پر سواری کر رہے تھے اور کچھ بہت چھوٹے بچے والدین کے ورغلانے سے یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ نکولین کے مجسمے زندہ ہیں اور ان سے باتیں کی جا سکتی ہیں.. وہ نہایت معصومیت اور سنجیدگی سے ایک ہنستے ہوئے نکولین سے سوال پوچھتے اور ان کے والدین فوری طور پر انہیں بتاتے کہ نکولین تمہارے سوال کے جواب میں یہ کہہ رہا ہے..

"نکولین کیا تمہیں آئس کریم پسند ہے..؟"

"ہاں مجھے آئس کریم پسند ہے.."

"تو پلیز میری آئس کریم کھا لو.." بچہ اپنی آئس کریم مجسمے کے ہونٹوں تک لے جاتا ہے..

"نہیں نہیں.. تم کھاؤ مجھے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے.. میں موٹا ہو جاؤں گا تو اچھل کود کیسے کروں گا.."

"نکولین میں تم سے محبت کرتا ہوں.. آئی لو یو.."

"میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور میں نے تم جیسا پیارا بچہ کبھی نہیں دیکھا.."

"نکولین پلیز میرے ساتھ گھر چلو.."

"اوہو نکولین کہتا ہے کہ اگر میں یہاں سے چلا گیا تو میرے اپنے بچے بہت پریشان ہوں گے کہ ڈیڈی کہاں چلا گیا.. تم مجھے اپنا پتہ دے دو.. کسی چھٹی کے دن میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں اپنے کرتب دکھاؤں گا.."

وقت مقررہ پر سرکس کی عمارت کے اندر داخل ہوئے تو وہاں برآمدوں اور سیڑھیوں پر ایک میلہ لگا ہوا تھا.. ہال کے دروازے ابھی نہیں کھلے تھے اور منتظر بچے سرکس سے متعلق تحفوں اور کھلونوں کی دکانوں کے گرد اودھم مچا رہے تھے.. سیلز گرلز بھی جوکروں کے میک اپ میں مخروطی ٹوپیاں پہنے بچوں کی دل لگی کا سامان کر رہی تھیں.. سب سے پسندیدہ کھلونا نکولین کی ایک پتلی تھی جسے دھاگوں کی مدد سے نچایا جا سکتا تھا.. غبارے فروخت کرنے والی ایک موٹی سی خاتون بھی مسخری بنی ہوئی تھی.. کبھی کبھار غبارے میں ہوا بھرتے ہوئے وہ اپنے سرخی سے پوچے ہوئے گال پھلاتی ہے تو یکدم غبارہ پھٹ جاتا ہے اور وہ خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے زمین پر گر جاتی ہے اور بچے لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے ہیں..

سرکس کے بیرونی برآمدوں میں نکولین کی تصاویر کے رنگین پوسٹر آویزاں تھے.. مُونا اور آنیا نے ایک ایسی ہی تصویر کے ساتھ کھڑے ہو کر ایک پُر مزاح فوٹو اتروائی جس میں وہ دونوں بے تحاشا ہنس رہی ہیں اور نکولین ایک ننھا سا ہیٹ سر پر رکھے انہیں حیرت سے تک رہا ہے کہ ان بچیوں کو کیا ہوا ہے جو بے وجہ ہنستی جا رہی ہیں.. ہاں اس سرکس میں داخل ہونے والے تمام بڑے بھی اب بچے ہو گئے تھے..

میں نے کسی ایک مقام پر اتنے ڈھیر سارے بچوں کو اتنا ڈھیر سارا خوش کبھی نہیں دیکھا.. یہاں کوئی ایک چہرہ بھی ایسا نہ تھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ ہو.. مسکراہٹ ایک وبا کی مانند پھیلی ہوئی تھی..

نکولین پورے روس میں اتنا مشہور اور پسندیدہ تھا کہ لوگ اس کی تصویریں گھروں میں لگاتے تھے اور اپنے بچوں کے نام نکولین رکھتے تھے.. یہاں تک کہ جب بچوں سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنیں گے تو فوجی.. پائلٹ یا اداکار کے علاوہ کچھ بچے کہتے تھے ہم تو بڑے ہو کر مسخرے بنیں گے نکولین کی طرح..

اس چُلبلاتے.. مسکراہٹوں کی پھوار میں بھیگے میلے میں البتہ مجھے کچھ دکھ بھی ملے.. پہلا دکھ مجھے ایک بوڑھے اور لاچار ہو چکے بن مانس نے دیا جس کے بال جھڑنے لگے تھے اور وہ گنجا ہو رہا تھا..

دوسرا دکھ ایک چھوٹے سے ریچھ کے بچے نے دیا جو خوف سے ہانپ رہا تھا..

اور تیسرا اور سب سے بڑا دکھ ایک رائل بنگال ٹائیگر نے دیا جو نیم مدہوشی کے عالم میں پڑا تھا..

بوڑھے اور گنجے ہوتے بن مانس کا مالک یا رکھوالا اردگرد جمع ہوتے بچوں کو ترغیب دے رہا تھا کہ وہ اتنے روبل ادا کر کے اسے گود میں لے کر تصویر اتروا سکتے ہیں.. اسے گدگدی کر سکتے ہیں.. اس کے بازو اپنی گردن میں حمائل کر سکتے ہیں اور وہ بن مانس ایک بے چارگی اور مجبوری کی حالت میں تصویریں اتروا رہا تھا اور مالک روبل اکٹھے کر رہا تھا..

ننھے ریچھ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا..

لیکن رائل بنگال ٹائیگر ایسے شاہانہ اور شاندار جانور سے جو سلوک روا رکھا جا رہا تھا' اسے فروخت کیا جا رہا تھا وہ مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا.. مجھے تو ذاتی طور پر چڑیا گھر میں قید اور

سرکس میں کرتب دکھانے والے شیر اور چیتے بھی دکھ دیتے تھے کہ انہیں ظلم اور تشدد سے سدھایا جاتا تھا اور اکثر بھوکا رکھا جاتا تھا.. لیکن یہاں اس دھاری دار مہندی رنگے ٹائیگر کو جس طور ذلیل کیا جا رہا تھا وہ ایک ناقابل معافی جرم تھا.. اسے ایک سفید چبوترے پر لٹایا گیا تھا جس کے پس منظر میں ایک منقش پردہ تھا.. اس کا مالک کبھی اسے 'تھپکتا' کبھی اس پر بیٹھنے کی اداکاری کرتا اور کبھی کوشش کر کے اسے دھاڑنے پر مجبور کرتا تا کہ بچے متوجہ ہو سکیں.. یہاں نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی اس ٹائیگر کے گرد بانہیں ڈال کر اس کی تھوتھنی چومتے تصویریں اتروا رہے تھے.. ایک بہت پیارے بچے کی ماں اسے زبردستی ٹائیگر کے برابر میں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بیٹھتا نہ تھا' خوفزدہ حالت میں چیخیں مارتا تھا.. لیکن ماں نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنے برخوردار کی تصویر ٹائیگر کے ساتھ اتروا کر رہے گی..

ادھر مالک بچے کو پچکار رہا تھا کہ دیکھو یہ کچھ نہیں کہتا.. میں اس کی دم کھینچتا ہوں.. اس کے کان پکڑتا ہوں اور یہ کچھ نہیں کہتا.. تصویر اتروا لو.. میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بیچارے رائل بنگال ٹائیگر کو کوئی نشہ آور شے پلائی گئی تھی یا نیم مدہوشی کا کوئی ٹیکہ لگایا گیا تھا ورنہ وہ اتنی بے چارگی سے یوں نیم بیہوشی کی حالت میں بے سُدھ نہ پڑا ہوتا.. اگر آپ اسے زچ کرتے ہیں تنگ کرتے ہیں اور وہ کچھ ردعمل ظاہر نہ کرے' چپ چاپ سہتا رہے تو وہ ہوش میں نہیں..

یہ کیسا ظالمانہ اور لالچ سے اندھے ہو جانے والا کاروبار تھا..

روس میں یقیناً جانوروں سے بے رحمی کے انسداد کے لیے کوئی سرکاری ادارہ یا انجمن نہ تھی.. ایسے لوگوں سے کوئی پرسش نہ کی جاتی تھی.. اس سے پیشتر میں سرخ چوک کے داخلے پر دو عقابوں اور بندروں کا تذکرہ کر چکا ہوں جن کے مالک ان سے یہی پیشہ کروا رہے تھے.. پاکستان میں کم از کم اتنا تو ہے کہ ریچھ اور کتوں کی لڑائی پر پابندی لگا دی گئی ہے اور ریچھوں کو نکیل ڈال کر گلی گلی تماشا دکھانا ممنوع قرار پا چکا ہے.. کچھ برس پیشتر تک میرے گھر کے قریب لبرٹی مارکیٹ کے آس پاس ایک بہت ہی وسیع تن و توش کا.. اتنا بڑا کہ یقین نہ آتا تھا بھورے بالوں سے بھرا بھالو لاہور کی سلگتی دوپہروں میں پڑا ہانپ رہا ہوتا تھا اور جونہی کوئی راہ گیر اس میں دلچسپی ظاہر کرتا تھا تو اس کا مالک اس کی نکیل کھینچ کر اسے ناچنے پر مجبور کر دیتا تھا اور یاد رہے کہ ایک بھالو صرف نکیل کھینچنے کی وجہ سے نہیں ناچتا بلکہ اس نکیل کی وجہ سے اس کے نتھنوں میں جو زخم ہو جاتے ہیں اور ان میں پیپ پڑ چکی ہوتی ہے اس کی اذیت سے ناچتا ہے..

ایک روز میں نے ایک عجیب منظر دیکھا' بھورے بھالو کے قریب برف کا ایک بلاک دھرا تھا اور وہ اسے نہایت رغبت سے چاٹتا اور کبھی گرمی کی شدت سے تنگ آ کر اپنا بدن اس کے ساتھ رگڑتا.. غالباً یہ کسی ایسے رحم دل شخص کا تحفہ تھا جو میری طرح جانوروں پر ظلم ہوتا دیکھ کر گزر نہیں جاتا تھا ان کی اذیت کم کرنے کے لیے ان کے لیے کچھ نہ کچھ کر جاتا تھا.. مجھے نہیں معلوم اب وہ بھالو کہاں ہے.. اور ایسے بڑے بھالو جنہیں گرزلی کہا جاتا ہے پاکستان میں ہوتے بھی نہیں.. جانے کہاں سے لایا گیا تھا.. مجھے اس سے اس لیے بھی الفت تھی کہ بہت عرصہ پہلے ایک خاتون نے مجھے بھی گرزلی کا خطاب دیا تھا..

وقت مقررہ پر سرکس کے دروازے کیا کھلے' سیلاب کے دروازے کھل گئے اور بچوں کا سیلاب ہمکتا مچلتا اندر جانے لگا..

اور واقعی سرکس کا اندرون نہایت دیدہ زیب اور سنہری قدامت میں سانس لیتا ہوا تھا..

عین سامنے نشستوں سے اوپر ایک فرانسیسی محل نما سیٹنگ میں ایک آرکسٹرا سرکس کی مخصوص دھنیں بجا رہا تھا.. ایک سریلا اور موسیقی کے فن میں تاک آرکسٹرا سرکس کے لیے اتنا ہی لازمی ہوتا ہے جتنی کہ فلم کے ڈرامائی مناظر کو اجاگر کرنے کے لیے متاثر کن پس منظر موسیقی..

آپ کسی بھی اعلیٰ فلم کے مناظر کو پس منظر موسیقی کے بغیر تصور میں لائیں تو وہ کیسے بے روح ہو سکتے ہیں.. اسی طور آرکسٹرا بھی سرکس کی جان ہوتا ہے.. خاص طور پر جب کسی کرتب کے دوران بازی گر کی جان جانے کا خدشہ ہو تو آرکسٹرا ہی اس ڈرامائی لمحے میں جان بھر دیتا ہے.. اور جوکر حضرات کی حرکتوں کے ساتھ جب تک ایک گونج دار دھمام سنائی نہ دے تو لطف ہی نہیں آتا..

ایک ڈرامائی اور شیکسپیئر کے تھیٹر کے لہجے والی آواز سرکس میں گونجی کہ خواتین و حضرات.. اور سب چپ ہو گئے.. روشنیاں گل ہو گئیں..

سب سے پہلے دو چار درجن رقاصائیں بھڑکتی روشنیوں میں بھڑکتی کسی حد تک مشرقی اور بہت حد تک ہیجان خیز لباسوں میں پنڈال میں داخل ہوئیں.. لباس تو وہ نام کے تھے البتہ ہیجان کی فراوانی تھی.. تو یہ بھڑکیلی چمکیلی خواتین کبھی تو افریقی انداز میں لچکنے لگتیں اور کبھی ہندوستانی سی ہو کر مٹکنے لگتیں اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے لگتیں.. یہ پرفارمنس ہم ایسے بڑے بوڑھوں کے خفتہ جذبات بیدار کرنے کے لیے تھی.. جو نہ ہوئے..

اگرچہ یہ اعلان بار بار کیا جا چکا تھا کہ تصویر اتارنے کی ممانعت ہے پر بچے کہاں باز آتے تھے.. نیم تاریکی میں ان کے کیمروں کے فلیش ٹوٹتے ستاروں کی مانند بھڑکتے اور پھر بجھ جاتے..

پھر کچھ کمال کے بازی گر آئے.. جھولوں پر کرتب دکھانے والے آئے.. اور ہر دو چار منٹ بعد بے تحاشا تالیاں پیٹنے والے بچوں میں مجھ بچے کی تالی سب سے زیادہ پر شوق اور بلند تھی کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے بچپن میں سفر کر گیا تھا.. سچ مچ بچہ ہو گیا تھا کہ وہاں میں اباجی کی انگلی تھامے چل رہا تھا اور کبھی حیرت سے اوپر دیکھتا تھا اور بہت اوپر اباجی کا سفید چہرہ اور نیلی آنکھیں ہیں اور میں حیران ہوتا ہوں کہ وہ میری نسبت اتنے لمبے کیوں ہیں..

اور اباجی حسب عادت مجھ سے دکانوں پر آویزاں سائن بورڈ اور دیواروں پر لکھے اشتہار اور سڑکوں کے نام پڑھوا رہے ہیں تا کہ بچے کی اردو اور انگریزی پالش ہو جائے اور بچے یاد ہو جائیں.. تو بیٹے یہ کیا لکھا ہے.. یہ کس چیز کی دکان ہے.. یہاں گھڑیاں مرمت ہوتی ہیں.. احسان پنساری سٹور.. فلاں راشن ڈپو.. بلا برفی والا.. دھنی رام روڈ.. گوبند رام کلاتھ مرچنٹ.. فرنچ وائن سٹور.. نہ بیٹا یہ نہیں پڑھنا.. اباجی یہ کس شے کا سٹور ہے.. کہا جو ہے کہ نہیں پڑھنا آگے پڑھو.. یہاں بناسپتی گھی دستیاب ہے.. اور میں ہمیشہ اسے بناس پتی کی بجائے بنا سپتی پڑھتا تھا اور وہ کون سا ایسا بچہ ہے جس نے اردو میں لکھے الیکٹرک کو علی کڑک نہ پڑھا ہو اور ہم دونوں سرکس دیکھنے جا رہے ہیں.. نہ ماسکو تھا نہ نکولین سرکس تھا اور نہ تالیوں کی آواز.. بس ایک دھندلاہٹ میں گم سناٹا تھا جس میں میں اپنے اباجی کے ساتھ لاہور میں پٹیالہ گراؤنڈ کی جانب سرکس دیکھنے جا رہا تھا.. اور میں اس لمحے ان کے لیے بہت اداس ہو گیا..

اور کیا آپ ایک ایسے بوڑھے شخص کو تصور میں لا سکتے ہیں جو اپنے اباجی کے لیے اداس ہو جائے تو تو اس کی شکل کیسی ہوتی ہے.. عجیب سی مزاحیہ سی سرکس کے ایک مسخرے جیسی ہو جاتی ہے اگرچہ اس مسخرے کے نقاب کے اندر آنکھیں آبدیدہ ہوتی ہیں اور وہ ایک ایسا بچہ ہوتا ہے جو بوڑھا دکھائی دے رہا ہوتا ہے..

اس سرکس میں جتنی بھی بازی گریاں دکھائی گئیں جو کرتب اور شعبدے دکھائے گئے وہ کمال کے تھے.. کمال کے تھے پر یادگار نہ تھے.. شاید اس لیے کہ روس کے بہترین سرکس فنکار سارا سال غیر ملکی دوروں پر رہتے ہیں اور کم ہی مقامی طور پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں.. جیسے ہمارے ہاں کے صف اوّل بلکہ صف دوم کے گلوکار بھی امریکہ اور انگلستان میں ہی پائے جاتے ہیں کہ وہاں

ڈالر اور پاؤنڈ بھی وافر پائے جاتے ہیں تو ہمیں پاکستان میں بچے کھچے گلوکاروں پر ہی گزارہ کرنا پڑتا ہے..

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک سرکس ہو اور اس میں ایک سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر کھڑی ایک پرکشش مختصر لباس کی حسینہ کرتب نہ دکھائے..اور لوگ گھوڑے کو فراموش کر کے صرف اس حسینہ پر نظریں چپکا دیں..

تو یہ بھی ہوا اور اسے دیکھ کر مجھے وہی نہایت فرسودہ ہو چکا لطیفہ بری طرح یاد آیا اور میں نے آنیا کو بھی اس میں شریک کر لیا کہ ایک دادا جان جب بچوں کے ہمراہ کسی طور سرکس جانے پر آمادہ نہ ہوئے تو انہیں یونہی بتایا گیا کہ دادا وہاں ایک سفید گھوڑے پر سوار بہت ہی مختصر لباس میں ایک خوبصورت لڑکی بھی کرتب دکھاتی ہے تو دادا جان فوراً مان گئے کہ تم اصرار کرتے ہو تو چلا چلتا ہوں کہ میں نے ایک عرصے سے ایک سفید گھوڑا نہیں دیکھا..

''مستنصر..کیا یہ ایک پاکستانی لطیفہ ہے..؟'' وہ بری طرح ہنسنے لگی..

''ہاں..''

''لیکن یہ لطیفہ تو ہم روس میں بچپن سے سنتے آئے ہیں..''

عمدہ لطیفے ہمیشہ سفر کرتے ہیں..بین الاقوامی ہوتے ہیں..پاکستان میں تو سرکس کی یہ روایت نہیں ہے تو یہ لطیفہ روس سے سفر کرتا ہوا پاکستان پہنچ گیا ہوگا..

پرفارمر آتے جاتے رہے..جھولوں پر جھولتے مخالف سمت سے آنے والے خالی جھولے کو ہوا میں تیرتے گرفت میں لے کر اپنا کمال دکھاتے رہے.....نہ سمجھ میں آنے والے شعبدوں سے حیران کرتے رہے اور میں منتظر رہا..ہر وقت آنیا سے پوچھتا رہا کہ..آنیا وہ ہاتھی اور شیر کب آئیں گے..اور آنیا نے چونکہ اردو میں جواب دینا ہوتا تھا تو وہ ایک لمبی سوچ میں پڑ جاتی اور بالآخر ایک فقرہ تیار کر لیتی..''مستنصر..پتہ نہیں..ہوسکتا ہے کہ آئیں..ہوسکتا ہے نہ آئیں..''

اور میں کہتا..آنیا وہ سرکس کس کام کا جس میں شیر اور ہاتھی نہ ہوں..اور وہ کندھے اُچکا دیتی..

بالآخر میری بچگانہ آرزو پوری ہوگئی..ہاتھی تو نہ آئے درجن بھر سوہنے سنہری بنگال ٹائیگر پنڈال میں سر ہلاتے احتجاج کرتے آ گئے اور انہوں نے اپنے سدھانے والے شخص کے چابک کے خوف سے کچھ کرتب دکھائے..کبھی بلند سٹولوں پر جا بیٹھے اور کبھی آگ کے دائروں میں سے گزرے..

اور ان میں سے ایک ٹائیگر ایسا تھا جو سب سے سست اور کاہل تھا..جب تمام ٹائیگر سٹولوں پر سے اتر آتے تو وہ وہیں بیٹھا رہتا..اور جب اسے آگ کے دائرے میں سے کودنے کے لیے کہا جاتا تو وہ تامل کرتا اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ جاتا..شاید وہ ابھی حال ہی میں اپنے جنگل سے جدا ہوا تھا اور اسے اسیری اور مجبوری کی عادت نہ ہوئی تھی..جب وہ اپنے ٹرینر کے اشارے پر دھاڑتا بھی تھا تو بہت ناراض ہو کر دھاڑتا تھا..

مجھے یقین کامل تھا کہ کولین سے منسوب سرکس میں دنیا کے مسخرے ترین مسخرے ہوں گے..پر جو مسخرے آئے وہ کچھ زیادہ مسخرے نہ تھے..ہمارے لاہوری تھیٹر کے مزاحیہ اداکار ان سے کہیں بلند مرتبے پر فائز تھے..اور ان کی مسخرانہ محدودیت کے باوجود تماشائیوں نے انہیں دل کھول کر داد دی..بچے لوگ اپنی نشستوں پر اچھلتے' تالیاں بجاتے ان سے براہ راست باتیں کرتے تھے..دراصل ہر انسان کو..اور خاص طور پر ہر ایک بچے کو ہنسنے کا ایک بہانہ درکار ہوتا ہے..اور وہ جیسے بھی تھے ایک بہانہ تو تھے..

صرف ہنسنے کے لیے ہی نہیں..اداس ہونے کے لیے..عشق میں مبتلا ہونے کے لیے..ظلم کرنے اور اسے سہنے کے لیے..تکبر اور اولیائی کے لیے ہمیشہ ایک بہانہ چاہیے...بے شک کولین کا یہ سرکس میری توقعات پر پورا نہ اترا تھا..لیکن میں نے وہاں جو اتنے ڈھیر سارے بچوں کو پرمسرت اور چہکتے ہوئے' تالیاں بجاتے' شور مچاتے دیکھا تھا تو انہوں نے مجھے ایسی سرخوشی سے سرشار کیا تھا کہ اگر میں یہ سرکس نہ دیکھتا تو روس کی روح کی پہنائیوں میں نہ اتر سکتا..

یوں بھی وہ سرکس کیسے معمولی اور فراموش کر دینے والا ہوسکتا تھا جہاں میرے ابا جی آ گئے ہوں اور میں ان کی انگلی تھامے چلتا ہوں اور ان کے لیے اداس ہو گیا ہوں اور بے شک اس بڑھاپے میں کولین سے بڑھ کر پر مزاح لگتا ہوں کہ میں ان کے لیے اداس ہوتا ہوں اور میری آنکھوں میں نمی تیرتی ہے..

پچیسواں باب

"سینٹ پیٹرزبرگ کا آئینے میں کھلا پھول"

میری زندگی میں ایک خواب ہے' اک چراغ ہے اور تم ہو..

ہر شخص کی حیات میں کم از کم ایک خواب ہوتا ہے' ایک چراغ بھی ہوتا ہے لیکن یہ طے نہیں ہے کہ ایک "تم" بھی ہو..

میری حیات میں کوئی ایک خواب نہ تھا.. خوابوں کے گھنے جنگل تھے جن میں چراغ جلتے تھے اور ان میں سے بہت سے پورے ہو گئے اور کچھ نا تمام رہے.. اور ان میں ایک سینٹ پیٹرزبرگ بھی تھا..

میں اقرار کرتا ہوں کہ جب روس جانے کا امکان ظاہر ہوا تو یقین کیجیے مجھے بہت زیادہ اشتیاق نہ ہوا' بے تابی نہ ہوئی ماسکو کو دوبارہ دیکھنے کی.. جی چاہتا تھا پر ٹوٹ کر نہ چاہتا تھا.. لیکن ٹوٹ کر جی چاہتا تھا سینٹ پیٹرزبرگ دیکھنے کو.. بلکہ میری عمر کے لوگوں کے لیے وہ اب بھی لینن گراڈ تھا.. محاصرہ لینن گراڈ تھا اور یہ روسیوں کی سخت جانی اور ہار نہ ماننے والی مقابلے کی روح تھی' جس کے آگے بالآخر نازیوں نے ہتھیار ڈال دیے.. پورا شہر تباہ ہو گیا' لاکھوں شہری ہلاک ہوئے' ڈوب گئے' بھوک سے مر گئے لیکن روسی روح نے مرنے سے انکار کر دیا.. سینٹ پیٹرزبرگ والے ماسکو ایک بڑا گاؤں قرار دیتے ہیں اور اس کے باشندوں کو کسی حد تک غیر تہذیب یافتہ اور دہقان سمجھتے ہیں.. وہ نہایت نک چڑھے اور متکبر لوگ ہیں اپنے شہر کو ادیبوں.. شاعروں.. موسیقاروں اور مصوروں کا شہر کہتے ہیں جب کہ بقیہ روس میں صرف دیہاتی آباد ہیں..

سینٹ پیٹرزبرگ روسی زاروں کا دارالسلطنت تھا اور روس کا سب سے خوش نظر شہر..

اکتوبر انقلاب کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا تھا..

میرے لیے جہاں اس کا خوبصورت فن تعمیر.. دریائے نیوا پر قوس ہوتے کلاسیکی طرز کے قدیم پل' وسیع باغات اور زار کے محلات ایک کشش رکھتے تھے وہاں میری بنیادی دلچسپی اس کے ہرمیتاژ میوزیم میں تھی جو شاندار محلات کا ایک سلسلہ تھا اور جس میں دنیا بھر کے نایاب مصوری اور سنگ تراشی کے آثار نمائش پر تھے.. بقول لڈمیلا اگر آپ اس کے ہر کمرے میں صرف جھانک کر آگے بڑھ جائیں تو بھی اسے مکمل طور پر دیکھنے کے لیے کئی ماہ درکار ہوں گے..

میں جس شہر میں بھی قدم رکھتا تھا تو خواہش یہی کرتا تھا کہ میرا اگلا قدم وہاں کے کسی میوزیم میں ہو اور اس خواہش نے مجھے بسا اوقات بہت بیزار بھی کیا لیکن زندگی کے کچھ بیش قیمت لمحے بھی عطا کیے.. یہ میرا ذوق جمال نہ تھا جو مجھے کشاں کشاں میوزیم میں لے جاتا تھا بلکہ یہ جاننے اور دیکھنے کی تمنا تھی جو مجھے بے چین کرتی تھی..

پیرس کے لوور.. برلن کے ڈاہلم میوزیم.. فلارنس کے اوفیزی.. ایمسٹرڈیم کے رائکس اور میوزیم آف ماڈرن آرٹ.. میڈرڈ کے پراڈو.. لندن کے نیشنل آرٹ گیلری وغیرہ کے بعد میں نے نیویارک کے میٹروپالیٹن.. موما اور گوگن ہائم میں ابھی پچھلے برس اپنی زندگی کے چند یادگار لمحے بسر کیے تھے.

دنیا کی بڑی آرٹ گیلریز میں سے صرف عظیم ہرمیتاژ تھا جو میری پہنچ سے باہر رہا..

اور اب وہ میری پہنچ میں تھا اور پھر بھی میں اس تک پہنچ نہیں پا رہا تھا..

میرے میزبانوں نے لاہور میں وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے بہر صورت سینٹ پیٹرزبرگ پہنچائیں گے.. بندوبست کریں گے.. پر ایسا نہ ہو سکا..

جتنے روز بھی ماسکو میں رہا.. پیٹرزبرگ کے خیالوں سے غافل نہیں رہا.. تگ و دو کرتا رہا کہ اتنا قریب ہوں تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں..

لیکن نہ پہنچ سکا..

جیسے پچاس برس پیشتر رتی گلی کی بلند برف پوش چوٹی کے پار اترتے ہوئے سامنے نیلی چٹانوں میں ایک سحر انگیز جھیل نظر آتی تھی جس میں برف کے تودے سفید راج ہنسوں کی مانند تیرتے تھے اور ایک آبشار تلے آتے تھے تو پانیوں کے زور سے کھسکتے ہوئے ان کی بوچھاڑ سے دور ہو کر اطمینان سے جھیل میں حرکت کرنے لگتے تھے.. میں یہ جھیل نہ دیکھ سکا بلکہ اس تک پہنچ نہ سکا.. ابھی دو برس پیشتر میں پھر انہی راستوں پر چلا کہ بہر طور اس جھیل کو دریافت کرنا ہے

کہ ہے بھی یا نہیں.. محض تصور تو نہیں.. اور میں نے اسے تلاش کر لیا.. اس بار بھی اس تک نہ پہنچ سکا.. خواہش اور کوشش کے باوجود نہ جا سکا.. تو کیا کچھ جھیلوں کو ان دیکھا رہنا چاہیے تاکہ آئندہ زندگی میں ایک خواب تو ہو.. اور کیا کچھ شہروں کو بھی ان دیکھا رہنا چاہیے کہ کوئی خلش تو ہو..

سفارت خانے کے اعجاز صاحب نے بھی کچھ تگ و دو کی کہ وہاں پیٹرز برگ میں ایک نہایت وضع دار پاکستانی طالب علم ہے اور حسب روایت ایک روسی بیوی رکھتا ہے اور وہ فارغ اوقات میں ٹیکسی چلا کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتا ہے.. وہ آپ کو سٹیشن پر لینے آ جائے گا.. مناسب قیام کا بندوبست کر دے گا اور شہر دکھا دے گا لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا..

آپ یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ حضور والا.. اگر آپ کے پاس ڈالروں اور وقت کی افراط تھی تو خود سے وہاں کیوں نہ چلے گئے.. اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ روس نے سرمایہ دارانہ نظام سے منگنی تو کر لی تھی مگر ابھی تک بیاہ نہیں ہوا تھا.. اس نظام کے تحت جو سہولتیں میسر ہوتی ہیں سیاحوں کی آسانی کے لیے جو کاروباری تنظیم ہوتی ہے وہ ابھی تک مفقود تھی.. اگر ایسا ہوتا تو میں نہایت سہولت سے ماسکو کے کسی ایک سٹیشن پر پہنچتا کہ وہاں متعدد ریلوے سٹیشن تھے جہاں سے ایسی منزلوں کے لیے گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں جو کیا ہی خوابناک اور دور دراز کی دنیاؤں کی منزلیں تھیں.. تاتارستان جانے کے لیے ایک الگ سٹیشن تھا.. جھیل بیکال کی جانب منگولیا کی جانب روانہ ہونے کے لیے فلاں سٹیشن.. اور ماسکو سے ولاڈی واسٹک تک کا دنیا کا طویل ترین ٹرین کا سفر.. سائبیریا کے برفانی قصبوں تک بھی گاڑیاں یہیں سے چلتی تھیں اور ان سب میں سے قریب ترین منزل پیٹرز برگ تھی.. تو میں میمونہ کے ہمراہ وہاں پہنچتا اور ٹرین پر سوار ہو کر چار پانچ گھنٹوں میں پیٹرز برگ پہنچ جاتا.. سٹیشن پر اتر کر ٹورسٹ بیورو کا رخ کرتا.. میں اتنے ڈالر تک کا ہوٹل چاہتا ہوں.. پیٹرز برگ میں اتنے دن گزاروں گا اور اس دوران فلاں فلاں مقامات پر جانا چاہوں گا.. اور یہ سب بندوبست پل بھر میں ہو جاتے..

لیکن روسیوں نے ابھی سیاحتی سہولتوں کا ایسا انتظام قائم نہیں کیا تھا.. میرے پاس وقت بھی وافر تھا اور ڈالر بھی.. لیکن میں اس عمر میں پیٹرز برگ پہنچ کر خوار نہیں ہونا چاہتا تھا کہ سٹیشن پر اتر کر اب جانا کدھر اور کیسے ہے.. ہوٹل تلاش کیسے کریں.. ہرمے تاژ جائیں تو کیسے جائیں اور پھر ماسکو کیسے لوٹ آئیں..

چنانچہ میری زندگی میں ایک خواب ہے..

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

سینٹ پیٹرز برگ کے آئینے میں پھول کھلا رہا اور میں اسے ہاتھ نہ لگا سکا..

چھبیسواں باب

"تھیٹر کی ایک شام دوستووسکی کے نام"

وہ جو بہت خود پرست.. اور بجا طور پر خود پرست کسی حد تک میرے دوست منیر نیازی نے کہا تھا کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں..

تو گویا میرے لیے ہی تو کہا تھا کہ میں خود سے تو دیر نہیں کرتا تھا' ہو جاتی تھی..

لوگ سکول کالج کے زمانوں میں رواں ہو جاتے ہیں اور میں نے تیس برس کی عمر میں جا کر باقاعدہ لکھنا شروع کیا..

گورنمنٹ کالج کی "کشن گنگا ہم" کے بعد جب شمال کی کوہ نوردی کی دیوانگی نے اپنی گرفت میں لیا تو میں پینتالیس برس کا ہو چکا تھا..

محبت بھی کی.. بلکہ ہوئی تو وہ بھی دیر سے ہوئی..

منہ ول کعبے شریف کیا تو بڑھاپے کی چوکھٹ پر تھا..

اور تھیٹر کے ساتھ شدید رغبت ہوئی تو وہ بھی بہت دیر سے ہوئی..

بے شک میں نے انگلستان میں قیام کے دوران شیکسپیئر کے متعدد ڈرامے سٹیج پر دیکھے.. "ورلڈ آف سوزی وانگ" سے لطف اندوز ہوا لیکن تھیٹر میری پہلی محبت نہ ہو سکا.. میں ٹیلی ویژن کے کیمروں کا پروردہ تھا' تھیٹر کی گمنامی مجھے بلا نہ سکی..

اور جب اس نے بلایا تو بہت دیر ہو چکی تھی..

نیویارک کے براڈوے میں جب میں مشہور زمانہ "فینٹم آف دی آپرا" دیکھ رہا تھا تو بہت دیر ہو چکی تھی..

اور اب ماسکو میں تھا جو تھیٹروں کا شہر تھا تو اس دیر کا کچھ مداوا کرنا چاہتا تھا..

میں عرض کر چکا ہوں کہ پچاس برس پیشتر میں نے بالشوی تھیٹر کی سٹیج پر فرشتوں کی نزاکت ایسی' روحوں کی مانند فضا میں تحلیل ہوتی' پھر نمودار ہوتی بیلی رینا گالینا اولانووا کو "سوان لیک" اور "رومیو اینڈ جولیٹ" میں رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا.. تو جب میں نے کسی روسی سے پوچھا کہ کیا گالینا اب بھی حیات ہیں تو اس نے مجھے پرتقدس نظروں سے دیکھا کہ اس شخص نے گالینا اولانووا کو سٹیج پر رقص کرتے ہوئے دیکھا ہے اور پھر اطلاع کی کہ وہ تو کب کی رخصت ہو چکیں اب تو ان کے نام کا ایک میوزیم قائم کر دیا گیا ہے.. آپ وہاں ان کے ملبوسات' تصاویر اور ذاتی استعمال کی اشیاء نمائش پر دیکھ سکتے ہیں..

میں نے ماسکو پہنچتے ہی اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ میں یہاں تھیٹر دیکھنا چاہتا ہوں اور ممکن ہو تو پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے بالشوئی میں کوئی بھی پرفارمنس چاہتا ہوں.. اس پر مطلع کیا گیا کہ بالشوئی تھیٹر تو مرمت اور تعمیر نو کے سلسلے میں ان دنوں بند ہے اور اگر کھلا ہوتا تو بھی کسی روسی خلائی شٹل پر سوار ہونا بالشوئی تھیٹر کے ٹکٹوں کے حصول سے کہیں زیادہ آسان ہے..

اس پر میں نے کہا کہ پلیز کوئی بھی تھیٹر..

تو آنیا حسب عادت فوری طور پر متحرک ہو گئی..

یہ آنیا نہ ہوتی تو ہم ماسکو میں یتیم ہو جاتے..

"مستنصر.." اس نے پہلی رپورٹ پیش کی "یہاں چیخوف کے نامور تھیٹر میں گوگول کا ڈرامہ "مردہ روحیں" پیش کیا جا رہا ہے' کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے..؟"

"عام طور پر میں مردہ روحیں دیکھنا پسند نہیں کرتا لیکن اگر وہ گوگول کی ہیں تو ضرور پسند کروں گا.."

آنیا نے دوسری رپورٹ پیش کی.. "مستنصر.. آئی ایم سوری.. مردہ روحوں کے تمام ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں تو پھر کیا کریں.."

"پھر کوئی بھی تھیٹر.. چاہے یہ سٹریٹ تھیٹر ہی کیوں نہ ہو.."

اگلے روز ایک تھکی ہوئی آنیا نے تیسری رپورٹ پیش کی.. "یہاں ماسکو میں ایک تھیٹر سٹریٹ ہے تو وہاں ایک تھیٹر ہے جو زیادہ معروف نہیں تو وہاں کے ٹکٹ مل سکتے ہیں' حاصل کر لوں..؟"

"وہاں کیا دکھایا جا رہا ہے..؟"

"دوستووسکی کے ناول "بردرز کرمازوو" کی ڈرامائی تشکیل.. اور اس میں کچھ اداکار بہت کمال کے ہیں.."

اب ایک اندھے کو اور کیا چاہیے.. بے شک ایک غیر معروف تھیٹر ہو لیکن اس کے سٹیج پر اگر دوستووسکی کے کردار زندہ ہو رہے ہیں تو ایک اندھے کو اور کیا چاہیے..

"تو میں ٹکٹ خرید لوں..؟"

"فوراً.. اور تم ساتھ چلو گی ناں.. کیونکہ تھیٹر روسی میں ہوگا تو اس کا اردو ترجمہ کر کے ہمیں کون سنائے گا.."

"نہیں میں نہیں جا سکتی.. ساشا میری بڑی بہن.. جو آپ کو سرخ چوک کی رات میں چھوٹنے والی آتش بازی دکھانے کے لیے لے گئی تھی.. وہ آپ کو لے جائے گی.."

اب ساشا ماشاءاللہ نمودار ہوتی ہے تو ایک عجیب سے نسواری رنگ کے پاجامہ سوٹ میں نمودار ہوتی ہے.. ذخاروف کی پروڈکشن میں کچھ شک نہ تھا..

اس تھیٹر سٹریٹ میں پیدل چلتے ہوئے ہم ایک مقام پر سانس لینے کے لیے رکے.. یہ ایک مختصر سا باغیچہ تھا جہاں ایک بلند چبوترے پر کرسی پر براجمان ایک صاحب ہاتھ پھیلائے لگتا تھا کہ کچھ ہدایات وغیرہ دے رہے ہیں..

یہ صاحب چائے کووسکی تھے.. خود نہ تھے ان کا مجسمہ تھا.. روس کے سب سے عظیم کلاسیکی موسیقار..

ہم سانس لینے کے لیے رکے تو مونا چائے کووسکی کے مجسمے کے عین نیچے ایک بنچ پر بیٹھ گئی.. میں نے ان دونوں کی ایک تصویر اتار لی..

"کیوں بے وجہ تصویریں اتار رہے ہو..؟"

"بیگم تمہارے سر کے عین اوپر چائے کووسکی معلق ہے.."

"اچھا.." اس نے اوپر نظر کی اور پھر کہنے لگی.. "اچھا تو یہ چائے کووسکی ہے.. یہ کرتا کیا تھا..؟"

آج تو مونا بھی اچھی بھلی لگ رہی تھی.. اس نے ایک سیاہ سوٹ کے ساتھ سرخ رنگ کا دوپٹہ گلے میں لٹکا رکھا تھا اور عینی کی امریکی جیکٹ پہن رکھی تھی.. اسے اگر ذرا فاصلے سے دیکھا جاتا

تو اس پر عاشق ہوا جا سکتا تھا..

اور یہ تھیٹر جہاں "بردرز کرمازوو" کھیلا جا رہا تھا.. ایک قدیم سرخ رنگ کی عمارت کے اندر تھا اور باہر فٹ پاتھ پر ذرا ماحول تخلیق کرنے کی خاطر ایک پرانی بگھی کھڑی تھی اور اس میں جتے بھورے اور پلے ہوئے گھوڑے کبھی کبھی نتھنے پھلا کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے تھے..

سڑک کے پار ایک بینڈ کوئی خاص روسی دھن بجا رہا تھا..

اس تھیٹر کا نام "ماسکوسکی اکیڈمی تھیٹر" تھا..

مغرب کی ثقافتی روایت کے مطابق اگر آپ آپرا یا تھیٹر دیکھنے کے لیے جا رہے ہیں تو کلاسیک کے احترام میں اپنے بہترین لباس میں جائیں گے.. عمدہ اخلاقیات کا مظاہرہ کریں گے.. اپنی چال ڈھال میں بھی پروقار ہونے کی کوشش کریں گے.. کیونکہ یہ رویہ تھیٹر دیکھنے کے آداب میں شامل ہے.. کسی شخص کے لیے اس سے بڑی اور کوئی توصیف نہ ہوگی کہ یہ شخص تھیٹر اور آپرا کا ذوق رکھتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے آداب سے بھی خوب واقف ہے..

ماسکوسکی اکیڈمی تھیٹر اگرچہ ایک قدیم وضع کا درمیانے درجے کا تھیٹر تھا.. اس کی نشستوں کی پوشش تبدیلی کے لیے فریاد کر رہی تھی اور راہداریوں کے قالین اپنی طبعی عمر پوری کر چکے تھے اور اس کا شمار شہر کے اہم تھیٹروں میں نہ ہوتا تھا اس کے باوجود جو تماشائی ہال کے اندر داخل ہو رہے تھے وہ تمام تر آداب کو ملحوظ خاطر رکھ رہے تھے.. تعارفی کتابچوں کا نہایت مدبرانہ انداز میں مطالعہ کر رہے تھے اور اپنے خوش وضع بہترین لباسوں میں تھے.. کچھ لوگوں نے مونا کے پاکستانی لباس کو بہ نظر تحسین دیکھا..

روشنیاں گل ہوئیں تو وہ جو ہلکی سی کھسر پھسر ہو رہی تھی سناٹے میں بدل گئی.. جیسے کسی مقدس عبادت کا آغاز ہوا چاہتا ہو..

"بردرز کرمازوو" کو ایک کھیل کی صورت دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اس ناول کو پڑھے ہوئے مجھے بہت عرصہ ہو گیا ہے.. اگرچہ یہ میرے چند پسندیدہ ترین ناولوں میں سے تھا لیکن میں بہت کچھ بھول چکا تھا.. اور میں سوائے اس کے مرکزی کردار کرمازوو اس کی دل کش محبوبہ اور اس کے دو بیٹوں کے سوا کسی اور کردار کی شناخت کرنے میں ناکام رہا.. البتہ میمونہ نے ایک دو اور کرداروں کی نشاندہی کر دی حالانکہ اسے بھی یہ ناول پڑھے ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی.. اس کا حافظہ مجھ سے کہیں روشن تھا..

اگرچہ سٹیج کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ کھیل ناول سے قدرے مختلف تھا لیکن اس کا مجموعی تاثر نہایت بھرپور اور ڈرامائی تھا.. کردار روسی زبان بول رہے تھے مگر اس کے باوجود ہم کسی حد تک ان کی ذہنی کیفیت' جذباتی کشمکش' محبت کی شدت اور نفرت کے اظہار سے آگاہ ہو جاتے تھے.. اس کے سوا اداکار چہرے کی جو زبان بولتے تھے وہ ہم بخوبی جان لیتے تھے..

کرمازوو بھائیوں میں سے ایک جو ایک ڈھیلے کوٹ میں ملبوس تھا' مکالمے ادا کرتا ہوا سٹیج پر سے اترا اور تماشائیوں کے درمیان میں چلتا نہایت پرجوش انداز میں اداکاری کرتا عین میرے برابر میں آ کھڑا ہوا.. جیسے مجھ سے مخاطب ہونا چاہتا ہو.. وہ ایک بلند قامت شخص تھا اور اس کے دونوں ہاتھ جیسے اپنی ایک الگ شخصیت رکھتے ہوں کیونکہ وہ بھی اداکاری کر رہے تھے.. اس کے چہرے پر جو تاثرات جنم لیتے تھے وہ بھی بولتے تھے.. اس کے مکالموں میں جو تسلسل اور روانی تھی وہ اس کے ایک بڑے اداکار ہونے کی نشاندہی کرتی تھی..

کرمازوو ایک مختصر گٹھے ہوئے قد کا عیاش طبع اور رنگین مزاج بوڑھا ہے.. اور جب وہ اپنی سنہری بالوں والی محبوبہ سے ملاقات کرنے ایک شراب خانے میں جاتا ہے تو وہاں خانہ بدوش موسیقاروں اور رقاصاؤں کے ہمراہ ناچتا ان پر نوٹ نچھاور کرتا ہے اور ایک بوڑھی اور فربہ جپسی اس کی بلائیں لیتی ہے تو معاً مجھے ناول کا یہ حصہ یاد آ گیا.. میں نے مونا کو اطلاع کرنے کے لیے اس کے کان میں سرگوشی کی' نہایت ہی مدھم آواز میں تو تماشائیوں نے فوراً مڑ کر دیکھا کہ یہ کون بدذوق ہے جو تھیٹر میں پرفارمنس کے دوران باتیں کر رہا ہے.. اس سرزنش کے بعد میں نے سانس بھی آہستہ لینا شروع کر دیا کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی شیشہ گری کا..

کھیل کے دوران تو ہو کا عالم طاری رہا اور جب اس کا اختتام ہوا' پردہ گرا تب تماشائی زندہ ہو گئے اور تالیوں کی صورت میں بے تحاشا داد دینے لگے.. حسب روایت کچھ دیر بعد پردہ اٹھا اور ڈرامے کے کردار باری باری سٹیج پر آ کر جھک جھک کر ان کا شکریہ ادا کرنے لگے اور تالیوں کی گونج میں اضافہ ہوتا چلا گیا.. اور آخر میں ڈرامے کی پوری کاسٹ سٹیج پر آ گئی اور تماشائیوں کی پُرشور داد کی گونج میں جھک گئی.. ڈرامے کے بنیادی کرداروں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے کسی نہ کسی منظر میں یہ ثابت نہ کر دیا ہو کہ وہی اس کھیل کا سب سے جاندار اداکار ہے.. ان میں سے بوڑھا کرمازوو اپنے مختصر اور ناٹے بدن کے باوجود کھیل پر چھایا رہا اور اس کی سنہری بالوں والی محبوبہ کا بے باک چہرہ لوگوں کو مسحور کرتا رہا..

میں نے کھیل شروع ہونے سے پیشتر یہ نوٹ کیا تھا کہ تھیٹر میں داخل ہونے والے چند تماشائیوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے ہیں اور میں اس کا جواز جاننے سے قاصر رہا.. اب جا کر کھلا کہ یہ پھول تو ڈرامے کے اختتام پر اپنے پسندیدہ اداکار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لائے گئے تھے.. کوئی ایک تماشائی سٹیج پر چڑھتا' تالیوں کے شور میں اپنے من پسند اداکار کی جانب چلتا ہوا جاتا اور اسے پھولوں کا نذرانہ پیش کر دیتا.. ان تماشائیوں میں سے بیشتر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھے جنہوں نے ظاہر ہے اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر یہ مہنگے پھول خریدے تھے اور یہ اس امر کی غمازی کرتے تھے کہ روس کی نوجوان نسل میں اب بھی عمدہ ذوق جمال کے جراثیم موجود ہیں.

مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی..

اگر مجھے اس رواج کا علم ہوتا تو میں بہرصورت ایک گلدستہ ساتھ لے کر آتا اور سٹیج پر جا کر اس اداکار کو پیش کرتا جس نے میرے نزدیک کھڑے ہو کر مکالمے ادا کیے تھے اور اعلان کرتا کہ یہ پھول آپ کے لیے پاکستان کی جانب سے ہیں.. اسے بھی کتنی بے پناہ مسرت ہوتی کہ میرے فن کی داد پاکستان سے آئی ہے.. ایک ایسا ملک جسے دہشت گردی کے حوالے سے جانا جاتا ہے تو وہ ملک ایسا نہیں ہو سکتا جس کے باشندے دوستوئیفسکی کے ناول "برادرز کرمازوو" کے شیدائی ہیں اور اس کے کرداروں کو خراج عقیدت کے طور پر پھول پیش کرتے ہیں..

میں نے یہ موقع گنوا دیا..

ویسے کیا یہ حقیقت باعث تحیر نہیں کہ آپ بہت کچھ فراموش کر دیتے ہیں لیکن زندگی میں آپ نے تھیٹر کی سٹیج پر جتنے کھیل دیکھے ہوتے ہیں انہیں مکمل طور پر کبھی نہیں بھولتے.. مثلاً مجھے انگلستان کا وہ شہر یاد نہیں' میرے ہمراہ کون تھا یہ بھی حافظے سے محو ہو چکا ہے لیکن ایک تھیٹر کی سٹیج پر شیکسپیئر کے ڈرامے "میکبتھ" کی جو چڑیلیں تھیں ان کی شکلیں اور مکالمے اب تک یاد ہیں کہ..

یہ کیا ہیں کہ جن کی شکلیں وحشی اور شکنوں سے بھرپور ہیں.. وہ اس زمین کی مخلوق نہیں لگتیں پھر بھی اس زمین پر ہیں.. پچاس برس گزرنے کے باوجود بالشوئی کی سٹیج پر گالینا اولانووا ایک راج ہنس کی مانند تیر رہی ہے.. اگرچہ یہ صرف ڈیڑھ دو برس پیشتر کا قصہ ہے' نیویارک کے شب و روز مدھم پڑتے جاتے ہیں لیکن براڈوے پر کھیلا جانے والا "فینٹم آف دی آپرا" اب بھی اپنی ناکام محبت کے دکھ بھرے گیت گا رہا ہے..

یوں تو سفرِ حیات کا بے حد طویل تھا لیکن اس کا اختتام قریب آتا جا رہا ہے.. لیکن جتنے بھی دن باقی ہیں ان میں ماسکو کے دن اور راتیں بھولتے جائیں گے لیکن ''بروڈز کرمازوو'' کے سٹیج پر ایک بوڑھا اور عیاش شخص خانہ بدوشوں کے ہمراہ والہانہ رقص کرتا رہے گا اور اپنی محبوبہ کی جانب الفت آمیز نظروں سے دیکھتا رہے گا..

ستائیسواں باب

''آئرینا اور ''صدائے روس'' کے لیے ایک انٹرویو''

ایک ٹھہراؤ کی کیفیت ہماری روحوں میں قیام پذیر ہو گئی تھی.. یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہم دونوں سدا سے یہیں مقیم ہیں.. یہیں روس میں کہیں.. جھیل بیکال کے کنارے یا تاتارستان وغیرہ میں پیدا ہوئے تھے اور پھر اس آئرس کا گرس ہوٹل کی پریذیڈنشل سویٹ میں شفٹ کر گئے تھے..

آس پاس جو اجنبی زبان تھی وہ شناسا سا ہونے لگی تھی..

پوشکن کے مجسمے کے قریب اتر کر ہم یہ جانتے تھے کہ سرخ چوک کو کون سے راستے جاتے ہیں اور اس کے مجسمے کے قدموں میں زرد رنگ کے یہ پھول کتنے دنوں سے یہاں پڑے ہیں..

یہاں تک کہ ترستوایا سٹریٹ کے عالی شان سٹوروں کی شیشے کی دیواروں کے پیچھے جو ملبوسات نمائش پر تھے ہم یہ جانتے تھے کہ ان میں سے کس لباس پر کتنے پھول اور دھاریاں ہیں اور کس پتلون کی زپ ابھی تک کھلی ہوئی ہے..

گویا خانہ بدوشوں کے خیموں تلے گھاس اگنے لگی تھی اور انہیں کوچ کر جانا چاہیے تھا.. پر وہ نہ کرتے تھے کہ یہ خانہ بدوش اب سہولتوں اور آسائشوں کی افیون میں اونگھنے لگے تھے اور ان کے لیے کوچ کرنا دشوار ہو گیا تھا..

اب ہم ہر سویرے کے ناشتے سے بھی خوف کھاتے تھے.. کہ آج پھر وہی کچھ کھائیں گے جو پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے روزانہ کھا رہے ہیں.. وہی ابلے ہوئے انڈے.. ملیدہ سا پھیکا آملیٹ.. سلاد.. وہی کا وہی ذائقہ اور کافی کی وہی تلخی اور مجال ہے اس دوران آپ نے کسی اور مسافر سے بات بھی کی ہو.. سب لوگ الگ الگ اپنے اپنے سناٹے میں گم ناشتہ کرتے ہوئے.. ایک سویرے جب میں

نے اپنی کافی کا آخری گھونٹ بھرا تو بہت دیر سے ذرا فاصلے پر بیٹھی ایک بہت سیاہ بالوں والی ذرا صحت مند اور خوش شکل خاتون ایک گلابی بلاؤز میں کھلی ہوئی خاتون ہماری میز کی جانب مسکراتی ہوئی چلی آئی اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا ''میرا نام آئرینا مسکیم انکو ہے اور آپ نے مجھے باتیں کرنے کے لیے کچھ وقت دیا تھا.''

''میں نے..؟''

''جی..آپ نے..میں ''صدائے روس'' ریڈیو سے ہوں..''

مجھے یاد آ گیا کہ یہ کون سی آئرینا ہیں..وہ پچھلے چند روز سے مجھے مسلسل فون کر رہی تھیں اور اردو میں کر رہی تھی کہ میں اپنے پروگرام کے لیے آپ کا انٹرویو ریکارڈ کرنا چاہتی ہوں..تو کچھ وقت عنایت کر دیجیے..

یورپ اور امریکہ میں ان دنوں نہایت اعلیٰ پائے کے اردو ادیب پائے جاتے ہیں بلکہ شاعر پائے جاتے ہیں..ان میں ایک قلیل تعداد ایسے شاعروں کی ہے جو واقعی بڑی شاعری کے نقیب ہیں..وہ اگر پاکستان میں ہوتے تو زیادہ معتبر اور نامور ہوتے مگر اب اپنے آس پاس بارش کے بعد جنگلی کھمبوں کی طرح بے تحاشا اگنے والے جو ''شاعر'' ہیں ان کی بھیڑ میں کھو گئے ہیں..ان میں سے بیشتر کو جب مالی آسودگی حاصل ہوئی تو انہیں یاد آیا کہ وہ تو شاعری کر سکتے ہیں اگر نہیں کر سکتے تو پاکستان سے کچھ شاعر امپورٹ کر کے ان سے کروا سکتے ہیں..اور جب بھی پاکستان جانا ہو تو وہ شاعر احسان نافراموشی کے مرتکب نہیں ہوتے..ان کے اعزاز میں مشاعرے اور تقریبات برپا کرواتے ہیں یہاں تک کہ اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں میں ان کے انٹرویوز کا بندوبست کرتے ہیں..ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کی نموداری کے لیے تگ و دو کرتے ہیں..اور میں ان کو قطعی طور پر مورد الزام نہیں ٹھہراتا کہ اگر ان کی جگہ مجھے موقع ملتا تو میں بھی اسے ہاتھ سے نہ جانے دیتا..میری طرح وہ جو ذہنی اور مالی ناآسودگی کے موسموں میں سانس لیتے ہیں..اگر انہیں امریکہ کی کھلی اور آزاد فضاؤں سے مفت کا سندیسہ آ جائے..انہیں کھلایا پلایا جائے..ایک ذاتی سوئمنگ پول میں نہلایا جائے اور ان کی خالی جیبوں میں کچھ ڈالر بھی ڈال دیے جائیں تو تیسری دنیا کا ایک باشندہ اس کے عوض میں اگر کچھ اشعار نذر کر دے' پاکستان میں ان کی مدارات کر دے تو آپ اُسے کیسے مورد الزام ٹھہرائیں گے..چنانچہ موسم گرما میں امریکہ اور انگلستان کے خطوں میں کسی بھی کونے کھدرے سے ایک پاکستانی شاعر برآمد ہو کر آداب عرض کر سکتا ہے..البتہ روس ابھی تک ان کی

یلغار سے بچا ہوا ہے صرف اس لیے کہ وہاں ابھی تک دردمند اور ادب نواز پاکستانی بہ کثرت نہیں پائے جاتے..چنانچہ اگر کوئی مجھ ایسا ادیب بھی ادھر آ نکلے تو اردو دان طبقے میں دھوم مچ جاتی ہے..تو یہ ادب میں میرا مقام نہ تھا جس کی وجہ سے ''صدائے روس'' کی یہ خاتون پچھلے کچھ روز سے میرا پیچھا کر رہی تھی بلکہ محض ماسکو میں میری موجودگی تھی..جب تجھ بن اور کوئی نہیں موجود..

آئرینا کے سیاہ بالوں کی گھٹائیں ذرا امڈی پڑتی تھیں اور ان کے ماتھے پر یوں گرتی تھیں کہ ان کی ایک آنکھ بھی ان میں اوجھل ہو جاتی تھی اور صرف دوسری آنکھ نظر کے سامنے آتی تھی اگرچہ وہ بار بار ان سیاہ لٹوں کو ماتھے پر سے ہٹاتی تھیں اور وہ بار بار ایک سیاہ آبشار کی مانند گر کر ان کی ایک آنکھ پوشیدہ کر دیتی تھیں..

ہم اپنے کمرے بلکہ سویٹ میں چلے آئے اور ان کے ہمراہ ان کے تنومند' خوش شکل کا روسی معیار رکھنے والے خاموش طبع شوہر بھی چلے آئے اور انٹرویو کے دوران نہایت تحمل سے بیٹھے اپنی بیگم کی وہ باتیں سنتے رہے جو ان کے پلے نہ پڑتی تھیں کہ وہ اردو میں تھیں..وہ انگریزی سے بھی ناواقف تھے اور میرا قیاس ہے کہ وہ روسی سے تو واقف ہوں گے..

آئرینا کی اردو بہت نفیس اور بے جھجک تھی اور ان کے کچھ سوال ایسے تھے جن کی میں توقع نہ کر سکتا تھا..

میرا خیال تھا کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں..لیکن حیرت انگیز طور پر وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی تھیں' کیسے جانتی تھیں یہ میں نہ جان سکا..مجھے گمان ہے کہ لڈمیلا نے ان کے کان بھر دیے تھے..''صدائے روس'' کے لیے یہ انٹرویو صرف اس لیے یادگار تھا کہ میں اس دوران آئرینا کی شفاف اردو سے بے حد لطف اندوز ہوا..

''آپ دوبارہ ماسکو کب آئیں گے..؟'' انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے مجھے چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبہ تحفے کے طور پر عنایت کرتے ہوئے پوچھا..

''آئرینا..میں آج سے پچاس برس پیشتر آپ کے شہر آیا تھا اور اس کے بعد اب آیا ہوں تو اسی شیڈول کے مطابق آج سے پچاس برس بعد جب میں صرف ایک سو اٹھارہ برس کا ہو چکا ہوں گا' تو پھر آؤں گا..انشاء اللہ..اور مجھے امید ہے کہ آپ تب بھی میرا انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لیے آئیں گی اور اتنی ہی خوشگوار اور خوبصورت ہوں گی..''

اٹھائیسواں باب

"لُڈمیلا کے کبوتر خانے میں ایک شام"

ہم لڈمیلا کے کبوتر خانے جا رہے تھے..

پڑھنے والوں کو شائد یاد ہو کہ ماسکو یونیورسٹی کے لیکچر کے بعد لڈمیلا نے مجھ سے کہا تھا کہ مستنصر آپ نے میرے غریب خانے پر کب آنا ہے..

چونکہ میرا اپنا خانہ خاصا غریب ہے اس لئے میں اک اور غریب خانے میں جانے کا شائق نہیں ہوں..

میں مبالغہ نہیں کر رہی.. لڈمیلا نے ہنستے ہوئے کہا تھا.. واقعی یہ ایک غریب خانہ ہے بلکہ کبوتر خانہ ہے..

تو پھر آپ کبوتروں کو مدعو کیجیے..

آپ بھی تو ایک پرواز کرتے سیاح کبوتر ہیں آ جائیے.

جہاں لڈمیلا ایسی پیاری ہستی غٹرغوں غٹرغوں کر رہی ہو وہاں کون کافر ہے جو جانے سے انکار کرے..

اور وہ یہ دعوت ہر روز فون پر دوہراتیں..

لڈمیلا کی اُلفت بھری خصلت یہ تھی کہ جب وہ فون کرتیں تو اپنی تمام مصروفیات فراموش کر کے پہروں گپ لگاتیں اور آپ پہروں اُسے سنتے اور بور نہ ہوتے.. وہ مجھے اپنی نستعلیق اور شگفتہ لہجے والی اُردو سے تازہ دم کر دیتیں.. کہ اُن کی اُردو میں ایک عجیب دل پذیر خصوصیت تھی کہ کبھی اُس میں فارسی کی گھلاوٹ در آتی' کبھی عربی کی قدامت جھلکنے لگتی اور کبھی وہ غالب ہو جاتیں اور کبھی فیض.. میں سوچا کرتا کہ وہ آسانی سے شہرزاد ہو سکتی تھیں... اُن میں داستان

گوئی کا ایسا جوہر موجود تھا..

لڈمیلا کے ساتھ مکالموں میں.. کبھی آمنے سامنے اور اکثر فون پر میں نے عہد موجود کے رُوسیوں کے رویے کے بارے آگہی حاصل کرنے کی کوشش کی..

"آپ کی ذہنی اور تخلیقی پرورش سوویت یونین کے عہد میں ہوئی اور اب آپ ایک نئے رُوس میں سانس لیتی ہیں تو کس نظام کے تحت سکھ کا سانس آیا.."

"نہ تب آیا نہ اب آتا ہے" لڈمیلا کے لہجے میں شرارت تھی سنجیدگی نہ تھی..

میں نے پچاس برس پیشتر کا قصہ بیان کیا کہ کیسے انگلستان سے لائی ہوئی کیمرے کی فلمیں بے تحاشا تصویر کشی کے باعث ختم ہو گئیں تو میں ان کے حصول کی خاطر اپنی مترجم کے ہمراہ اُس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے سٹور "گم" میں جا پہنچا.. جہاں کوئی ایسا کاؤنٹر نہ تھا جہاں دس بیس لوگ کم از کم قطار لگائے نہ کھڑے ہوں.. جرابوں کے ایک جوڑے کے لیے یا ایک جوتا خریدنے کے لیے بھی طویل قطاریں تھیں.. ایک غیر ملکی مہمان کی حیثیت سے مجھے فلم کے حصول کے لیے جو قطار تھی اُس میں ذرا بہتر پوزیشن دے دی گئی اور میری باری جلدی آ گئی.. لیکن اس کاؤنٹر پر مجھے ایک باقاعدہ فلم نہیں بلکہ ٹن فائل میں لپٹی ہوئی فلمیں تھما دی گئیں.. دوسری قطار میں جا کھڑا ہوا تو بہت دیر بعد کاؤنٹر تک پہنچا تو وہاں مجھے متعدد خالی سپول یا چرخیاں عنایت کر دی گئیں.. ازاں بعد ایک اور قطار نے مجھے بالآخر ایک چھوٹے سے ڈارک رُوم میں پہنچا دیا جس میں بمشکل کھڑا ہوا جا سکتا تھا.. یہاں پر مجھے اندھیرے میں ٹن فائل میں سے کچی فلم نکال کر اُس سپول پر لپیٹنی تھی.. چونکہ مجھے اس نوعیت کا تجربہ نہ تھا اس لئے میں نے ایک رُوسی سے درخواست کی کہ وہ میری مدد کر دے.. وہ بہت مہربان تھا لیکن وہ بھی میرے لئے بمشکل دو فلمیں لپیٹ سکا کیونکہ ڈارک رُوم کے باہر منتظر لوگ بے چین ہو رہے تھے کہ جلدی سے باہر آؤ ہم نے بھی اپنی فلمیں لپیٹنی ہیں.. اُس شب ہوٹل کے کمرے کی روشنیاں گل کر کے کمبل کے اندر پوشیدہ ہو کر میں نے بقیہ فلمیں سپولوں پر چڑھائیں لیکن مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میں نے انہیں درست طریقے سے چڑھایا تھا یا نہیں چنانچہ بعد میں جتنی تصاویر بھی اُتاریں یہی دھڑکا لگا رہا کہ جانے میں نے فلموں کو چرخیوں میں درست طریقے سے پرویا تھا یا نہیں.. یا پھر فلموں کو روشنی نہ لگ گئی ہو.. یعنی کیمرے کی ایک فلم حاصل کرنے اور اُسے سینے پرونے میں پورا دن صرف ہو جاتا تھا..

لڈمیلا نے یوں سر ہلایا کہ تم مجھے بتاتے ہو کہ تب کتنی دشواریاں تھیں اور کتنی پابندیاں

ہوا کرتی تھیں۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جیسے ہمارے ہاں بھی ایک خاص عمر کے لوگ اُس ماضی کو بھی سینے سے لگائے آہیں بھرتے ہیں جس میں اُنھیں آج کے دَور کی سہولتیں اور معاشی فراغت حاصل نہ تھی.. وہ اپنے دھول بھرے میدانوں کو یاد کرتے ہیں اور وہی میدان جو اب سبزہ زاروں میں بدل چکے ہیں اُنھیں پسند نہیں کرتے. آج دنیا بھر کی نعمتوں سے لبریز کھانے کی میز کے سامنے اُن کی آنکھوں میں موتیا اتر آتا ہے جب کہ سوکھی روٹی اور اچار کو یاد کرتے ہوئے اُنھی آنکھوں میں موتی چمکنے لگتے ہیں.. اسی طور آج کے رُوس کے عمر رسیدہ لوگ بھی اُنھی زمانوں کو یاد کرتے ہیں. کمیونزم کا نظام اُن کے اندر رس بس چکا ہے.... مزدوروں کے وہ تہوار' سرخ سویرے دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ.. سرخ فوج کو سلام.. مزدوروں کا بین الاقوامی ترانہ انٹر ناشنل.. اور انقلابی نعرے اُن کے خون میں شامل ہو چکے ہیں.. اُن کے دل پر ابھی تک ہتھوڑا اور درانتی نقش ہیں اور یہ نقش مٹتے نہیں.. اُن کے سارے ستارے سرخ ہیں.. وہ مجبور ہو کر نئے نظام کے گُن تو گاتے ہیں لیکن اُن کے اندر سرخ گیت ہی گونجتے ہیں.. نئی نسل نے تو بخوشی اس نظام کو قبول کر لیا ہے کہ اس نے ہوش سنبھالا تو کمیونزم رخصت ہو چکا تھا لیکن یہ جو پرانے لوگ ہیں یہ اپنے ماضی کی قید میں ہیں' جب یہ رخصت ہو جائیں گے تب دراصل کمیونزم ماضی کی گپھا میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے گا..

کسی زمانے میں لاہور کے ریگل سینما میں پیٹر استینوف اور ایوان ڈی کارلو کی فلم ''ہوٹل سحارا'' نمائش پر لگی تھی.. کسی افریقی صحرا میں جنگ عظیم کے دوران ایک ہوٹل ہے اور دنیا جہان سے کٹا ہوا ایک پُر آسائش ہوٹل ہے.. ہوٹل کا ایک ویٹر چھت پر جا کر دُوربین لگائے یہ دیکھتا رہتا ہے کہ ہوٹل کی جانب بڑھنے والی سپاہ کا کس قومیت سے تعلق ہے.. چنانچہ جب جرمن دکھائی دیتے ہیں تو فوری طور پر لابی میں ہٹلر کی تصویر آویزاں کر دی جاتی ہے اور نازی پرچم لہرا دیا جاتا ہے.. انگریز نظر آتے ہیں تو چرچل کی پورٹریٹ اور یونین جیک.. امریکی آ جاتے ہیں تو روز ویلٹ کی تصویر لگا کر سٹارز اینڈ سٹرائپس لہرانے لگتا ہے.. یوں وہ ہوٹل برباد ہونے سے بچ جاتا ہے.. کہ بقاء کا راز ہی یہی ہے... جیسے ضیاء الحق کے دَورزیاں میں مجھے ایک کرنل صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا جو کھاتے کم تھے اور پیتے زیادہ تھے اور دیگر معاملات میں بھی از حد شوقین تھے.. مذہب کے ساتھ لگاؤ کا یہ حال تھا کہ اُن کی موجودگی میں اگر کوئی کلمہ پڑھتا تو فوراً ساتھ والے سے پوچھ

لیتے کہ.. یہ کلمہ ہی پڑھ رہا ہے ناں..... میں واش رُوم استعمال کرنے کے لیے اُن کی سٹڈی میں سے ہو گزرا تو وہاں شیلفوں پر سیرت النبیؐ اور قرآن پاک کی تفاسیر کی درجنوں ضخیم کتابیں سجی تھیں.. میں نے اس ماہیت قلب کا سبب پوچھا تو کہنے لگے.. تارڑ صاحب انوکری... میرے ہاں سینئر افسروں کا آنا جانا ہوتا ہے تو یہ کتابیں دیکھ کر وہ دین سے میری وابستگی کے قائل ہو کر میری پروموشن کر سکتے ہیں.. تارڑ صاحب ان دنوں بقاء کا یہی راز ہے..

تو کچھ اسی طور نئے رُوس میں بھی ماہیت قلب ہو رہی ہے... بک شیلفوں پر سے مارکس' اینگلز اور لینن کی ضخیم جلدیں رخصت ہو گئی ہیں اور اُن کی جگہ مغرب کا ادب اور امریکی ناول سج چکے ہیں..

لدمیلا بھی سرخ سویروں میں طلوع ہوئی تھیں.. اُن کے بہترین برس کمیونزم کے نظام کے تحت بسر ہوئے تھے... نہ وہ کھل کر اظہار کرتی تھیں اور نہ میں اُنھیں کریدتا تھا.. میں نہیں جانتا تھا کہ اندر کیا ہے اور ظاہر کیا ہے.. یہ جانتا تھا کہ اُن زمانوں میں لدمیلا ایسے سکالرز کی قدر کی جاتی تھی اُنھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا چاہے اُن کے لباس معمولی تھے یا اُن کے ہینڈ بیگ بوسیدہ تھے..

نئے نظام کے تحت تنخواہ دار لوگ بہت خسارے میں رہے ہیں' اُن کے نصیب میں عُسرت لکھی گئی ہے.. تنخواہیں جو اُن زمانوں میں جب قیمتوں پر سرکاری کنٹرول تھا مناسب تھیں لیکن اس مہنگائی کے سیلاب میں وہ چند روز میں بہہ جاتی ہیں اور تنخواہ دار یہ نہیں جانتا کہ وہ نہائے گا کیا اور نچوڑے گا کیا! جب میں نے لدمیلا کو پچاس برس پیشتر کا وہ قصہ سنایا جب کیمرے کی ایک فلم کے لیے اتنے کشٹ کاٹنے پڑتے تھے تو اُس نے مجھے ایک رائج الوقت نہایت پاپولر لطیفہ سنایا..

جارجیا کے لوگ' ماسکو کے باسیوں کی نسبت زیادہ شاطر' کاروباری اور چالاک ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں تو ایک جارجین ماسکو آیا تو اُس کے رُوسی دوست نے پوچھا کہ اے دوست تم مجھے بتاؤ کہ تم ماسکو میں کیا کیا کرنا چاہتے ہو.. کیا کرنا اور کیا دیکھنا چاہتے ہو تا کہ میں تمہاری مدد کر سکوں..

جارجین نے کہا.. میری صرف تین خواہشیں ہیں.. میں اپنی بیوی کے لیے سمور کا ایک کوٹ خریدنا چاہتا ہوں. بالشوئی تھیٹر میں بیلے رقص دیکھنا چاہتا ہوں اور کامریڈ لینن کے مقبرے میں اُن کی حنوط شدہ لاش کی زیارت کر کے اُنھیں سرخ سلام کرنا چاہتا ہوں..

اس پر رُوسی نے مایوسی سے سر ہلایا کہ اے دوست یہ تینوں خواہشیں تو پوری ہونے والی نہیں.. سمور کے صرف دو تین کوٹ روزانہ برائے فروخت ہوتے ہیں اور اُن کے حصول کے لیے خریداروں کی طویل قطاریں ہوتی ہیں.. بالشوئی تھیٹر کے ٹکٹوں کا بھی یہی حال ہے.. چند ٹکٹوں کے لیے ہزاروں افراد قطار میں کھڑے ہوتے ہیں اور رہا لینن کا مقبرہ تو اُس کی زیارت ناممکن ہے.. ان دنوں مقبرے کی مرمت ہو رہی ہے اور اُسے سرکاری طور پر بند کر دیا گیا ہے..

چند روز بعد وہ جارجین اپنے رُوسی دوست کو خدا حافظ کہنے کے لیے آیا کہ وہ جارجیا واپس جا رہا تھا..

''کیوں دوست تمہاری خواہشوں کا کیا ہوا؟'' رُوسی نے طنزیہ انداز میں پوچھا..

''سب کی سب پوری ہو گئی ہیں'' جارجین نے ایک پرسکون لہجے میں بتایا..

''وہ کیسے؟''

''جس سٹور میں صرف دو تین سمور کے کوٹ برائے فروخت تھے میں نے وہاں قطار میں کھڑے ہونے کے بجائے سیلز گرل کے کان میں جا کر کہا.. یہ لو سمور کے دو کوٹوں کی قیمت.. ان میں سے ایک تمہارے لیے اور ایک میرے لیے.. مجھے سمور کا کوٹ مل گیا..''

''بالشوئی کا ٹکٹ؟''

''وہاں بھی میں ہزاروں کی قطار سے چشم پوشی کرتا ٹکٹوں کی کھڑکی تک پہنچا.. ٹکٹ فروخت کرنے والے کو ذرا احتیاط سے کچھ رقم تھمائی کہ مجھے پانچ ٹکٹ درکار ہیں لیکن ان میں سے چار تمہارے ہوں گے اور ایک مجھے دے دینا.. یہ خواہش بھی پوری ہو گئی..''

رُوسی اپنے بال نوچ لینا چاہتا تھا لیکن اُس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن تم نے لینن کو کیسے دیکھ لیا..''

یہ سب سے آسان تھا.. میں نے واڈکا شراب کے دو کریٹ خریدے اور لینن کے مقبرے پر کام کرنے والے مزدوروں کی خدمت میں پیش کر دیئے کہ یہ ایک جارجین کامریڈ کی جانب سے تحفہ ہے.. آیئے مل کر جارجیا اور روس کی لازوال دوستی کے جام پیتے ہیں.. اگرچہ میں کامریڈ لینن کی لاش کے حضور سرخ سلام پیش کرنے کی خاطر اتنی دُور سے آیا تھا لیکن یہ مقبرہ سرکاری طور پر بند ہے تو چلیئے دوستی کے جام ہی پی لیں.. واڈکا کے دو کریٹ ختم کرنے کے بعد تمام مزدوروں نے بیک آواز مجھ سے کہا کہ کامریڈ یہ فرمایئے کہ کیا آپ بہ نفسِ نفیس مقبرے میں اُتر کر

کامریڈ لینن کی زیارت کرنا چاہیں گے یا ہم آپ کی سہولت کے لیے لینن کا تابوت اُٹھا کر یہاں آپ کے پاس لے آئیں..

کہا جاتا ہے کہ کامیابی کے سو باپ ہوتے ہیں اور ناکامی یتیم ہوتی ہے.. لیکن ناکامی کے سو لطیفے بھی ہوتے ہیں...

میں نے اُسی گم سٹور میں ایک اور قطار بھی دیکھی تھی جو خاصی طویل تھی تو میں نے اپنی مترجم سے دریافت کیا کہ یہ قطار کس شے کے حصول کے لیے ہے.. مچھلی کے ایک ٹین کے لیے یا جرابوں کے لیے.. تو اُس نے کہا تھا ''یہ قطار دوستووسکی کے لیے ہے.. اُس کے ناول ''کرائم اینڈ پنش منٹ'' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے اور یہ لوگ اُسے خریدنے کی خاطر صبح سے قطار میں کھڑے ہیں..''

میں کچھ متعجب ہوا تھا کہ یہ کیسے رُوسی ہیں جنہوں نے ابھی تک دوستووسکی کا یہ ناول نہیں پڑھا..

''نہیں نہیں..'' میری مترجم ہنسنے لگی ''یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی رُوسی چاہے وہ کتنا ہی کور ذوق کیوں نہ ہو اس ناول سے ناواقف ہو.. دراصل یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوسرے کلاسیکی ادیبوں کے علاوہ دوستووسکی کے کسی بھی ناول کا تازہ ایڈیشن خریدنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں.. یہ ایسے ہی لوگ ہیں..''

''لُڈمیلا.. کیا اب بھی ان زمانوں میں بھی کوئی ایسی قطار لگتی ہے''

اُس نے اپنی مسکراہٹ کے شرارے روشن کیے اور کچھ نہ کہا.

ماسکو میں قطاریں تو اب بھی لگتی ہیں لیکن میکڈانلڈ کے برگر اور فرنچ فرائز کے لیے....

تو آج ہم لُڈمیلا کے کبوتر خانے کو جا رہے تھے..

ماسکو میں ہمارے قیام کے دن دو چار ہی رہ گئے تھے.. ہم نے پیٹرز برگ کے سوا جو دیکھنا تھا دیکھ چکے تھے.. سوائے جنگل میں پوشیدہ ایک قبر کے.. اور اب ہم یہاں سے کوچ کر جانا چاہتے تھے.. اس بستی کی اجنبیت اب واقفیت میں بدل گئی تھی... شناسائی کی روشنی نے سب کچھ عیاں کر دیا تھا کچھ بھی پوشیدہ نہ رہا تھا جسے دیکھنے کی آرزو کرتے..

کسی سے عہد و پیماں کر نہ رہیو
تو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو

نظر پہ بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

تو ہم یہاں اکثر رہ چکے تھے اور منظر نظر پہ بار ہونے لگے تھے..

اور ایسی کیفیت میں 'غریب الوطنی کی اُداسی کم کرنے کے لیے کسی شناسا اور دوست ہستی کی شدت سے طلب ہوتی ہے. اور ماسکو میں وہ ہستی لُدمیلا ہی ہو سکتی تھی..

چنانچہ ہم لُدمیلا کے کبوتر خانے کو جاتے تھے..

اور ہم خود سے ہی تو نہیں جا رہے تھے ہمیں ظہیر الدین اپنی کار پر لے جا رہے تھے.. وہ ایک کھوئے کھوئے سے' قدرے بیزار' بہت کم مسکرانے والے اور بہت زیادہ سوچ میں مبتلا ظہیر الدین تھے. وہ صرف سوچ میں ہی ماسکو میں بھی گم ہو جاتے تھے' راستے بھول جاتے تھے' جانا کہیں ہوتا تھا اور نکل کہیں جاتے تھے.. لگتا تھا کہ موصوف ابھی دو چار روز پیشتر پہلی بار ماسکو آئے ہیں اس لئے سڑکوں پر گمشدہ ہوئے جاتے ہیں حالانکہ وہ ایک مدت سے یہاں مقیم تھے' رُوسی ہو چکے تھے.. اُنہوں نے انہی گلیوں میں اپنی جوانی بِتائی اور بال سفید کئے.. اُن کی کہانی اس شہر میں مستقل طور پر آباد دیگر پاکستانیوں سے مختلف نہ تھی' والد صاحب ایک معروف ٹریڈ یونین لیڈر تھے' کمیونزم سے متاثر تھے چنانچہ انہیں بھی ماسکو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سندیسہ مل گیا اور پھر... ایک رُوسی بیوی اور بچے.. اور خود اپنے پنجاب کو ہمہ وقت ترستے ہوئے.. اگرچہ بنیادی طور پر سوات کے پٹھان تھے لیکن اپنے آپ کو ثقافتی طور پر پنجابی قرار دیتے تھے.. اُن کے بھلکڑ پن کے باعث ہم نے ماسکو کی بہت سیر کر لی اور اُن سے بہت باتیں کر لیں.. اُن کی واحد چاہت پنجابی اور اس کا ادب تھا.. پڑھنے لکھنے کے بہت شیدائی تھے اور اسی لیے لُدمیلا سے دوستی تھی..

سفر کے دوران موجودہ نظام بھی زیرِ بحث آ گیا.

''ایک ایسا شخص جو اپنے پُرخلوص نظریات کے باعث اُن نظریات پر عمل پیرا ایک ملک سوویت یونین میں ٹھہر جاتا ہے کہ یہ نظام اُس کا آئیڈیل ہے.. عمر کا بیشتر حصہ.. وطن سے دُور صرف اس لئے گزار دیتا ہے کہ اُس کا ایک خواب ہے اور وہ اُس کی تکمیل کی خواہش میں جلاوطنی اختیار کر لیتا ہے. یہاں شادی کر لیتا ہے.. اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے اردگرد وہ نظام منہدم ہونے لگتا ہے جس کی چاہت میں اُس نے اپنا وطن چھوڑا تھا.. اور اُس کی جگہ ایک ایسا نظام رائج ہو جاتا ہے جو اُس کے نظریات کے بالکل برعکس ہے بلکہ جس کے ساتھ نفرت کرنا اُس کا ایمان ہوا کرتا تھا تو..

وہ کیا محسوس کرتا ہے..''

''بس ایک دُکھ ہے.. اور ہم جانتے تھے کہ ایسا ہو جاتا ہے.. سوویت یونین کے اندر جو معاشی زوال تھا جو بے چینی اور بے ترتیبی رُونما ہو رہی تھی اُس سے ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ کمیونسٹ نظام آخری سانسوں پر ہے چنانچہ ہمیں دُکھ تو ہوا لیکن صدمہ نہیں ہوا کہ ہم اس کی توقع کر رہے تھے..''

''کیا کمیونسٹ پارٹی مکمل طور پر منتشر ہو چکی ہے یا اس کے کچھ آثار باقی ہیں؟''

''اس نام کی اب تو کوئی پارٹی نہیں البتہ ایک نئی سیاسی پارٹی ایسی ہے جو تقریباً کمیونسٹ پارٹی ہے.. اس کے بیشتر راہنما کمیونسٹ ہیں اور آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ عوام میں بے حد مقبول ہے..''

''تو کیا یہ ممکن ہے کہ کل کلاں الیکشن میں یہ پارٹی جیت جائے اور کمیونسٹ نظام پھر سے واپس آ جائے..''

''نہیں.. یہ پارٹی کسی بھی صورت اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں دولت کی ریل پیل اور شریفانہ غنڈہ گردی کے ذریعے الیکشن جیتے جاتے ہیں.. اور یہ سب کچھ دوسری پارٹیوں کے پاس ہے.. اس طرح کمیونسٹ نظام کے واپس آنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا.. اگر یہ پارٹی الیکشن جیت لے تو بھی وہ ایک ایسے سوشلسٹ نظام کو رائج کرنے کی خواہش رکھتی ہے جو سکنڈے نیوین ممالک میں ایک عرصے سے قائم ہے..''

پتہ نہیں ظہیر الدین اپنی طبیعت میں کھوئے کھوئے تھے یا اس نئے نظام کے دھچکے نے انہیں قدرے کھویا کھویا سا کر دیا تھا..

ہم باتوں میں کھوئے رہے اور یہ احساس نہ ہوا کہ آس پاس کے مناظر بدل چکے ہیں' جیسے ماسکو کے جھگڑے نہ ہوں کوئی اور شہر ہو.. ایک دل پذیر پُرسکون اور آہستہ رو شہر.. کھلی فضائیں اور بلند درختوں کی ہریاول جھومتی ہوئی.. ایک پُرفضا ہرا بھرا ٹھہراؤ تھا.. عمارتیں کم تھیں اور سبزہ زیادہ.. لُدمیلا کا فلیٹ بھی ان عمارتوں میں سے کسی ایک عمارت کی چوتھی منزل میں پوشیدہ تھا.

ہم کار سے باہر آئے تو ہوا میں سرمائی ٹھنڈک کے شائبے تھے جو بدن پر اثر کرتے اچھے لگتے تھے.. لُدمیلا کے فلیٹ کے آس پاس جو گھنے اشجار کھڑے تھے اُن میں سے سفید روئی کے گالے موسم کی پہلی برف کی مانند اُترتے اور فضا میں ڈولتے پھرتے تھے.. ان میں شاید کہیں کہیں

سنبل کے درخت تھے جن کی روئی ہواؤں پر ہلکورے لیتی اُتر رہی تھی..

ظہیر الدین نے اُسی بیزار مہاندرے پر ایک مسکراہٹ پھیلا کر کہا "ماسکو میں ان موسموں میں روئی کے ان سفید گالوں کو فضا میں اُڑتے اور آہستگی سے ڈولتے جب بھی دیکھتا تھا تو مجھے آپ کا پنجابی ناول "پکھیرو" یاد آ جاتا تھا.. آپ نے گاؤں کی گرم دوپہروں میں آک کے پودوں میں سے نکلنے والی مائی بوڑھیوں کی جو منظر کشی کی ہے وہ یاد آ جاتی ہے"

ظہیر الدین نے یہ حوالہ انتہائی معتدل اور غیر جذباتی انداز میں دیا جس میں مجھے متاثر کرنے کی کوشش نہ تھی.. میری جگہ اُن کے برابر میں کوئی بھی شخص ہوتا تو وہ یہ حوالہ اسی طور دیتے..

لڈمیلا کا فلیٹ بے شک ایک کبوتر خانہ ہوگا لیکن کیسے ہرے بھرے اور ہریاول شانت ماحول میں تھا.. فلیٹ تک جانے والی سیڑھیاں نیم تاریک اور بوسیدہ تھیں..

ماسکو میں ہم جتنے بھی.. جن دو چار فلیٹوں میں داخل ہوئے تو یہ احساس ہوا کہ کسی آہنی سیف میں بند ہو گئے ہیں.. مثلاً ہم سفارت خانے کے اعجاز کے ہاں کھانے پر گئے تو پہلے عمارت کے اندر داخل ہونے والا آہنی دروازہ.. جو ایک خاص نمبر دبانے سے کھلتا ہے اور پھر آپ پر کھٹاک سے ایک درِ زنداں کی طرح بند ہو جاتا ہے.. پھر اُس منزل میں داخل ہونے والا دروازہ جس پر ہمارے میزبان کا فلیٹ ہے اور وہ بھی لوہے میں ڈھلا ہوا.. اور بالآخر مطلوبہ فلیٹ کا دروازہ.. اور اگر آپ سیڑھیوں کے بجائے لفٹ کے ذریعے اُوپر جاتے ہیں تو وہ لفٹ بھی ایک مختصر اور تنگ آہنی تابوت.. مونا کہتی 'میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے جب سوچتی ہوں کہ کتنے آہنی دروازے ہم پر بند ہو چکے ہیں اور ہم ایک قید میں ہیں.

اور یہ سارے حفاظتی بندوبست بھی نئے نظام کے ثمرات میں سے ہیں کہ ماسکو اب ایک محفوظ شہر نہیں ہے.. قانون کی نہیں پیسے کی حکمرانی ہے..

لڈمیلا کے ہاں صورت حال قدرے بہتر تھی.. صرف اُس کے فلیٹ کا دروازہ آہنی تھا لیکن اُس کے اندر جو کبوتر خانہ تھا وہ اتنا پُرسکون' نفاست کی مہک لئے' ذوقِ جمال سے آراستہ مقام تھا کہ بندے کا جی خواہ مخواہ کبوتر ہو جانے کو چاہتا تھا.. یہ وہ قفس تھا جس میں آرام بہت تھا..

لڈمیلا نے اس قفس کا دروازہ کھولا تو وہ ایک گلابی رنگت کے لباس میں تھی اور کاندھے پر ایک مشرقی سجاوٹ والی چادر کو خوشنما کر رہی تھی.. البتہ اُس نے اپنی اس سجاوٹ پر ایک ایپرن باندھ رکھا تھا کیونکہ وہ کچن میں ہمارے لئے پکوان تیار کرتی کرتی ہمارے استقبال کو آ گئی تھی.. اور

ہمیں دیکھ کر اُس کی من موہنی مسکراہٹ اور آنکھوں میں سے دوستی اور مسرت کے اتنے شرارے پھوٹے کہ مجھے خدشہ ہوا کہ دو چار شرارے اُس کے ایپرن پر بھی گرے ہوں گے اور اُس میں سے دھواں اُٹھا ہوگا.. ہمیں تو اُس نے نہایت پریم سے ایک کوزی کمرے میں آرام دہ نشستوں پر بٹھا دیا لیکن خود چین سے نہ بیٹھی' باورچی خانے میں آتی جاتی رہی.. آتی اور چند باتیں کر کے ذرا ناک سکیڑ کر سونگھتی کہ کہیں کوئی ہانڈی تو نہیں جل گئی اور پھر معذرت کر کے اپنے پکوان خانے میں گم ہو جاتی.. اس کوزی کمرے کے آگے ایک بالکونی تھی جو مجھے بلاتی تھی کہ اُس میں ہریاول کے گل بوٹے اُمڈے آتے تھے..

میلا کے گھر میں ایک غیر ملکی پرائی مہک نہ تھی اپنے گھر والی خوشبو تھی.. کہ وہاں ہر سُو برصغیر کے ثقافتی آثار تھے.. دستکاریوں کے نمونے اور مشرقی سجاوٹیں تھیں.. ایک مختصر سا کمرہ میلا کی سٹڈی.. اور اس میں داخل ہونے پر کتابیں آپ پر نچھاور ہونے کو آتی ہیں.. اُمڈتی چلی آتی ہیں کہ آپ سانس بھی آہستہ لیتے ہیں کہ کہیں کوئی ضخیم کتاب اپنے مقام سے کھسک کر آپ پر نازل ہو کر آپ کو جنت مقام نہ کر دے.. بیشتر کتابیں اُردو کی تھیں اور فیض صاحب کی تصویریں تھیں.. ان میں سے ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر میرے ذہن پر نقش ہے.. فیض صاحب کے پہلو میں ایک نوخیز لڈمیلا اور اس کی وہی شرربار مسکراہٹ.. جو آج بھی ہے.. میں نے نیویارک میں اپنے قدیمی کلاس فیلو ڈاکٹر خالد محمود بٹ کو پچاس برس بعد صرف اُس کی مسکراہٹ سے پہچان لیا تھا.. مسکراہٹ پر عمر اثر انداز نہیں ہوتی..

لڈمیلا کے شیلفوں پر کتابوں کے انبار میں چند کتابیں میری بھی تھیں جو دھول جمع کرتی تھیں اور ان میں میرا ناول "راکھ" بھی تھا جو اُس نے مجھے ذرا خجل ہو کر دکھایا "رہا" "کسی نہ کسی دن میں اسے مکمل طور پر پڑھوں گی.. یہ بہت ضخیم ہے.."

"میلا وہ دن کبھی نہیں آئے گا.. مجھے شک ہے کہ آپ اسے کبھی بھی پڑھ نہ پائیں گی.. آپ کی شریانوں میں شاعری کا سودا ہے.. نثر پڑھنے کے لیے بہت سا وقت' بہت سی برداشت اور توجہ درکار ہوتی ہے جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے.."

"نہیں نہیں ایسا نہیں.." مجھے فرصت نہیں مل رہی.. میں اسے شروع کرتی ہوں تو پہلے تین چار باب پڑھتے ہوئے ان میں کھو جاتی ہوں اور پھر یکدم کوئی مصروفیت مجھے دبوچ کر اس سے جدا کر دیتی ہے.."

میمونہ سے وہ لاہور میں ہمارے گھر میں مل چکی تھی اس لئے اُن کے درمیان اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہ تھا.. وہ اُسے بتا رہی تھی کہ.. میمونہ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ مجھے ہندوستان سے اور خاص طور پر پاکستان سے مسلسل ایک تواتر کے ساتھ بے شمار شعری مجموعے موصول ہوتے رہتے ہیں اور ہر شاعر.. مجھ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ میں فوری طور پر اپنے آپ کو اُس کی شاعری کو رُوسی میں ترجمہ کرنے کے لیے وقف کردوں گی اور میں ان شاعروں کے ناموں سے بھی آگاہ نہیں ہوتی.."

"بھئی آپ نے ایک گمنام شاعر فیض کو جو رُوس میں اتنا مشہور کر دیا ہے تو اُن بے چاروں کا کیا قصور ہے.."

"آپ کی حسِ مزاح کی میں داد دیتی ہوں.."

"آداب عرض.." میں نے میلا کی مانند لکھنوی آداب کا مظاہرہ کیا۔

"میں تو میمونہ سے محوِ گفتگو ہوں آپ کیوں دخل دیتے ہیں.. تو میمونہ یہ بتائیں کہ آپ کے ہاں اتنی ڈھیر ساری اور بیکار شاعری کیوں ہو رہی ہے.."

"آپ تو پھر لدمیلا ہیں شاعری کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں.. مستنصر کو بھی اتنے شعری مجموعے وصول ہوتے ہیں کہ ردی والا بھی تنگ آ گیا ہے.. اور اتنی ڈھیر ساری اور بیکار شاعری کیوں ہو رہی ہے.. تاکہ وہ اُس اچھی اور بڑی شاعری کو بھی اپنے بوجھ تلے دفن کر دے جو پاکستان میں یقیناً ہو رہی ہے"

"آپ ایک نثر نگار کی بیوی ہونا پسند کرتی ہیں.."

"نہیں.. پچھلے چھتیس برس میں جتنی راتیں تھیں اُن میں سے بیشتر انہوں نے میرے ساتھ نہیں اپنی لکھنے کی میز کے ساتھ گزاری ہیں تو... نہیں!"

میرا ایک ذاتی مشاہدہ ہے کہ کچھ لوگ... ادب کے ساتھ.. نثر یا شاعری کے ساتھ.. کسی ذاتی منفعت کے باعث نہیں محض دیوانگی کے باعث.. شدید طور پر جڑے ہوتے ہیں.. کسی ایک لکھنے والے کے ساتھ ایسے جڑ جاتے ہیں کہ وہ پوری حیات اُس کی تحریروں کے لیے وقف کر دیتے ہیں... اپنی زندگی اُن کے ساتھ بسر کر دیتے ہیں اور یوں وہ کچھ کچھ اُس تخلیق کار کی طرح ہو جاتے ہیں.. اُسی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں..

ٹالسٹائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے والے کسی حد تک اُس کی مانند کی زندگی

اختیار کرتے ویسے ہی بولنے اور چلنے لگتے ہیں.

شیکسپیئر کے مداح اُس کا لب ولہجہ اور اظہار اختیار کر لیتے ہیں.

بہت نچلی سطح پر جو لوگ ارنسٹ ہیمنگوے سے متاثر ہوتے ہیں وہ اُسی کے مشغلے' آوارہ گردی' شکار اور شراب کو اختیار کر لیتے ہیں..

تو اسی طور لدمیلا نے بھی فیض صاحب کو اختیار کر لیا تھا. اُن کے شعروں میں سانس لیتی اُن میں ڈھل کر کچھ فیض ہو گئی تھی..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے اور لدمیلا کے دوران کوئی اختلاف ہو تو نہیں سکتا تھا.. پر تھا.. میں "میرا داغستان" والے رسول حمزہ توف کا شدید مداح تھا اور وہ انہیں بوجوہ پسند نہیں کرتی تھیں.. اُن کا کہنا تھا کہ جب بھی رسول اور فیض صاحب ماسکو میں اکٹھے ہوتے تھے تو رسول اُن کو بے تحاشا شراب پلا دیتا تھا.. ایک مرتبہ جب لدمیلا کو کہیں سے خبر ملی کہ دونوں شاعر فلاں مقام پر شغل کر رہے ہیں تو وہ فوراً وہاں پہنچ گئی اور رسول کو خوب ڈانٹا اور اُن کے شراب کے ذخیرے کو اپنے قبضے میں لے لیا..

میرا کہنا یہ تھا کہ فیض صاحب اب اتنے بھولے بھی نہیں تھے کہ رسول کی باتوں میں آ کر مجبوراً شراب پینے لگتے اور لدمیلا کو اصرار تھا کہ نہیں یہ سب رسول حمزہ توف کا قصور ہوا کرتا تھا..

باورچی خانے کے پھیروں کے دوران لدمیلا نے ہمیں بتایا کہ ہمارے علاوہ اُس نے ایک اور جوڑے کو مدعو کر رکھا ہے.. ایک اور لدمیلا لیکن یہ والی ڈاکٹر لدمیلا وی خورخ لووا تھیں جو پنجابی زبان کی سکالر تھیں..

"ان لدمیلا کی پنجابی کیسی ہے؟"

"اُن کی اُردو تو اچھی ہے لیکن میں نہیں جانتی کہ اُن کی پنجابی کا معیار کیا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ وہ اہل زبان کی مانند اس پر عبور رکھتی ہیں.. اور اُن کے خاوند پروفیسر بورس ذاخریف قدیم سنسکرت کے محقق ہیں.."

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اُن کی سنسکرت کیسی ہے.."

ظہیر الدین اس دوران بدستور کھوئے کھوئے رہے پر وہ اپنی سرزمین کے لیے پیاسے بہت تھے ایسا نہیں کہ وہ پاکستان سے مکمل طور پر منقطع ہو چکے تھے لیکن یہ کبھی کبھار کی دو چار برس بعد کی ملاقاتیں ہمیشہ تشنگی بڑھاتی ہیں اُن سے تشفی نہیں ہوتی.. میں حسبِ مقدور پنجابی زبان اور

ادب کے حوالے سے گفتگو کرتا رہا اور وہ محو ہو کر سنتے رہے کہ اُن کے محبوب کا تذکرہ ہو رہا تھا' سرسری ہی سہی..

اس چھوٹے سے فلیٹ کے ٹھہراؤ میں گھنٹی کی آواز کچھ زیادہ ہی گونجی اور لڈمیلا ایپرن پر ہاتھ صاف کرتی دروازے کی جانب لپکتی گئی.. یہ وہی متوقع پنجابی سنسکرت مہمان تھے.. وہ دونوں میری مانند عمر رسیدہ تھے پر مجھ سے کہیں بڑھ کر چاق و چوبند اور ذہنی طور پر روشن اور شفاف تھے..

اب یہ والی لڈمیلا مجال ہے شکل سے یا لباس سے کچھ زیادہ پڑھی لکھی لگتی ہوں.. وہی پچاس برس پیشتر جب پاکستانی وفد ماسکو سے باہر ایک اجتماعی فارم کے کسانوں کی جانب سے دی جانے والی ایک اوپن ایئر دعوت میں شریک ہوا تھا تو وہاں ایک دہقان اماں جی نے وفور جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے چھما مار لیا تھا اور اکارڈین کی موسیقی پر میرے ساتھ ایک رُوسی رقص کرنے لگی تھیں.. یعنی رقص تو وہ کر رہی تھیں لیکن ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹتی پھرتی تھیں.. ان لڈمیلا کو دیکھ کر مجھے وہ دہقان اماں جی یاد آ گئی تھیں..

تو جب لڈمیلا کے داخل ہونے پر لڈمیلا نے ہی اُن کا تعارف کروایا تو میمونہ کہنے لگی "جے تُسی پنجابی بولدے او تو میرے نال اَج صرف پنجابی وچ گل کرو"

وہ لڈمیلا تو خوش ہو گئی "اَسی کیوں نئیں پنجابی بولدے.. اَسی رُوسی پنجابی آں تے تُسی پاکستانی پنجابی.."

ازاں بعد یہ دونوں نہایت گھل مل گئیں یعنی گوڑھی سہیلیاں ہو گئیں یہاں تک کہ بات پوتروں اور دوہتروں تک جا پہنچی.

اس دوران اُس فلیٹ میں دو شخص ایسے تھے جو قدرے گونگے ہو گئے.. ایک تو میزبان لڈمیلا تھیں جو پنجابی کا اکا دُکا لفظ سمجھ جاتیں اور حسب عادت مسکراہٹ کے شرارے برسانے لگتیں اور بھلا پروفیسر بورس ذافرین جو اپنے وسیع تن و توش کے ساتھ نہایت حیرت اور دلچسپی سے ان دونوں خواتین کو تکتا جاتا تھا کہ اُس کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا.. ہاں اگر سنسکرت بولی جا رہی ہوتی تو اُس کے پلے کچھ پڑتا..

بورس میزبان لڈمیلا کے لیے اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب لایا تھا جو سنسکرت زبان کی گرائمر کے بارے میں ایک تحقیقی تصنیف تھی.. اگرچہ لکھی رُوسی زبان میں گئی تھی. ہم سب نہایت اشتیاق سے اُس کی ورق گردانی کرتے رہے.. بورس نے پیشکش کی

کہ اگر میں اس کتاب میں دلچسپی رکھتا ہوں تو وہ مجھے ایک نسخہ پاکستان بھیج دے گا.. اس پر میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بورس صاحب.. میں آپ کی ایک کتاب ضائع نہیں کرنا چاہتا.. ایک ایسی کتاب جو سنسکرت ایسی ادق زبان کی گرائمر کے بارے میں ہو اور پھر رُوسی زبان میں ہو.. آپ کیوں مجھے خلجان میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں"

بورس ایک خوش وجاہت بھاری بھرکم شخص تھا.. اگرچہ وہ باریش تھا لیکن اُس کی ریش طالبان کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھی یعنی مٹھی میں بھینچنے سے دوسری جانب سے ظاہر نہ ہوتی تھی البتہ مونچھیں چناپٹ تھیں اور بعض اوقات شائبہ ہوتا کہ وہ نورانی گروپ کا کوئی مولانا ہے..

ویسے میں اس بورس کو.. جو نہ تو اُردو و پنجابی سے واقف تھا اور نہ ہی اُس کی انگریزی اتنی تھی کہ وہ باقاعدہ گفتگو کر سکتا.. تو میں اُسے رشک کی نظروں سے دیکھتا تھا.. وہ کیسا منفرد اور انوکھے مزاج کا شخص تھا کہ سنسکرت کے ناتے سے کیسے کیسے قدیم جہانوں میں چلا جاتا ہوگا.. ہزاروں برس پیشتر کے برصغیر میں اُوپر سے اُترنے والے آریائی حملہ آوروں کی دنیا میں شب و روز بسر کرتا تھا.. کیسے کیسے مقدس صحیفوں کا مطالعہ کرنے پر قادر ہوگا.. دنیا کی ایک قدیم ترین زبان پر عبور حاصل کر لینا گویا اُس کی تاریخی قدامت میں سفر کرتے ایک متروک اور گمشدہ تہذیب کے اندر چلے جانا ہوتا ہے..

تب سوویت یونین سے واپسی پر میں مشرقی برلن میں چند روز کے لیے رُکا تھا کہ وہاں میری ایک قلمی دوست ایلکے سومرز رہتی تھی. ایلکے نے مجھے اور میرے دوست طارق کو اپنے ہاں کھانے کے لیے مدعو کیا جہاں اُس کے بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی.. وہ ابھی حال ہی میں ہندوستان میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا اور ایک دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا اور اُس نے کہا تھا "میں اب مغرب میں نہیں رہ سکتا.. میں سنسکرت کے حوالے سے آج کی دنیا سے کٹ کر قدیم ہندوستان میں جا چکا ہوں اور وہاں سے واپس نہیں آ سکتا..

بورس بھی ایلکے سومرز کے بھائی کی طرح رُوس میں نہیں قدیم ہندوستان میں رہائش پذیر تھا اس لئے میں نے اُسے رشک کی نظروں سے دیکھا کہ ہم تو لمحہ موجود کے قیدی ہیں اور یہ ایک زبان کے سہارے زمانے کے دریا کے پار اُتر کر پچھلے زمانوں میں چلا گیا ہے..

لڈمیلا پنجابی بے دریغ پنجابی ہو رہی تھی اور ایسے ہو رہی تھی جیسے پنجاب کے کسی گاؤں کی ناخواندہ مٹیار ہوتی ہے.. البتہ اُس کی رواں پنجابی میں کہیں کہیں ہندی کے نا آشنا لفظ در آتے

تھے اس لئے کہ اُس نے پنجابی کی تعلیم چندی گڑھ میں حاصل کی تھی اور اُس پر اُس پار کے پنجاب کا اثر گہرا تھا... وہ پاکستانی پنجابی کے محاورے کے بارے میں بہت کچھ نہ جانتی تھی اور میں نے اُس شام اپنے آپ کو وقف کر دیا کہ میں اُس کی جانکاری میں اپنے ہاں کی اصل پنجابی کا اضافہ کروں.. اور اس میں تعصب کا کچھ عمل دخل نہ تھا.. میں نے اصل پنجابی کا جواز صرف یہ پیش کیا کہ بابا گورونانک کے سوا پنجابی کے جتنے بھی بڑے اور صوفی شاعر ہو گزرے ہیں وہ تقریباً سب کے سب مسلمان تھے.. اور اُن کی جنم بھومی ہمارا پنجاب تھا.. وہ لاہور کے شاہ حسین ہوں.. قصور کے بلھے شاہ.. جنڈیالہ شیر خان کے وارث شاہ.. جھنگ کے دمودر یا سلطان باہو ہوں.. بہاولپور کے خواجہ فرید اور پاکپتن کے بابا فرید ہوں.. ہاشم شاہ ہوں یا سرحد کے ذرا پار مولوی غلام رسول عالم پوری ہوں ان سب کا رشتہ ہمارے پنجاب سے ہے تو جو زبان ان مہان شاعروں کی تھی تو وہی اصلی پنجابی کہلا سکتی ہے.. اور یہ سب فارسی رسم الخط میں پنجابی لکھتے تھے گورمکھی میں نہیں..

مجھے نہیں معلوم کہ لڈمیلا نے کہاں تک میرے نکتہ نظر سے اتفاق کیا لیکن اُنہوں نے یہ ضرور کہا کہ.. مجھے احساس ہوا ہے کہ جب تک میں آپ کے پنجاب کو نہ جانوں میں پنجابی نہیں جان سکتی.. اور مجھے کل ماسکو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں میں نے ایک نہایت شاندار کتاب جو دو جلدوں پر مشتمل تھی اور مظفر غفار صاحب کی تصنیف تھی اور بلھے شاہ کے بارے میں تھی' میں نے دیکھی.. مجھے بتایا گیا کہ آپ نے خصوصی طور پر یونیورسٹی کو یہ تحفہ پیش کیا تھا.. میں اس کا بھی مطالعہ کروں گی..

لڈمیلا.. اُردو والی' ٹھیٹھ رُوسی ہونے کے باوجود اور کسی حد تک فیمنسٹ ہو جانے کے باوجود شراب سے پرے پرے رہتی تھی یعنی خاصی شرقی خاتون تھیں لیکن اُنہوں نے رندوں کی دل آزاری نہ کی اور شیشے کے سامان کا وافر بندوبست کر لیا..

بالآخر ہم اُردو' پنجابی اور انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے اُٹھے.. بورس شاید دل ہی دل میں سنسکرت کا کوئی قدیم بھجن الاپتے ہوئے اُٹھے اور ہم سب کھانے کی میز پر آ گئے.. اور یہ میز مختلف خوراکوں سے اتنی لبریز تھی کہ کونوں سے چھلکی پڑتی تھی.. رُوسی سلادیں.. متعدد اقسام کی مچھلی.. گوشت کے قتلے.. ایک کڑاہی گوشت قسم کی چٹ پٹی ڈش... بیف کے فرائی شدہ پارچے.. روسٹ چکن.. نمکین سویاں.. آلو کے قتلے اور چٹنیاں.. اور مجھے چترال یاد آ گیا. جہاں مہمانوں کے لیے جب ایک میز خوراک سے سجائی جاتی ہے تو اگر اُس میز کا کوئی ایک چپہ بھی خالی نظر آ جائے تو

میزبان خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ میں نے آداب میزبانی کی توہین کی ہے. چنانچہ اور کچھ نہ ہو تو اُس خالی نظر آنے والے چپے کو بسکٹوں سے ڈھک دیا جاتا ہے... لڈمیلا کی کھانے کی میز ایسی ڈھکی ہوئی تھی کہ اُس کا خودکشی کے بارے میں سوچنے کا کچھ احتمال نہ تھا.. اور ان بے انت خوراکوں کا ذائقہ بھی نہ بھولنے والا تھا.. یوں کہ مجھے کچھ خدشہ ہوا کہ لڈمیلا اُردو زبان کی کوئی بین الاقوامی سکالر وغیرہ نہیں ہے دراصل ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ باورچن ہے..

اور جب مجھے یہ شرمندگی کھائے چلی جا رہی تھی کہ لڈمیلا ہمارے جانے کے بعد اتنے ڈھیر سارے برتن دھوئے گی اور میں نے پیشکش بھی کی کہ میں اور میمونہ معاون ثابت ہو سکتے ہیں تو اُس نے کہا "چھوڑیئے جی.. مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ لیو ٹالسٹائی کی آبائی ریاست یاسنایا پولیانا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں..."

"آپ نے کہا تھا کہ میں وہاں جاؤں گا تو لیو ٹالسٹائی کی موجودگی کو محسوس کروں گا.."

"ہاں' میں نے کہا تھا." باورچن لڈمیلا نے اپنی شرارے بھری مسکراہٹ سے اجتناب کر کے سنجیدگی اختیار کر لی "آپ ایک ناول نگار کے طور پر یقیناً ٹالسٹائی کی موجودگی محسوس کریں گے کیونکہ آپ نے بھی تو "راکھ" لکھا ہے... بے شک میں نے اسے ابھی تک مکمل طور پر نہیں پڑھا لیکن میں جان سکتی ہوں کہ آپ کی راکھ میں بہت سی چنگاریاں ہیں.."

باہر ماسکو کی رات بھیگتی تھی..

بھیگتی تھی پر سیاہ اندھیاری نہ ہوتی تھی کہ وہ ایک اور سفید رات تھی.

اسی فلیٹ کے آگے وہ جو ایک مختصری بالکونی تھی جس پر ہریاول ہجوم کرتی تھی اور بلند شجر اُس پر جھکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے وہاں وہ سفید رات شب کی تاریکی میں ایسے گھلتی تھی کہ اُسے بھی سفید کرتی تھی.. اور وہ بالکونی مجھے سندیسے بھیجتی تھی.. محبت کے رقعے روانہ کرتی تھی کہ آ جاؤ.. میمونہ نے میری آرزو کو بھانپ لیا اور سرگوشی کی "وہاں نہ جایئے گا... یہ بالکونی مجھے قدرے مخدوش لگتی ہے.."

میں کب اُس کی سرگوشی کو دھیان میں لاتا تھا.. ویسے میمونہ کو بھی خوب علم تھا کہ جب مجھے سندیسے آنے لگیں تو میں کچھ دھیان نہیں کرتا... بے دھیان ہو جاتا ہوں.

بالکونی کے آہنی اگرچہ زنگ آلود ہو چکے جنگلے کا سہارا لے کر.. اُسے تھام کر جب میں نے بے دھیانی میں دیکھا تو وہ ہریاول جو سفید رات میں سفید ہو رہی تھی اور وہ ذرا سی ہوا کے چلنے

سے جھولتے شجر سب میری آنکھوں میں اُتر آتے..

پھر مجھے محسوس ہوا کہ اس سفید رات میں ایک ہلکی سی پھوار اُترتی ہے، میں بھیگتا ہوں اور آس پاس ایک گھنا جنگل ہے. خاموشی کا ایک اُداس جنگل ہے جس میں بارش برستی ہے تو پیڑوں تلے جتنے بھی خودرو پھول بوٹے اور بیلیں ہیں وہ مینہ کی بوندوں کی تاب نہ لا کر سرگوشیاں کرتے ہیں.. اور میرے سامنے ایک کچا راستہ ہے جو ایک کچی قبر تک جاتا ہے اور کہیں لذمیلا بھی سرگوشی کرتی ہے کہ.. آپ ٹالسٹائی کی موجودگی محسوس کریں گے..

''اور... لیوٹالسٹائی''

مرنے والوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُن کی قبر پر ایک تاج محل تعمیر ہوتا ہے.. یا وہ بارشوں سے دھنس کر ایک گڑھا بن جاتی ہے اور اُس میں کوڑے رینگتے ہیں اور یا اُس سے ٹیک لگا کر سائیں لوگ چرس کے سُوٹے لگاتے ہیں..

انہیں مرنے والوں کو کیا غرض کہ اُن کے بعد کل عالم یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں اور کون سے قبرستان میں دفن ہیں اور ایک دنیا اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتی ہے اور گھی کے چراغ جلاتی ہے یا اُن کے مرقد کا نام ونشان باقی نہ رہے.. میر تقی میر کے بارے میں شنید ہے کہ اُن کی قبر لکھنو کے موجودہ ریلوے سٹیشن کے کسی پلیٹ فارم تلے ہو سکتی ہے کہ اس کی تعمیر کے دوران وہ پرانا قبرستان جہاں میر دفن تھے اس عمارت کی زد میں آ گیا تھا.. اب اگر اُن کی قبر مٹ چکی ہے کوئی نشان باقی نہیں اور غالب کی قبر موجود ہے اور مرجع خلائق ہے تو میر کو کیا اور غالب کو بھی کیا.. اُن کی شاعری کو اس سے کچھ فرق پڑا.. جانے ہومر.. ارسطو یا امراؤالقیس کہاں ہیں اور اگر ہم جانتے ہیں کہ رُومیؒ حافظ یا بلھے شاہ کہاں ہیں تو اس سے اُن کو کیا فرق پڑا..

بس یہ ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں کو فرق پڑتا ہے..

اُن کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل کے قریب لوگوں کے مدفن پر حاضری دیں، دیے جلائیں اور اُس پر ہاتھ رکھ کر اُس میں دفن شخص کی نبض محسوس کریں' اُس کی موجودگی کو تصور میں لا کر دل کا حال کہیں..

لیو ٹالسٹائی نے بھی شاید ہم جیسے پیچھے رہ جانے والے سوگواروں کی خاطر اپنے مزاج کے مطابق ایک وصیت کی تھی" مجھے دفن کرتے ہوئے کسی قسم مذہبی رسومات ادا نہ کی جائیں.. صرف لکڑی کا ایک تابوت ہو اور ہر اُس شخص کو کاندھا دینے کی اجازت ہو جو یہ خواہش رکھتا ہو.. اور پھر مجھے سٹاری ذاکاز کے جنگل میں پہاڑی نالے کے قریب' چھوٹی سبز شاخ کی جگہ دفن کر دیا جائے"

اور یہ چھوٹی سبز شاخ کیا تھی؟

ٹالسٹائی کا بھائی.. اُسے بے حد عزیز اور اُس کا بہترین دوست بھی صرف سینتیس برس کی عمر میں تپ دق سے مر گیا تھا.. بہت مدت بعد ٹالسٹائی نے اُسے یاد کرتے ہوئے کہا.. جب نکولائی بارہ برس کا تھا تو اُس نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ اُس کے پاس ایک راز ہے اور اگر اس کا انکشاف کر دیا جائے تو دنیا کے سارے غم ختم ہو جائیں اور کبھی جنگ نہ ہو.. اور اُس نے یہ بھی کہا کہ میں نے وہ راز ایک چھوٹی سبز شاخ پر لکھ کر اُسے پہاڑی نالے کے قریب جنگل میں دبا دیا ہے.. ٹالسٹائی کو بچپن میں یقین تھا کہ یہ سب سچ ہے اور وہ اُس جادوئی شاخ کو یاسنایا پولیانا کے گھنے جنگل میں تلاش کرتا رہتا تھا..

اس چھوٹی سبز شاخ کے فلسفے نے اُس کے ادب پر گہرا اثر ڈالا اور وہ زندگی بھر کوشش کرتا رہا کہ دنیا میں غم نہ ہوں' جنگ نہ ہو..

اور اس کی وصیت کے مطابق اُسے اسی جنگل میں جہاں نکولائی نے کہا تھا کہ وہاں چھوٹی سبز شاخ دفن ہے.. وہیں دفن کیا گیا.. خواہش کے مطابق قبر پر کوئی پختہ تعمیر نہ کی گئی اور اُسے کچا رکھا گیا تا کہ موت کے بعد بھی وہ موسموں کو محسوس کر سکے.. برفانی رُتوں میں اُس کی قبر برف سے ڈھک جائے تو وہ اُس کی خنکی سے جان جائے کہ باہر سرما کی سفید شدت اُتر رہی ہے اور جب خزاں کا موسم آئے تو جنگل کے درختوں سے جدا ہوتے زرد پتے اُس پر ایک چادر کی مانند بچھ جائیں.. بارشیں اُتریں تو میرے پاس بچاؤ کا کچھ سامان نہ ہو اور میں بھیگ جاؤں.. قبر کی مٹی کو قائم رکھنا جیسے میں ابھی ابھی دفن کیا گیا ہوں..

جی تو یہی چاہتا ہے کہ ٹالسٹائی کی اس وصیت اور خواہش کی ایک فوٹو کاپی نکلوا کر اس پر ایک کونے میں اپنے دستخط بھی کر دوں.. لیکن اپنے لواحقین کا خیال آتا ہے کہ وہ لاہور کے قریب کوئی جنگل کہاں سے تلاش کر پائیں گے.. بے چارے بھٹکتے پھریں گے کہ بابا جی عجیب سی وصیت کر گئے ہیں اب ان کا کیا کریں..

بہت عرصہ پہلے میں نے کسی سوویت میگزین میں ٹالسٹائی کی جنگلوں میں گھری کچی قبر کی تصویر دیکھی تھی اور اُس کی وصیت کے بارے میں پڑھا تھا اور جس روز ذخاروف نے مجھے خبر کی تھی کہ آپ کے دورۂ روس کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں اور آپ وہاں ماسکو میں کیا کیا دیکھنا

پسند کریں گے تو میں نے کہا تھا.. ٹالسٹائی کی کچی قبر..

"وہ تو ماسکو سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کی آبائی ریاست یاسنایا پولیانا میں واقع ہے.. صبح سویرے بہت سویرے ماسکو سے نکلنا ہوگا.. جاگ جائیں گے؟"

"میں اُس شب سوؤں گا ہی نہیں.."

"آپ عجیب مزاج کے مالک ہیں" ذخاروف کی پوٹن مسکراہٹ عروج پر تھی..

"عجیب مزاج کا مالک تو ٹالسٹائی تھا جو عجیب سی وصیت کر گیا.. عجیب میں تو نہیں وہ تھا"

اگر ہم کیمونزم کے عہد میں کہتے کہ ماسکو شیطان کی آنت کی مانند پھیلا ہوا ہے تو یہ درست نہ ہوتا کہ وہ لامذہب انقلابی خدا پر یقین نہ رکھتے تھے.. اور اگر اُس پر یقین نہ رکھتے تھے تو شیطان پر کہاں رکھتے ہوں گے لیکن ان دنوں ہم یہ محاورہ استعمال کر سکتے ہیں کہ وہی لامذہب اب گلے میں صلیبیں لٹکائے پھرتے ہیں..

ماسکو سے نجات حاصل کرنے میں ایک عرصہ لگ جاتا ہے اور تب جا کر روس کے کھلے سرسبز میدان اور جنگل شروع ہوتے ہیں..

بارش ہو رہی تھی.. اگرچہ ذرا سوچ میں تھی کہ کتنی برسوں.. یعنی ذرا کم ہو رہی تھی.

پورے نو بجے آنیا بیگم.. حسب معمول بنی ٹھنی صاف ستھری.. ڈاکٹر سلام کی عطا کردہ ہمارے لئے مخصوص کی گئی کار سمیت ہماری سویٹ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی.

"مستنصر.. یاسنایا پولیانا بہت دُور ہے.. ہمیں جلدی روانہ ہو جانا چاہیے"

ویسے آنیا نے بہت تگ و دو کی کہ ہم آرام سے کسی گائیڈ کے ہمراہ ایک ٹورسٹ بس میں ٹالسٹائی کی ریاست تک جائیں لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا.. اگرچہ ڈاکٹر سلام اُن دنوں اپنی والدہ کی علالت کے باعث پاکستان میں تھے لیکن اُنہوں نے اپنے سٹاف کو ہدایت کر رکھی تھی کہ تارڑ صاحب کا نہ صرف خیال بلکہ بہت خیال رکھا جائے چنانچہ آنیا کی درخواست پر اُدھر سے ڈرائیور سمیت ایک کار بھیج دی گئی.. ڈرائیور بہت خاموش طبع تھا اس لئے بھی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا..

برنارڈ شا ابھی ادبی اور ثقافتی حلقوں میں بہت زیادہ جانا نہیں جاتا تھا اُس کی شہرت کا ابھی آغاز ہوا تھا.. ایک شام اُس کا ایک قریبی دوست اُسے کسی محفل میں لے جا رہا تھا تو اُس نے

پوچھا.. برنارڈ! تم مجھے یہ بتاؤ کہ اُس محفل میں شریک لوگوں سے میں نے تمہارا تعارف کن الفاظ میں کرانا ہے.. کیونکہ سب لوگ تو تمہیں نہیں جانتے..

شاہ نے سنجیدگی سے کہا" جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں اور جو نہیں جانتے وہ اس لائق ہی نہیں کہ مجھے جانیں"

ٹالسٹائی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا تعارف کیا کروانا.. جو اُسے جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں اور جو نہیں جانتے.. وہ اس لائق ہی نہیں کہ اُسے جانیں.. بس یوں جانئے کہ جب گورکی نے ایک خط میں چیخوف سے دریافت کیا کہ ایک جینئس کی کیا تعریف ہو سکتی ہے تو اُس نے جواب میں لکھا تھا... یہ بیان کرنا کہ ایک جینئس کیا ہے بہت دشوار ہے.. البتہ صرف یہ کہہ دینا آسان ہوگا کہ... لیو ٹالسٹائی..

فرانسیسی ناول نگار گستاف فلابیئر نے اُسے شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا.. ورجینیا وولف جو اُس سے متاثر بھی تھی اُسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار مانتی تھی لیکن چیخوف جو اُس کا ذاتی دوست تھا اور اکثر یاسنایا پولیانا میں اُسے ملنے کی خاطر آیا کرتا تھا اُس نے ایک انوکھا خراج تحسین پیش کیا" جب ادب کے پاس ایک ٹالسٹائی ہو تو آپ کے لیے ایک ادیب ہونا آسان ہو جاتا ہے.. اگرچہ آپ کسی بلند مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ پہنچ رہے ہیں تو بھی دُکھ نہیں ہوتا کیونکہ ٹالسٹائی تمام ادیبوں کے لیے وہ مقام حاصل کر چکا ہے.."

ذاتی طور پر ٹالسٹائی تین شخصیات سے بے حد متاثر تھا.. دوستووسکی، پوشکن اور شوپنہار.. موت سے پہلے وہ جو آخری کتاب پڑھ رہا تھا دوستووسکی کا ناول "برادرز کرامازوو" تھا..

اور جو لوگ اُس کے نظریۂ حیات سے متاثر ہوئے بے شمار تھے.. اور اُن میں موہن داس گاندھی.. مارٹن لوتھر کنگ.. ورجینیا وولف اور ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے ترک ادیب اورہان پاموک شامل ہیں. مہاتما گاندھی تو باقاعدہ اُس کا مرید تھا.. عدم تشدد کا فلسفہ گاندھی نے ٹالسٹائی سے متاثر ہو کر اختیار کیا تھا.. جب اُس نے ٹالسٹائی کی تحریر "خدا کی سلطنت تمہارے اندر ہے" پڑھی تو گاندھی جو آزادی کی خاطر تشدد کے راستے پر چلنے کو تھا تائب ہوا اور عدم تشدد کو اپنی حیات کا اصول بنا لیا. ان دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی رہی جس میں ٹالسٹائی نے برصغیر کی انگریزوں سے آزادی کی بھرپور حمایت کی.. یوں ہم اُسے ایک ایسے دانشور کی حیثیت

سے قبول کر سکتے ہیں جو تخلیق پاکستان میں معاون ثابت ہوا.. گاندھی نے جنوبی افریقہ میں جو آشرم قائم کیا اُس کا نام "ٹالسٹائی کالونی" رکھا.. یوں بھی یہ دونوں حضرات گوشت سے پرہیز کرتے تھے اور صرف سبزیوں پر گزر اوقات کرتے تھے.. اور اس کے باوجود ٹالسٹائی گاندھی کی ہندو قوم پرستی کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اس کا اظہار کرتا رہتا تھا.. اگرچہ ٹالسٹائی نے شوپنہار سے متاثر ہو کر عیسائیت کو ترک کر دیا اور ایک ذاتی عقیدہ ایسا ایجاد کیا کہ بہت سے لوگ اُس کے پیروکار ہو گئے.. اُس کے گھر والے اُس کے عقیدے پر ایمان نہ لائے کہ گھر کے پیر کو کوئی نہیں مانتا لیکن اُس کے ماننے والے ایک تاریخ دان کے بقول اُس کی ریاست یاسنایا پولیانا کی جانب اُسے ایک بیت المقدس جان کر سفر کرتے تھے اور ٹالسٹائی کو ایک پیغمبر مانتے تھے..

یہ کہنا کہ وہ انسانی تاریخ میں سب سے بڑا نثر نگار ہے اس میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن یہ کہنا کہ "جنگ اور امن" دنیا کا سب سے بڑا ناول ہے اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا.. البتہ اُس کے کچھ مداح "آنا کرینینا" کو یہ مقام دیتے ہیں.

میں نے "جنگ اور امن" پہلی بار بائیس برس کی عمر میں پڑھا تھا.. اور ہاں مجھے یاد آیا کہ جب ایک یورپی ادیب سے دریافت کیا گیا کہ اگر آپ کو یہ زندگی دوبارہ مل جائے تو وہ کون سا ایسا تجربہ ہوگا جس میں سے پہلی بار گزرنے کے آپ منتظر رہیں گے تو اُس نے جواب دیا تھا کہ.. "جنگ اور امن" کو پہلی بار پڑھنے کا تجربہ.

تو یہ ناول جو میں نے بائیس برس کی عمر میں پہلی بار پڑھا، میکملن اینڈ کمپنی لندن کا شائع کردہ مجلد ایڈیشن تھا جو اُن دنوں صرف بائیس روپے میں حاصل ہو گیا تھا.. اس ناول میں درجنوں نہیں سینکڑوں کردار تھے اور اُن کے باہمی رشتوں کا سراغ نہ ملتا تھا.. کہ یہ والے کاؤنٹ کون سے ہیں.. اور یہ نتالیہ یا نتاشا کس کی بیٹی ہے اور کس پر جان دیتی ہے اور کیوں دیتی ہے.. اور نام بھی ایسے کہ نہ پڑھے جا سکیں اور یاد رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.. اس گورکھ دھندے کا حل میں نے یہ نکالا کہ ایک کارڈ پر تمام کرداروں اور خاندانوں اور اُن کے آپس کے رشتوں کے نام لکھ لئے اور ہر سطر پڑھتے ہوئے میں اُس کارڈ کو ایک نظر دیکھ لیتا کہ اچھا یہ جو بوڑھی اماں ایک پرنس کی منت سماجت کر رہی ہیں کہ میرے بیٹے کو فلاں جنرل کا سیکرٹری بنوا دو تو یہ کون ہیں.. اور یہ کردار جو مخمور ہو کر ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑا جھوم رہا ہے یہ کہاں سے آ گیا ہے.. اور جو وحشی بات بے بات پہ بظاہر

طیش میں آ کر مدمقابل کو ڈوئل کا چیلنج دینے والا نوجوان ہے تو یہ پرنس ڈولوخوف ہوگا..

ایسے کرداروں کی ان اُلجھنوں کو اگر آپ ایک مرتبہ توجہ مرکوز کر کے سلجھا لیں تو پھر "جنگ اور امن" کے یہی کردار آپ کو ایک مقناطیس کی مانند کھینچ کر اپنی دنیا کا ایک فرد بنا لیتے ہیں اور پھر آپ اُس دنیا میں سے عمر بھر باہر نہیں آ سکتے.. ٹالسٹائی ایک ایسا دیوتا تھا جو خود اپنی مرضی کی ایک اور دنیا تخلیق کرنے پر قادر تھا.

یہ صرف کردار ہی نہ تھے جو اُس کی بسائی ہوئی دنیا میں سانس لیتے تھے بلکہ اُس کی منظر نگاری بھی ایسی تھی کہ منظر اُس کے قلم کے تابع ہو کر دریافت کرتے تھے کہ اگرچہ بہار کے آنے میں کچھ دن باقی ہیں اور شگوفوں کے کھلنے میں ابھی کچھ دیر ہے لیکن اگر تم کہو تو ان شگوفوں کو ابھی کھلا دیں.. درختوں کو زربار کر دیں.. اور یہ ندی جو دوڑوں کے درمیان بہتی ہے اگر آپ چاہیں تو اس کا رُخ بدل دیں.. قفقاز کے "سٹیپے" میدان جو ابھی سرما کی شدت سے زرد ہو رہے ہیں انہیں ابھی سرسبز کر دیں..

میرے سفرنامے "خانہ بدوش" میں افغانستان کی ایک ویران کاروان سرائے کی رات میں آسمانوں سے جو بارش اُترتی ہے.. بجلی کے لہریئے سانپ جو سیاہ بادلوں میں سے روشن ہوتے ہیں.. اُس رات کا بیان ٹالسٹائی کی منظر نگاری سے مستعار لیا گیا ہے.

وہ ہر بڑے ادیب کی مانند ایک سر پھرا ابنارمل شخص تھا.. ایک شاہانہ امیرانہ خاندان کا فرد.. جس کی زمینوں پر ہزاروں "سرف" یا غلام شب و روز بغیر کسی اُجرت اور انعام کے مشقت کرتے تھے اور مرتے تھے. ٹالسٹائی کے طور طریقے بھی وہی تھے جو اُن زمانوں کے شہزادوں اور رئیس زادوں کے ہوا کرتے تھے.. ایک بے پرواہش کی زندگی کو اپنا پیدائشی حق سمجھنا اور اُسے کسی بھی احساس جرم کے بغیر بسر کرنا.. دولت کو بے دریغ لٹانا.. خواتین پر ڈورے ڈالنا.. اور اپنی زمینوں پر مشقت کرتے دہقانوں کو اپنے پالتو جانوروں سے بھی بدتر جاننا.. اور پھر ہر ثروت مند شخص کی طرح جس کا تعلق رائلٹی سے ہو.. اپنے لئے باعث افتخار جاننا.. یعنی بے تحاشا شراب پینا اور جوا کھیلنا.. بلکہ وہ آبائی گھر جس میں وہ پیدا ہوا تھا اُس کے جوئے کے نقصانات کے ازالے کے لیے فروخت ہو گیا..

لیکن یوں ہوا کہ اُس کی ذات میں ہولے ہولے ایک تبدیلی رُونما ہونے لگی.. وہ دیگر

رئیس زادوں کی نسبت خصلت میں جدا ہونے لگا.... وہ اُس نظام سے نفرت کرنے لگا جس میں اُس جیسے پیدائشی جاگیردار اپنی جاگیروں میں دن رات مرتے محنت مشقت کرتے مزارعوں کے وجود سے بھی لاعلم تھے اور یہ مزارعے بھوک اور بیماری سے جانوروں کی مانند مرتے رہتے اور کسی کو اُن کے مرنے کی خبر تک نہ ہوتی.

ٹالسٹائی کی ماہیت قلبی ہوئی تو اُس نے بے پناہ مجرم محسوس کیا' اپنے شاہانہ مقام سے نیچے آ کر مزارعوں ایسی زندگی گزارنے لگا.. اُنہی کے طور طریقے اختیار کر لیے.. اُن کے ہمراہ کھیتوں میں مشقت کرتا اور ہل چلاتا. اُس نے اپنی کچھ زمینیں مزارعوں کے نام کر دیں تو اُس کے خاندان کو اُس کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری. یہاں تک کہ اُس نے اپنی ایک وصیت میں تقریباً تمام جاگیر دہقانوں کے نام وقف کر دی لیکن بعد میں اپنے خاندان اور خصوصی طور پر اپنی بیوی کے دباؤ کی وجہ سے اُس میں ردّ و بدل کرنے پر آمادہ ہوا..

ماسکو شہر میں اُس کے نام کے کوئی نصف درجن میوزیم تو ہوں گے اور اُن میں وہ گھر بھی شامل ہے جس میں اُس نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا لیکن اُس کا اصل گھر جس میں اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بسر کیا "یاسنایا پولیانا" میں ہی تھا..

وہ جس نوعیت کی ہیجان خیز اور جذباتی زندگی گزارتا تھا اُس کی موت بھی ویسے ہی ڈرامائی انداز میں ہوئی.. ایسی موت جو اگر کسی بھی ناول کا اختتام ہوتا تو وہ ناول ہمیشہ کے لیے لوگوں کا پسندیدہ ہو جاتا. لیکن اس کا تفصیلی تذکرہ اُس کمرے میں جا کر ہوگا جہاں ایک [illegible] پلنگ پر اُس کی لاش رکھی گئی اور جس کی کھڑکی کے باہر دہقان اور مزدور اپنے بال بچوں سمیت اپنے محسن کے لیے گریہ کرتے تھے..

جس روز آپ نے کوئی عجوبۂ روزگار آثار دیکھنے ہوں' یا کسی عشق خاص سے ملاقات کرنی ہو.. ایک ایسے چہرے کو دیکھنا ہو جسے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ آپ اُسے دیکھ رہے ہیں تو اُس روز صبح سویرے آپ کی کیفیت ہی جدا ہوتی ہے' خون کی گردش میں ایک سنسنی سی بجنے لگتی ہے اور آپ کے سامنے ایک شگوفہ آ گرتا ہے اور اُس خوشی کا تعلق چار مرغابیوں سے ہرگز نہیں ہوتا..

تو وہ سویر جب ہم نے ٹالسٹائی کے گھر جانا تھا' اُس کی کچی قبر کو جانا تھا تو وہ سویر کیسی بھلی

اور سوہنی من موہنی لگ رہی تھی..

مطلع ابر آلود تھا اور کار کی ونڈ شیلڈ پھوار سے بھیگ رہی تھی... کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے تو خنک ہوا رخساروں پر پھیلنے لگتی..

پرساد کے راستے کی مانند یہاں بھی سرسبز وادیوں اور درختوں کے اندر "ڈاچا" نظر آتے جاتے تھے.. آخر ایک "ڈاچا" کی تعریف کیا ہے.. ایک باقاعدہ ڈاچا بقول آنیا وہ ہوتا ہے جو کسی جنگل میں پوشیدہ ہو.. آس پاس کوئی آبادی نہ ہو دُور دُور تک کوئی اور نفس نہ ہو.. اور یہ اشد ضروری ہے کہ وہاں قریب ہی کوئی ندی بہتی ہو.. جمعے کی شام کو ماسکو خالی ہونے لگتا ہے.. ایک غدر سا مچ جاتا ہے کہ ہر رُوسی چھٹی کے یہ دن گزارنے کے لیے اپنے ڈاچا کا رُخ کرتا ہے.. چاہے یہ ایک باقاعدہ ڈاچا نہ ہو لکڑی کا بے شک ایک ڈربہ سا ہو.. ماسکو کی جانب آنے والی شاہراہ ویران ہوتی ہے اور باہر جانے والی لین پر ٹریفک جیم ہو جاتی ہے۔

جانے اس کا کیا جواز ہے کہ پاکستان میں چھٹی کے روز گھر سے باہر نکل کر کچھ وقت کھلی فضا میں گزارنے کا رجحان کم ہے جب کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں لوگ اُس روز کے منتظر رہتے ہیں جب وہ اپنے گھر کی یکسانیت سے نکل کر باہر مناظر قدرت کی قربت میں چند سانس لے سکیں گے.. انگریز تو اپنے دیہی مناظر کے رومان میں مرا جاتا ہے.. کچھ نہ کرے تو چھٹی کے روز کسی ایسی ندی میں کُنڈی ڈال کر بیٹھ جائے گا جہاں یہ بورڈ آویزاں ہو کہ اس ندی میں سے آخری مچھلی شیکسپیئر کے زمانے میں پکڑی گئی تھی.. اور آیندہ ہزار برس میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں.. اور اس کے باوجود وہ سارا دن سردی میں ٹھٹھرتا بیٹھا رہے گا اور "انجائے" کرتا رہے گا.. ایرانی تو گل و گلشن پر فدا ہے.. وہ ایک مزدور ہو یا ثروت مند شخص چھٹی کے روز گھر میں بیٹھنا گناہ سمجھے گا.. بے شک کسی جوہڑ کے کنارے دری بچھا کر بیٹھ جائے اور حافظ کی کوئی غزل گنگناتا رہے.. گھر سے نکلے گا ضرور.. امریکی اور کینیڈین بھی اسی لت میں مبتلا ہیں.. ترکوں کا بھی یہی حال ہے.. عرب اپنا پُرآسائش گھر چھوڑ کر صحرا میں جا خیمہ لگائے گا اور ریت پر لوٹنیاں لگائے گا.. تو پھر پاکستانی کھلی فضا میں جانے سے کیوں کتراتے ہیں.. شاید یہ موسم کی شدت ہے.. رینگنے والے حشرات کا خدشہ ہے.. یا پھر اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت دن نہیں ہوئے جب ہمارے شہر اور قصبے قدرتی مناظر اور جنگلوں میں گھرے ہوئے تھے.. جنگل آبادیوں کو گھیرے ہوئے تھے اور ہمیں کہیں باہر

جا کر کھلی فضا تلاش کرنے کی حاجت ہی نہ تھی.. ابھی کچھ برس پیشتر تک لاہور کی نہر آبادی سے دُور درختوں اور جنگلی بیل بوٹوں میں گھری ہوتی تھی اور وہاں گیدڑ لومڑ اور جنگلی بلے عام پائے جاتے تھے.. میرے ابا جی نے ایک مرتبہ کراچی کی جانب سفر کرتے ہوئے یہی کوئی ساٹھ ستر برس پیشتر اُس مقام پر جہاں ان دنوں گلبرگ آباد ہے اور میرا گھر ہے ہرنوں کی ایک ڈار کو ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتے دیکھا تھا..

میمونہ جو میں بہت بار اقرار کر چکا ہوں مجھ سے کہیں دانش مند خاتون ہے اسی لیے اُس نے آج صبح ناشتے کے دوران جب میں نے چکودرے کے جوس کا تیسرا گلاس بھرا تو روکا.. پھر کافی کی دوسری پیالی پینے لگا تو سرزنش کی "یہ جوس اور کافی راستے میں آپ کو بہت تنگ کریں گے بار بار رُکتے پھریں گے تو نہ پئیں" اور میں نے عین اپنی خصلت کے مطابق اُس کا کہا نہ مانا تھا اور اب پچھتا رہا تھا.... بوجھ پڑنے لگا تھا.. میں نے کچھ دیر تو ضبط کیا لیکن جب دنیا اندھیر ہونے لگی مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو میں نے آنیا سے درخواست کی کہ وہ ڈرائیور سے درخواست کرے کہ وہ کسی مناسب مقام پر کار روک کر انکل ڈیئر کو ذرا ہلکا کرا دے.. چنانچہ ہم ایک وے سائیڈ ریستوران کے قریب جا رُکے جہاں حسب معمول کچھ روبل خرچ کر کے میں اُس کے واش رُوم کی سہولت سے لطف اندوز ہوا.. فارغ ہوا تو چاک و چوبند اور بوجھ سے آزاد میں ٹالسٹائی سے ملاقات کے لیے تیار ہو گیا.. اس عمر میں اعضاء ہر نوعیت کے مضمحل ہو جاتے ہیں اور اُن میں برداشت کی کمی واقع ہو جاتی ہے..

بارش رُک گئی تھی مگر آسمان پر بادل ابھی گھنے تھے جو برسنے کے لیے جھکے جاتے تھے..

تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم رُوس کے قدیم اور تاریخی شہر ٹُولا میں داخل ہو گئے..... دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی افواج ٹُولا پر قابض ہو گئی تھیں لیکن روسیوں کی شدید مدافعت کے باعث وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھیں اگرچہ اگلی منزل ماسکو تھا اور اُن کا ماسکو پہنچ کر سرخ چوک میں ایک فاتحانہ مارچ کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا..

آج کا ٹُولا ایک بہت اپنے آپ میں رہنے والا خوش نظر اور خوش سکون شہر ہے.. شاہراہوں کے کناروں پر مسلسل باغ باغیچے پھول بوٹے اور شجر ہیں.. ان باغوں میں جو لوگ بیٹھے ہیں اور فٹ پاتھوں پر جو لوگ چلتے ہیں وہ ماسکو کی مانند افراتفری اور سیمابیت کا شکار نہیں.. میں نے ایک قدیم متانت اور ٹھہراؤ کو اس شہر کے لوگوں میں اور عمارتوں میں محسوس کیا.. اُن میں شوخی اور

چمک بھڑک مفقود ہے جو ماسکو میں ہے ایک پروقار تمکنت ہے جو ماسکو میں مفقود ہے..

ہم راستہ بھول گئے.. ٹولا کے ایک ایسے حصے میں جا نکلے جہاں ایک بہت وسیع شاہراہ کے درمیان میں ٹرام کی ایک پٹری تھی اور بارش کے باعث ہر سُو کیچڑ ہو گیا تھا.. اس سڑک کا حال کچھ اچھا نہ تھا.. وہ شکستہ اور برے حالوں میں تھی.. ڈرائیور اور آنیا اپنے سامنے شہر کا نقشہ پھیلائے ٹولا سے باہر نکلنے کے راستے کا تعین کر رہے تھے.. کبھی کسی چوک میں پہنچ کر یکلخت دائیں ہاتھ مڑ جاتے.... مڑتے جاتے اور جانے کہاں پہنچ کر احساس ہوتا کہ یہ موڑ نہیں مڑنا چاہیے تھا چنانچہ پھر اُسی شکستہ کیچڑ بھری سڑک پر واپس آ جاتے.. ایک بار کسی دیہاتی آبادی میں جا نکلے جو ہماری منزل سے بالکل مخالف سمت پر واقع تھی.. تب میں نے آنیا سے کہا ''کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کار روک کر کسی مقامی شخص سے راستہ پوچھ لیں؟'' تو اُسے کچھ سبکی محسوس ہوئی ''مستنصر! ہمارے پاس نقشہ ہے تو راستہ تلاش کر لیں گے۔''

میں نے کہا کہ پھر کر لو..

اور راستہ نہ ملا..

''دیکھو آنیا میں نے ایک دنیا یونہی راہ چلتے لوگوں سے بار بار راستے پوچھتے دیکھی ہے اور کبھی گم نہیں ہوا.. نقشے میرے پاس بھی ہوتے تھے لیکن لوگ نقشوں سے بہتر رہنمائی کرتے ہیں''

چنانچہ ہم نے ایک فٹ پاتھ کے برابر میں کار کھڑی کر کے ایک راہگیر سے راستہ پوچھا تو وہ کہنے لگا میں ٹولا کا رہنے والا نہیں ہوں اس لیے اس شہر کے راستوں سے ناواقف ہوں.. پھر ایک اماں جی لاٹھی ٹیکتی اپنے چھوٹے سے پوتے کو انگلی لگائے چلی آ رہی تھیں اُن سے دریافت کیا کہ یاسنایا پولیانا جانا ہے تو کدھر سے جائیں تو وہ کہنے لگیں ''آپ لوگ تو بالکل غلط راستے پر آ گئے ہیں.. بہتر یہ ہے کہ آپ اگلے چوک سے دائیں مڑ کر ٹولا کے قدیم حصے میں سے گزر کر بائیں مڑ جائیں اور وہاں ایک متروک شدہ سوویت زمانوں کی فیکٹری ہو گی تو وہاں سے سیدھے چلے جائیں۔''

اور ٹولا میں یوں گمشدہ ہو جانا.. بھٹکتے رہنا میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ جب ہم اماں جی کی ہدایات پر عمل کرتے اگلے چوک سے دائیں ہاتھ مڑے ہیں تو گویا پانچ سات سو برس پیشتر کے رُوس میں داخل ہو گئے ہیں.. ایک ایسی گلی میں چلے گئے ہیں جس کے دونوں جانب جو چوبی مکان تھے وہ گڑیوں کے گھر لگتے تھے.. اپنی قدامت میں ٹھہرے ہوئے تھے اُنہیں

جدید فن تعمیر کی نظر بد نہ لگی تھی.. ماضی کی ایک تصویر لگتے تھے جسے ہم کسی کتاب کے بوسیدہ اوراق میں دیکھتے تھے.. یقین نہ آتا تھا کہ کوئی ان میں رہتا بھی ہو گا کہ بوسیدہ اوراق میں ماضی میں کون زندہ رہ سکتا ہے.. وہ بہت بوسیدہ ہو رہے تھے.. اُن کے آگے مختصر باغوں کے گلی میں کھلتے ہوئے لکڑی کے پھاٹک ٹیڑھے ہو چکے تھے اور ٹھیک طرح سے بند نہ ہوتے تھے.. منقش گل بوٹوں سے مزین کھڑکیاں بہت زمانہ دیکھ چکی تھیں اور بوڑھی ہو چکی تھیں..

یہ وہ گلی تھی کہ آپ کسی بھی چوبی مکان کی کھڑکی پر ہولے سے دستک دے کر پوشکن یا ٹالسٹائی کے کسی کردار کے بارے میں پوچھ سکتے تھے کہ کیا وہ اندر ہے.. میں اُس سے ملاقات کا تمنائی ہوں.. کہیں ترگنیف کا رودین بھی اسی گھر میں نہیں رہتا اور نتالیہ اُس کے عشق میں فنا اُس سے ملنے آئی تھی... ان گھروں میں سے کوئی پرنس اینڈریو.. کوئی پرنس ڈالوخوف یا کوئی دمتری کرامازوو باہر آ سکتا تھا.. عین ممکن ہے کہ سامنے سے گلی کے پتھروں پر ایک شاندار گھوڑا چلا آئے جس کا سوار پیئر ہو.. ہم تو ایسی حیرتوں کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتے پر وہ نہ ہوتا.. کہ یہ مشرق شباہت کے دو لوگ میرے زمانے میں کیسے آ گئے ہیں.. اور یہ جس چیز پر سوار ہیں وہ بگھی تو نہیں ہے کہ اس کے آگے گھوڑے جُتے ہوئے نہیں ہیں تو پھر یہ کیسے حرکت کرتی جا رہی ہے..

ہم ایسی ہی دو تین گلیوں میں سے گزرے..

جہاں ہماری کار گزرتی اُن کی بے حرمتی کرتی تھی کہ اُنہیں صرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی عادت تھی.. بگھیوں کے کھڑکھڑاتے پہیوں کی پہچان تھی..

اور ہم اپنے زمانوں میں ٹھہری ہوئی.. اُن میں خوابیدہ.. قدیم گلیوں میں سے نکل کر بالآخر اپنے راستے پر آ نکلے.. چند کوس کا فاصلہ نہایت تیز رفتاری سے فراٹے بھرتے ہوئے طے کیا تو دائیں جانب ایک بہت ہی گھنے جنگل کے بارش میں بھیگے ہوئے جنگل کے شواہد نظر آئے اور انہی جنگلوں کے اندر شاہراہ سے بچھڑ کر ایک ذیلی سڑک ہماری منزل کی جانب رواں تھی..

اور کچھ دیر بعد.... ہم ابھی ٹولا کی قدیم گلیوں میں ہی بھٹکتے تھے جب منزل مراد آ گئی..

حسب آرزو وہ مقام آ گیا جس کی خواہش میں ہم آج سویرے ماسکو سے چلے تھے..

ہمارے ڈرائیور نے جس کا نام سرگی تھا کار گھما کر ایک پارکنگ لاٹ میں ساکت کھڑی چند کاروں اور دو ٹورسٹ بسوں کے درمیان میں جگہ بنا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا..

ہم باہر آئے.. اپنے اکڑے ہوئے بدن سیدھے کیے اور ہوا میں خنک نمی تھی اُسے بخوشی اپنے سانسوں میں اُتارا اور پھر آس پاس نظر کی. پارکنگ ایریا سے ہٹ کر ذرا دو چار سیڑھیوں کی اُونچائی پر درجنوں چھوٹے چھوٹے کھوکھے تھے جن میں سوائے لیوٹالسٹائی کی یادگاروں کے اور کچھ نہ تھا.. اور وہاں جو سیاح تھے وہ "یاسنایا پولیانا" میں گھوم پھر کر.. کچھ وقت گزار کر واپس آ چکے تھے لیکن ٹالسٹائی کی حیات کے سحر میں ابھی تک تھے اور اُسے یاد کرنے کی خاطر سوونیئر خریدتے تھے.

میں نے پوچھا "آنیا.. ہمیں یہیں آنا تھا ناں؟"

اور اُس نے ذرا شک شبہ میں سر ہلا کر کہا "ہاں.. یہیں آنا ہوگا.. میں تو پہلی بار آئی ہوں.. نہیں جانتی کہ یہاں سے کہاں جانا ہے"

اور تب..

اور تب ایک نیلگوں کوٹ میں ملبوس' گلے میں سرخ مفلر لپیٹا ہوا اور سر پر ایک سفید اونی ٹوپی اوڑھے.. ایک ضعیف' عمر رسیدہ اور برگزیدہ سی خاتون ہمارے قریب ہوتی گئیں "میں آئرینا کے رہی ہوں" اُس نے سرگوشی کی..

"یہ کون ہیں؟" میں نے آنیا سے پوچھا اور وہ بھی سرگوشی میں کہ وہ قریب ہی تو کھڑی تھیں اور ایک سوئی سوئی سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر لرزاں تھی..

"یہ ہماری گائیڈ ہیں.. اور ہماری منتظر تھیں.. بہت دیر سے یہاں کھڑی ہیں"

"لیکن یہ کیسے جانتی ہیں کہ ہم.. آ رہے ہیں؟"

"مستنصر.. آپ جانتے ہیں کہ میں نے پہلے آپ کے لیے ایک گائیڈڈ ٹور حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی.. پھر ڈاکٹر سلام کی کمپنی سے کار تو میسر آ گئی لیکن.. ہم ایک گائیڈ کے بغیر اس تاریخی ریاست کو کیسے دیکھ سکتے تھے.. تب میں نے یہاں کے ٹالسٹائی میوزیم سے رابطہ کیا اور اُن سے کہا کہ پاکستان سے ایک ناول نگار آئے ہیں اور وہ یاسنایا پولیانا کو تفصیل سے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک گائیڈ کی ضرورت ہے.. فون انہی آئرینا نے اٹینڈ کیا اور انہوں نے بتایا کہ وہ یہاں میوزیم کی لائبریری کی انچارج ہیں اور اگر ہم پسند کریں تو وہ ایک گائیڈ کے طور پر ہمارا ساتھ دے سکتی ہیں اس لیے بھی کہ آج اُن کی چھٹی ہے تو ان سے بہتر ہمیں کون گائیڈ کر سکتا

تھا.. اس لیے یہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں"

"یہ اپنی خدمات کے عوض کچھ روبل بھی تو چارج کریں گی"

"ہاں.. لیکن ہم بعد میں بھاؤ تاؤ کر سکتے ہیں"

"لیکن یہ اتنے قریب ہو کر سرگوشی کیوں کرتی ہیں"

"میرا خیال ہے یہ آپ کو پسند کرتی ہیں" آنیا کی آنکھوں میں شرارت کے شرارے تھے.. "اس سے پیشتر اُن کی ملاقات کسی پاکستانی سے نہیں ہوئی اس لیے وہ آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھیں.."

آئرینا اس دوران ویسے ہی سوئی سوئی سی مسکراتی رہیں اور جونہی اُنہوں نے دیکھا کہ میرے اور آنیا کے مذاکرات اختتام پذیر ہو گئے ہیں اُنہوں نے فوری طور پر اپنے بیگ میں سے چند پکچر پوسٹ کارڈ نکال کر ہمیں پیش کر دیئے "یہ دیکھئے.. یہ ٹالسٹائی کی ریاست کے اصطبل اور مہمان خانے کی تصویر ہے.. اور اس کارڈ پر.. وہ سامنے دیکھئے.. وہ جو ٹھگنے اور موٹے دو ستون ہیں جو ریاست کے داخلے پر واقع ہیں یہ اُن کی تصویر ہے.. اور یہ.." اُس نے نہایت فاتحانہ انداز میں سرگوشی کی "وہ تصویر ہے جو ٹالسٹائی نے 1907ء میں اپنے دہقانوں اور اُن کے بچوں کے ساتھ اُس برآمدے میں اُتروائی تھی جو اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا" آئرینا نے اپنا منہ میرے کان کے بہت ہی قریب کر دیا.. "اور آپ.. وہ برآمدہ دیکھیں گے"

یہ تصویریں اور پوسٹ کارڈ نہ صرف سوویت زمانے کے تھے بلکہ ان کی چھپائی اور کاغذ کا معیار بھی وہی تھا جو پچاس برس پیشتر ہوا کرتا تھا یعنی بہت برا.. جانے اس آئرینا نے اُنہیں اب تک کیوں سنبھال رکھا تھا.. بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اُسی دور میں سانس لیتی ہے اور اُسے چنداں غرض نہ تھی کہ باہر کی دنیا میں.. تولا سے پرے ماسکو میں کیا ہو چکا ہے' دنیا بدل چکی ہے.

سامنے درختوں کے ایک گھنے ذخیرے کے داخلے پر دو ٹھگنے اور موٹے ستون تھے جن کے قریب دو باوردی حضرات یونہی بے مقصد ٹہل رہے تھے.... ہم چاروں پھاٹک کی جانب بڑھنے کو تھے جب بڑی بی یکدم پہلے مجھ پر اور پھر مونا پر اُمڈتی آئیں اور اپنے بیگ میں سے وہی کارڈ نکال کر ہماری آنکھوں کے ساتھ لگا دیا جو وہ پارکنگ لاٹ میں پیش کر چکی تھیں "یہ دیکھئے یاسنایا پولیانا کے داخلے پر واقع تاریخی ستون.. پہلے تصویریں دیکھئے پھر سامنے دیکھئے وہی ہیں..

ٹالسٹائی کی بگھی انہی ستونوں کے درمیان میں سے گزر کر اُس کی ریاست میں داخل ہوا کرتی تھی' یہ کارڈ آپ رکھ لیں"

"یہ کارڈ آپ ہمیں پہلے بھی عنایت کر چکی ہیں"

"ایک اور رکھ لیجیے.. ٹالسٹائی کی ریاست کے داخلے کی یادگار ہے.."

"اور یہ دیکھیے" ابھی ہم اُن ستونوں کی جانب بڑھ رہے تھے جب اُس نے ایک ٹرُپ کا پتہ بیگ میں سے برآمد کیا.. وہی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر جس میں ٹالسٹائی ایک چوغہ پہنے اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑا ہے اور اُس کے آگے کوئی سو کے لگ بھگ مزارعے اور اُن کے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔

"اس تصویر میں وہ برآمدہ صاف نظر آ رہا ہے.. تصویر 1907ء میں اُتری تھی اور اب 2007ء ہے تو سو سال ہو گئے ہیں.. کیسی یادگار تصویر.. رکھ لیجیے۔"

میں نے اُس کا دل دکھانا مناسب نہ جانا کہ اُس کی نیلی بجھتی ہوئی آنکھوں میں عقیدت کے خاموش پانی تھے اور کسی گمشدہ محبت کی پرچھائیاں تھیں.. میں نے شکریے کے ساتھ وہ کارڈ بھی دوبارہ قبول کر لیا..

وہ..... آ ئرینا.. اداکاری نہ کر رہی تھی.. ٹالسٹائی کا نام لیتی تھی تو اُس کے مرجھائے ہونٹ کھل جاتے تھے اور بجھتی ہوئی نیلی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں.. آج سے پچاس برس پیشتر وہ واقعی ایک شاہانہ پُروقار اور انتہائی خوبرو عورت ہوگی کہ اُس کی قامت اور رنگ و رُوپ ایک آخری گواہی دے رہے تھے.. ایک ایسی خاتون جو ٹالسٹائی کے کسی ناول میں بیان کردہ کسی شاہانہ جگمگاتے والی ضیافت میں جب گردن سیدھی کیے.. نزاکت سے پنکھا جھلتی ایک شاہی رہائش گاہ میں داخل ہوتی ہوگی تو کچھ لمحوں کے لیے ہر کوئی چپ ہو جاتا ہوگا' وہاں موجود نوجوان پرنس اور بوڑھے کاؤنٹ اپنی شراب پینا بھول جاتے ہوں گے.. اُن کے دل تھم جاتے ہوں گے..

مجھے یہ بھی گمان ہوا کہ یہ ادھیڑ عمر اجڑی ہوئی خاتون شاید ٹالسٹائی کے نام آنے والے ڈھیروں خطوط کو پڑھ کر اُسے سناتی ہوگی اور پھر اُس کی ہدایت کے مطابق اُن کے جواب تحریر کرتی ہوگی اور اس دوران وہ اُس سفید ریش بوڑھے جینئس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو گئی ہوگی.. اور اب ان زمانوں میں وہ ایک رُوح تھی جو اپنے محبوب کے گھر کے آس پاس بھٹکتی پھرتی تھی... جیسے

لُدمیلا تھوڑی بہت فیض ہو چکی تھیں اسی طور آ ئرینا ٹالسٹائی میوزیم کی لائبریری میں ایک زندگی گزارنے کے بعد تھوڑی نہیں بہت ٹالسٹائی ہو چکی تھیں..

اُن بھدے اور موٹے ستونوں کے اندر بائیں ہاتھ پر ٹکٹ گھر تھا اور آ ئرینا اور آ نیا وہاں سے داخلے کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے چلی گئیں.. ٹکٹ گھر کے عین سامنے ایک بہت وسیع تالاب تھا جس کے گھاس بھرے کنارے دُور تک چلے جاتے تھے اور اُس کے پانیوں پر ہریاول کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں اُن میں ڈوب ڈوب جاتی تھیں.. کناروں کی قربت میں جہاں پانی گہرے نہ تھے وہاں تہہ میں سے اُگتی ہوئی گھاس اُٹھتی تھی اور سرسراتی تھی. کچھ آبی پودے بھی سطح پر تیرتے تھے.. اور اُن میں چند کنول بھی تیرتے تھے..

اس تالاب کے قریب سبز رنگ کا ایک آہنی بنچ دھرا تھا اور میں اُس پر اپنی جیکٹ میں ہاتھ پوشیدہ کیے کہ آج قدرے خنکی تھی اور موسم میں نمی کے بوسے تھے.. بیٹھ کر ان دونوں کا منتظر ہو گیا.. اس کیفیت میں عجیب سے خیال اُس تالاب پر تیرتے رہے کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے اور اس میں رہنے والا انسان کتنا چھوٹا اور حقیر.. ایک ذرہ جو بھٹکتا پھرتا ہے.. کہاں لاہور اور کہاں تُولا کے قریب یاسنایا پولیانا کے ایک تالاب کے کنارے ایک بنچ.. کس کو پتہ ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں اور کون.. میرے بچے میرے دوست.. پارک کی سیر کے ساتھی... ٹیلی ویژن شو میں میرے برابر میں بیٹھی میری ساتھی میزبان یا میرا ڈاکیا.. سبزی والا.. ہمسایوں کا چوکیدار.. کون تصور کر سکتا ہے کہ میں یہاں ہوں.. وہ سب تو کیا میں خود بھی تصور نہیں کر سکتا.. اگر دنیا اتنی بڑی بنائی تھی تو انسان کو بھی اتنا بڑا بنایا ہوتا کہ وہ اس میں دکھائی تو دے جاتا.. ایک ذرہ کیسے دکھائی دے گا..

"ہا..." آ ئرینا داخلے کے ٹکٹ تھامے مجھے اُس بنچ پر براجمان دیکھ کر پھر اُمڈتی ہوئی آئی "ہا.. آپ جانتے ہی نہیں کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں. یہ وہ تالاب ہے جس میں ٹالسٹائی مزارعوں کے بچوں کے ساتھ تیرا کرتا تھا.."

"اچھا..."

"آپ کو یقین نہیں آتا.. وہ ایسا ہی تھا"

بابا جی یقیناً ایسے ہی تھے..

"اور جب موسم سرما میں ہر سُو برف کی چادر بچھ جاتی تھی.. اس تالاب کے پانی بھی

منجمد ہو جاتے تھے تو وہ.. دہقانوں کے بچوں کے ہمراہ اس کی برف پر سکیٹنگ کرتے تھے۔"

عجیب سی ایک تصویر بنتی تھی باباجی ان پانیوں میں ڈبکیاں لگاتے پھرتے ہیں.. تیرتے پھرتے ہیں اور اُن کی طویل سفید داڑھی سرداروں والی بھی پانی پر تیرتی جاتی ہے.. ہم اُس تالاب کے ساتھ چلتے درختوں میں گھرے ایک راستے پر آ گئے..

دائیں جانب بارش میں ابھی ابھی بھیگے سرسبز کنج نظر آتے تھے.. بلند قامتوں کے شجر اور اُن کے سائے میں ایسے تالاب جن کے پانیوں کو کائی نے ڈھانپ رکھا تھا. اور جہاں کہیں کائی پانیوں کو نہ ڈھکتی تھی وہاں وہاں تالابوں کے گرد درختوں کے جو جھرمٹ تھے اُن کا عکس تصویر ہوتا تھا. ہوا کا ایک جھونکا آتا تو وہ تصویر لرزنے لگتی اور آؤٹ آف فوکس ہو جاتی..

نہ صرف یہ کہ باباجی ایسے ہی تھے بلکہ موصوف کے آباؤاجداد کو بھی خبط کا عارضہ لاحق تھا.. یعنی سو پشت سے یہی سلسلہ چلا آتا تھا.. چنانچہ دادا جان کو خبط تھا کہ اپنی ریاست میں انگریزی اور فرانسیسی طرز کے باغ یا سیرگاہیں بنوائی جائیں.. جہاں تالاب ہوں' مصنوعی جھیلیں ہوں.. لکڑی کے پل اور ندیاں ہوں اور وہاں جتنے بھی گل بوٹے اور شجر ہوں وہ بھی انگریزی اور فرانسیسی ہوں.... اور پھر دادا جان اُن میں ٹہلا کریں.. اس شوق کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی اور دولت لٹا دی..

سامنے.. جس راستے پر ہم آ گئے تھے.. دُور تک بارش میں بھیگا ہوا ایک کچا راستہ تھا جس کے دونوں جانب برچ کے درخت بلند ہو رہے تھے.. اور یہ برچ بارش میں بھیگنے سے کچھ زیادہ ہی سفید اور زندہ لگتے تھے.. ان کی ٹہنیوں میں سے کنواری اور کومل کونپلیں پھوٹتی تھیں اور ان درختوں تلے جو گھاس تھی اُس کی ہری کچور.. ہریاول اتنی گھنی اور درخشاں تھی جیسے کسی مصور نے اپنا سبز پینٹ ان درختوں تلے انڈیل دیا ہو..

یہ راستہ دُور تک جاتا تھا.. جہاں تک نظر جاتی تھی جاتا تھا..

میں اس کی ہریاول اور سفید خوش نمائی بیان کرنے سے قاصر ہوں.

جیسے فلارنس میں ایک منقش دروازے کی تخلیقی کاریگری اور صناعی ایسے کمال کی ہے کہ اُسے جنت کا دروازہ کہا جاتا ہے.. دُور تک جاتے اس کچے راستے کی خوش نمائی اور برچ کی سفید سربلندی ایسی تھی کہ اسے جنت کا راستہ قرار دیا جا سکتا ہے.. ویسے ایک ایسے راستے کے آخر میں اگر

دوزخ بھی ہو تو بھی انسان ایسے راستے پر چلنے سے نہ جھجکے..

میں ابھی اس راستے کی خوش آثاری سے سنبھلا نہ تھا کہ آرینا مائی حسب عادت اپنی بجھتی ہوئی نیلی آنکھیں میرے اتنے قریب لے آئیں کہ میں نے جانا کہ وہ اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں دفن کرنا چاہتی ہیں "یہ جو راستہ ہے.. درختوں میں گھرا.. ٹالسٹائی نے اسے ہی تو "وار اینڈ پیس" کے ایک باب میں بیان کیا ہے. اسی کا نقشہ کھینچا ہے.."

آرینا کی اس اطلاع سے بلکہ مخبری سے اُس راستے کا رُوپ ہی بدل گیا.. متبرک ہو گیا.. وہ جو پہلے ہی ایک خواب لگتا تھا اب اُس خواب کے اندر ایک اور خواب نظر آنے لگا.. پرنس اینڈریو یا آندرے کا گھوڑا اس راستے پر بگٹٹ بھاگتا چلا جا رہا ہے کہ اُسے نتاشا کو ملنے جانا ہے.. پرنس نکولائی بلکونسکی کی بگھی کے گھوڑے کیچڑ میں سے نکلنے کی خاطر زور لگا رہے ہیں اور کیا وہ بہت بے دریغ اور کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنے آپ کو قائم کر کے واڈکا کی بوتل ایک ہی سانس میں پی جانے والا پیئر بھی انہی راستوں پر چلا ہو گا.

تاریخ کا کچھ اعتبار نہیں.. فورڈ نے کہا تھا کہ.. ہسٹری از اے بنک.. یہ زورآور کے ظلم کو پوشیدہ رکھنے والا ایک پردہ ہے اور مظلوم سے چشم پوشی کرنے والی ایک طوائف ہے. اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا.. ہر قوم اور ہر عقیدے کی تاریخ جدا ہوتی ہے اپنے تکبر اور اپنے نظریے کو برتر ثابت کرنے کے لیے.. تاریخ میں بے ایمانی کی بہت گنجائش ہے لیکن یہ صرف ادب ہے جس میں ایسی بے ایمانی نہیں ہو سکتی.. یہ مذہب اور قوم سے ماورا ہو کر اپنا اظہار کرتا ہے... وہ ہومر کی داستانیں ہوں.. امراؤالقیس کی شاعری ہو.. شیکسپیئر کے ڈرامے ہوں.. کالی داس کی شکنتلا ہو یا شاہ حسین کی فریادیں ہوں.. یہ سب کے سب مذہب اور ملت سے ماورا ہوتے ہیں اور اسی لئے ادب ہوتے ہیں...

تو یہ راستہ.. برچ کے بارش میں بھیگے ہوئے سفید تنوں والا ہرا کچور راستہ جو تھا اسے یہ رُوپ تاریخ نے نہ دیا.. ٹالسٹائی نے دیا.. ورنہ دنیا میں ایسے ہزاروں راستے ہوں گے.. منزلیں ہوں گے.. لیکن ایک ناول نگار نے اگر اس راستے کو دنیا کے سب سے بڑے ناول میں بیان کیا اس کا نقشہ کھینچا تب یہ جنت کا راستہ ہوا..

ویسے یونہی دل لگی کی خاطر عرض کرتا ہوں کہ برچ کی سفیدی میں سانس لیتا یہ راستہ ایسا

تھا کہ اسے میں بھی بیان کرتا تو ٹالسٹائی سے کم بیان نہ کرتا کہ یہ راستہ ہی ایسا تھا..

ہم نے بھی راستے تو بہت بیان کیے پر وہ راستے ڈھول بھرے تھے..اُن کے آس پاس کیکر کے کانٹوں والے درخت گرمیوں میں جھلستے تھے..آک کی جھاڑیاں تھیں جن کے ڈوڈوں میں سے سفید مائی بوڑھیاں فرار ہو کر گرم دوپہروں میں ڈولتی پھرتی تھیں...گاؤں کے بچے اُن کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے اور جب وہ کسی مائی بوڑھی کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیتے تو کچھ دیر انتظار کرتے اور جب اپنی مٹھی کو کھولتے تو اُس کے کچھ آثار نہ ہوتے..ہاتھ کی لکیروں پر اور انگلیوں کی پوروں پر جو ہلکی سی سفیدی اور کچھ بال ویڑ ہوتے وہ اُس مائی بوڑھی کے ہوتے..

راستوں کو تو ہم نے بھی صرف میں نے نہیں میرے ہم عصروں نے بھی بیان کیا پر اُن کی قدر نہ ہوئی..

آرینا مسلسل ہمیں اطلاعات فراہم کرتی جاتی تھیں..

"کیا آپ یقین کریں گے کہ یہاں اِندرا گینڈے کا بھی آنا ہوا تھا؟"

"گینڈے...؟"

"آپ نہیں جانتے..ہندوستان کی وزیراعظم اِندرا گینڈے..وہ یہاں خصوصی طور پر آئی تھی۔"

میں نے اس اطلاع پر کوئی خاص خوشی کا اظہار نہ کیا اندرا گاندھی بھی یہاں آئی تھی..

"آپ اندرا گینڈے کو نہیں جانتے تو مہاتما گینڈے کو تو جانتے ہوں گے.."

میں نے سوچا کہ اندرا تو یہاں تک آ ہی گئی ہو گی کہ وہ ایک سلجھے ہوئے ذوق والے باپ کی بیٹی تھی لیکن یقیناً اپنے مہاتما گاندھی تو ادھر نہیں آئے ہوں گے..اتنی سردی میں ایک لنگوٹی میں کہاں آئے ہوں گے لیکن آرینا ابھی تک میرے ردعمل کی منتظر تھی کہ میں مہاتما گینڈے کو جانتا ہوں یا نہیں "وہ بھی یہاں آئے تھے؟"

"نہیں نہیں" آرینا نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کے آگے پنکھا سا جھلا..بعد میں پتہ چلا کہ آرینا جب بھی کسی بات کی مکمل نفی کرنا چاہتی ہے تو انکار میں سر ہلانے کے بجائے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کے آگے پنکھا سا جھلنے لگتی ہے "جب گینڈے جنوبی افریقہ میں نسلی تعصب کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے تو وہ لیو ٹالسٹائی کو خط لکھا کرتے تھے..اور ٹالسٹائی ان

کے خطوط میں اتنی دلچسپی لیتا تھا کہ اُن پر اپنی آرا کے حاشیے لکھا کرتا تھا..ٹالسٹائی میوزیم میں.. یہاں..وہ خط محفوظ ہیں اور مجھے اُن کو دیکھنے کا اعزاز حاصل ہے"

اور پھر اُس جنت کے راستے کے آخر میں برچ اور دیودار کے درختوں کی گھناوٹ میں سے ایک سفید گھر جھلکنے لگا..اور وہ گھر یکسر نمایاں نہ ہوتا تھا درختوں کی شاخوں میں سے پھوٹتی کنواری سبز کچے رنگ کی سبز روئیدگی میں نہ پوشیدہ ہوتا تھا اور نہ مکمل طور پر ظاہر ہوتا تھا..اور اس گھر کے آگے گھاس کا جو ایک وسیع سبزہ زار تھا اُس میں کہیں کہیں زرد پھول نمودار ہو کر زرد چھینٹے اُس گھاس پر چھڑک رہے تھے.

آرینا ظاہر ہے ایک ایک پتے اور بوٹے کی تفصیل مہیا کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتی تھی اور میں بعض اوقات اتنی تفصیل سے ذرا بیزار ہو جاتا کیونکہ یا تو آپ سن سکتے ہیں اور یا دیکھ سکتے ہیں. آپ کسی بھی منظر یا عمارت کے سحر اور دل نشینی کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے جب تک آپ بیرونی آوازیں منقطع کر کے اپنے تخلیق کردہ ایک سناٹے میں نہ چلے جائیں اور وہ منظر اور عمارت بھی اُس سناٹے میں نہ چلے جائیں..اور پھر ایک ایسا لمحہ آتا ہے کہ وہ خود بخود بولنے لگتے ہیں' آپ سے ہم کلام ہونے لگتے ہیں..وہ بلند برفیلی بلندیاں ہوں یا سنگ و خشت کے معجزے.اور اگر آپ سے اُن کی تفصیل مسلسل بیان کی جاری ہو تو پھر وہ بے جان رہتے ہیں' خود سے کلام نہیں کرتے..چنانچہ میں اکثر جان بوجھ کر پرے ہو جاتا اور مونا نہایت تحمل سے اُس برگزیدہ روح کا لیکچر سنتی رہتی..

اس سفید حویلی نما گھر کی کھڑکیاں فرانسیسی طرز کی تھیں اور اس کی چھتیں ڈھلوان تھیں جو ہلکے زرد رنگ میں رنگی ہوئی تھیں..ہم جس جانب سے چلے آرہے تھے اس گھر کا ماتھا اُس جانب نہ تھا..ادھر پچھواڑا تھا..اور اس بیک یارڈ میں نرگس اور گل لالہ کی کیا ہی دل کش کیاریاں بہار پر تھیں..

گھر کے صدر دروازے کی جانب چلے تو وہاں اُس کے پہلو میں وہ خوش نما برآمدہ جو کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی نے پچھلے پہر کی دھوپ سینکنے کے لیے اور جب انہی موسموں میں جب اس گھر کے سامنے چالیس ہیکٹر میں پھیلے ہوئے سیبوں کے باغوں میں جو ہزاروں پستہ قد شجر تھے وہ شگوفوں سے لد جاتے تھے تو اُن کی مہک محسوس کرنے کے لیے اور اُن کی دل فریبی آنکھوں میں اُتارنے کے لیے اس گوشے کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا..

یہ تو ہرگز نہیں کہ ہم اس برآمدے تک خاموشی میں پہنچ گئے اور یکدم ہم نے جانا کہ یہ

کون سا برآمدہ ہے.. نہیں آرینا پھر سے ہیجان میں آ چکی تھی.... بس یہی ہے وہ برآمدہ.. میں نے کہا تھا ناں کہ آج آپ اسے دیکھیں گے" اُس نے بیگ میں سے وہی برآمدے والی ایک اور تصویر برآمد کی" اب اس تصویر کو دیکھئے سو برس پیشتر کی اُتاری ہوئی نایاب تصویر.. اور پھر نظر اُٹھا کر سامنے برآمدے کو دیکھئے.. موازنہ کیجیے.. یہ جوں کا توں ہے. آج ٹالسٹائی نہیں ہے' دہقانوں کے وہ بچے جو تصویر میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں وہ نہیں ہیں لیکن آپ چشم تصور سے ٹالسٹائی کو وہ اُس کونے میں کھڑا دیکھ سکتے ہیں.."

ہم نے صرف ایک چشم کو کیا دونوں چشموں کو تصور کیا لیکن ٹالسٹائی نظر نہ آیا.. اگرچہ ہم نے آرینا کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا کہ ہاں نظر آ گیا ہے..

"آپ یہ رکھ لیجیے.." اُس نے وجد میں آ کر وہ تصویر میری جانب بڑھائی..

"میرے پاس پہلے سے ایسی دو تصویریں ہیں آپ نے عنایت کی ہیں"

"یہ بھی رکھ لیجیے.. یہ ایک تاریخی تصویر ہے"

میں نے ایک مرتبہ پھر آرینا کا دل رکھ لیا.. ایک تو اُس کا دل بار بار رکھنا پڑ رہا تھا..

اتنی دیر میں سکول کے بچوں کا ایک ہجوم کہیں سے نمودار ہوا اور وہ سب اُس برآمدے میں جا کر اُودھم مچانے لگے.. اس برآمدے میں چمڑے کے درجنوں غلاف سے ڈھیر تھے اور آپ پر لازم تھا کہ آپ ٹالسٹائی کے گھر کے اندر جانے سے پیشتر اپنے جوتوں پر یہ غلاف چڑھا لیں تا کہ بے ادبی بھی نہ ہو اور جوتوں کی آلائشیں گھر کے چوبی فرشوں کو آلودہ نہ کریں.. یہ بچے اب اُن غلافوں کو اپنے بوٹوں پر چڑھاتے شور کر رہے تھے اور اپنے اساتذہ کی سرزنش کے باوجود غل کرنے سے باز نہ آتے تھے..

صدر دروازے پر تعینات خاتون چوکیدار نے ہمیں مطلع کیا کہ گھر کے اندر ایک ہی وقت میں لوگوں کی ایک مخصوص تعداد کو جانے کی اجازت ہے اور ابھی گنجائش نہیں ہے اس لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا..

"چلئے اس دوران ہم سیبوں کے باغوں میں کچھ وقت گزار لیتے ہیں"

ان باغوں کا منظر مجھے کچھ شناسا لگا..

چالیس ہیکٹر پر پھیلے تاحد نظر سیبوں کے ان مختصر قامت درختوں تلے جو زمین تھی اُسے

سراسر سرسبز بوٹیوں اور خودرو پودوں نے ڈھکا ہوا تھا اور یہ ٹنڈ منڈ پتوں سے عاری شجر اُس ہریاول میں سے اپنی سینکڑوں سیاہ باہوں کو فضا میں ساکت کئے کھڑے تھے.. ان درختوں کے ہاتھ خالی تھے.. ان میں وقت کے پانی ٹھہر نہ سکے تھے.. ان کی خالی سیاہ ٹہنیوں کو اگر بہت قریب ہو کر دیکھتے تو اُن میں کہیں کہیں ایک ہلکی سفیدی پھوٹنے کے آثار تھے.. بہار آتے آتے پل بھر کے لیے رُک گئی تھی' موسم کی خنکی سے ہراساں ابھی اس کے زائل ہونے کی منتظر تھی.. شگوفے پھوٹنے اور کھلنے کے لیے ذرا سی حدت کا بہانہ چاہتے تھے.. اور یہ منظر مجھے اس لئے شناسا لگا کہ وادیٔ سوات میں بٹ خیلہ کے قصبے سے آگے دریا کے کناروں پر اور آس پاس کی زمینوں پر آلوچے اور بادام کے جو باغ خنکی میں ٹھٹکتے تھے وہ بھی یہی منظر تھے.. وہاں بھی خالی ہاتھ سرمئی شاخیں اُن آلوچے اور باداموں کے درختوں کی شگوفوں کی پھوٹ محسوس کرتیں منتظر تھیں کہ کب اُن پر بہار آئے.. اگرچہ اُن کی ٹہنیاں سوات کے ماہ اپریل کی خنکی میں ویران تھیں اور اس کے باوجود زاہد کالیے کے قدموں میں ایک شگوفہ آ گرا تھا اور اُس کے برادر عزیز کتورے نے ایک ہلکی سی وف کی تھی تو اُس نے.. مخمور کالیے نے ہراساں ہو کر پوچھا تھا" مشاہد یہ کیا ہے؟"

اور مشاہد نے کہا تھا کہ.. یہ ہم ہیں..

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو جدا کیا اور بن باس اختیار کیا.. اُن تینوں خواتین سے الگ ہو کر جنگل میں جا بسیرا کیا.. ٹالسٹائی کے سیبوں کے باغوں کے اندر تک چلا گیا.. وہاں تک چلا گیا جہاں سے نہ وہ سفید گھر دکھائی دیتا تھا اور نہ کوئی لوگ.. اور میں نے اُس خاموش تنہائی میں اُتر کر ایک گہرا سانس لیا' ہوا کی خنکی.. ایک شائبہ سا کسی مہک کا جو بھیگی ہوئی تھی.. شاید اُن سیاہ ٹہنیوں پر جو سفید دھبے تھے جو اپنے اندر شگوفوں کو کچھ دیر کے لیے پنہاں رکھے ہوئے تھے یہ ہوا انہیں چھوتی چلی آتی تھی..

بے شک خوشی کا تعلق چار مرغابیوں سے نہ تھا..

اُس کا تعلق سیب کے درختوں کی ٹہنیوں میں پوشیدہ شگوفوں سے بھی ہو سکتا ہے.. کیا جانئے کہ کب ایک شگوفہ آپ کے قدموں میں آ گرے.. اور اگر ایسا ہو جائے تو آپ کس سے پوچھیں گے کہ یہ کیا ہے.. کہ وہاں تو آپ کے سوا اور کوئی نہیں.. اور کون ہے جو ایسے سیب کے باغوں کے اندر تک نہ چلا جائے اور اُسے خوشی نہ ملے.. اور وہ ایک "آنا کرنینا" لکھنے پر قادر نہ ہو جائے..

"ایک شخص کو کتنی زمین درکار ہوتی ہے" ایسی کہانی نہ لکھ سکے..

اگرچہ میں ذاتی طور پر ایک رومانوی پُر فضا اور آسودہ ماحول کو تخلیق کے لیے شرطِ اوّل نہیں گردانتا.. دنیا کے بہت سے بڑے لکھنے والوں نے انتہائی ناسازگار ماحول، تنگی اور عسرت میں.. تاریک کوٹھڑیوں میں ایک موم بتی کی روشنی پر جھکے بڑا ادب تخلیق کیا.. دوستوفسکی نے کیا لیکن ایسا ماحول اگر میسر آ جائے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں..

ویسے مجھے تو صرف ایک شجر درکار تھا.. جس کی سیاہ ٹہنیوں میں سفید آنکھیں منتظر ہوں.... سفید دھبے پھوٹنے کے انتظار میں ہوں اور میں اُن کی مہک کے شائبے محسوس کر سکوں.. ٹالسٹائی کے سیبوں کے باغوں میں سے کوئی ایک شجر..

میری زندگی میں اِک "شجر" ہے.. اِک چراغ ہے اور تم ہو..

اگرچہ میں نے اس شجر کی کمی کو کبھی محسوس نہیں کیا.. میرے مختصر صحن میں کچھ بیلیں ہیں.. کچھ بوٹے ہیں اور صبح سویرے اُن کی قربت میں ہو کر میں اُن میں گھنے جنگل تصور کر سکتا ہوں.. سیبوں کے باغ دیکھ سکتا ہوں.. کسی خالی گملے میں کسی پرندے کی بیٹ میں پوشیدہ کسی بیج کو پھوٹتے ہوئے وہی خوشی محسوس کر سکتا ہوں جو ٹالسٹائی سیبوں کے ان وسیع باغوں میں محسوس کر سکتا تھا.. میں جب موسمِ گرما میں گھر سے کوہ نوردی کے لیے نکلتا ہوں تو پورچ کے اُوپر رسیوں سے بندھی ہوئی بیل ابھی بھیل رہی ہوتی ہے، پتے نکال رہی ہوتی ہے اور جب پندرہ بیس روز بعد پہاڑوں کی وحشت اپنی آنکھوں میں لئے گھر لوٹتا ہوں تو وہ بیل گلابی شگوفوں سے بوجھل ہو رہی ہوتی ہے اور وہ شگوفے ذرا سی ہوا کے چلتے ہی ٹپ ٹپ فرش پر گرتے ہیں.. اور صفائی کرنے والی خاتون اُنہیں آج جھاڑو سے سمیٹتی ہے تو کل پھر وہ فرش شگوفوں سے ڈھکا ہوتا ہے..

یہ منظر بھی ٹالسٹائی کے سیبوں کے باغوں سے کم نہیں ہوتا.. اور مجھے خوشی دیتا ہے.. اگرچہ خوشی کا تعلق چار مرغابیوں سے ہرگز نہیں ہوتا..

میرے جوگرز گیلے ہو چکے تھے.. اُن پر کچھ پتے چپکے ہوئے تھے..

میں یہاں عبث انتظار میں تا دیر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کہ کب کوئی شگوفہ پھوٹے اور میرے قدموں میں آ گرے..

میں اُس مہک بھرے گیلے سیبوں کے جنگل میں سے لوٹا تو سونا بیگم ٹالسٹائی کے گھر کے

ارد گرد چکر لگا کر.. وہ کچن دیکھ کر جس میں ٹالسٹائی خاندان کا کھانا تیار ہوتا تھا اب آرینا کے ہمراہ نہایت متانت سے ایک تناور درخت کے مردہ سوکھ چکے تنے کو نہایت غور سے دیکھ رہی تھی..

"یہ نادار لوگوں کا درخت ہے.." وہ فوراً مجھ سے مخاطب ہو گئی "یہاں اس کے سائے میں صبح سویرے آس پاس کے دیہات کے غریب اور نادار لوگ جمع ہونے لگتے تھے تاکہ وہ ٹالسٹائی کی سخاوت کے طلب گار ہوں.. وہ ناشتے کے بعد گھر سے باہر آتا اور ان لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتا اور حسبِ مقدور اُن کی مدد کرتا.. یہ درخت اُن زمانوں سے قائم تھا پھر چند برس پیشتر اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر سوکھ گیا.. اس کے سوکھ چکے تنے اور ٹہنیوں کو سہارے دے کر ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا.."

"یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟" میں نے بہت متحیر ہو کر دریافت کیا..

"آرینا نے بتایا ہے اور متعدد بار بتایا ہے" وہ مسکرانے لگی..

اُدھر آرینا ٹالسٹائی کے گھر کے دروازے کے قریب کھڑی مسلسل استفسار کر رہی تھی کہ اب اندر کتنے لوگ ہیں.. ہماری باری کب آئے گی.. آپ جانتے نہیں کہ پاکستان سے ایک ناول نگار آئے ہیں تو ہم کب اندر داخل ہوں گے اور پھر اُس نے پُر مسرت ہو کر ہاتھ ہلایا کہ چلے آؤ..

ہم نے بھی اُسی تاریخی برآمدے میں بیٹھ کر چمڑے کے اُن غلافوں سے اپنے بوٹ ڈھانپے جنہیں ابھی ابھی گھر کی سیر سے فارغ ہونے والے سیاحوں نے اُتارا تھا.. اور پھر پاؤں میں ان سیاہ ڈھانپوں کے باعث کسی برفانی آدمی کی طرح تھپ تھپ کرتے ٹالسٹائی کے گھر میں داخل ہو گئے.. اور داخل ہوتے ہی ایک کتب خانے میں آ گئے جہاں ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا تھا.. کسی ایک کمرے میں محدود سے چند سیاح جا سکتے تھے اور جونہی وہ اندر جاتے تھے دروازہ بند کر دیا جاتا تھا.. چنانچہ ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا تھا..

آرینا چونکہ میرے برابر میں کھڑی تھی اس لئے وہ حسبِ عادت اُمڈ نہ سکی اور صرف سرگوشی کی "یہ ٹالسٹائی کی لائبریری ہے لیکن آپ ابھی شیلفوں کے قریب جا کر کتابوں کے بارے میں نہ جانیے گا.. ہم پورے گھر کو دیکھ کر بالآخر واپس یہیں آئیں گے تب تسلی سے دیکھ لیجیے گا.."

میں اب وہاں ٹالسٹائی کے کتاب گھر میں یونہی تو منتظر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے میں نے آرینا کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور شیشے کے شوکیسوں میں بجی کتابوں کے موضوعات پڑھنے لگا.. کسی

بھی شخص کی ذات اور ذہنی رجحان کو جاننے اور پرکھنے کا سب سے بڑا پیمانہ اُس کا کتب خانہ ہوتا ہے... ان شیلفوں میں بائیس ہزار کے قریب جرائد اور کتابیں بجی تھیں جو دنیا کی اُنتالیس زبانوں میں تھیں.. ان میں انگریزی کی جو کتب تھیں وہ میں دیکھ سکتا تھا کہ زیادہ تر ادب' مذہب' فنونِ لطیفہ' طب' جغرافیہ اور فلسفے کے بارے میں تھیں.. ٹالسٹائی کو مختلف زبانیں سیکھنے کا بھی خبط تھا.. قازان یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اُس نے ترکی اور عربی پر بھی دسترس حاصل کی.. وہ تقریباً پندرہ زبانوں کو پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا.. پچاس برس کا ہوا تو اُس نے عبرانی اور قدیم یونانی زبانوں کا مطالعہ شروع کر دیا صرف اس لئے کہ وہ بائبل کے کچھ حصے پڑھ کر اُن کا رُوسی میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا.. اسّی برس کی عمر میں جا کر باباجی کو یکدم خیال آیا کہ یہ زندگی کس کام کی اگر انسان بدھ مت کی مقدس کتابیں اور کنفیوشس کے ارشادات کو براہِ راست جاپانی اور چینی میں نہ پڑھ سکے چنانچہ اُنہوں نے فوری طور پر ان دونوں زبانوں کو سیکھنے کا عمل شروع کر دیا.. دو برس بعد وہ فوت ہوئے تو شاید اس لئے ہو گئے کہ چینی جیسی پیچیدہ زبان کو اسّی برس کی عمر میں سیکھنا اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا..

کتب خانے کی دیوار پر آویزاں کلاک چھ بج کر پانچ منٹ پر رُکا ہوا تھا..

اُس گھر میں جتنے بھی کمرے تھے اُن سب کے کلاک اور گھڑیاں چھ بج کر پانچ منٹ پر ساکت تھے.. یہ وہ وقت تھا جب ٹالسٹائی نے آخری سانس لئے اور اُس کی بیوی صوفیا نے وقت کو وہیں روک دیا..

اس دوران ہمیں گھر کے اندر داخل ہونے کا اذن مل گیا اور ہم ایک پُر شوق کیفیت میں ٹالسٹائی کے ڈائننگ روم میں داخل ہو گئے.. یہاں وہ وقت ساکت ہو چکے تھے جب ٹالسٹائی اس کمرے میں اپنے مہمانوں کو مدعو کیا کرتا تھا.. ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں انگریزی طرز کی نفیس نزاکت والی تھیں.. پرانے قالین.. دیواروں پر آویزاں اس کے خاندان کی پورٹریٹس.. برابر میں کھڑکی کے نزدیک ایک گول میز جہاں کھانے سے فارغ ہو کر مہمان آ بیٹھتے تھے اور اُس کی بیوی اپنے محبوب مشغلے سلائی کڑھائی میں مصروف ہو جاتی تھی.. فرنیچر اور آرائش چونکہ اُنہی وقتوں کی تھی اس لئے اُس کی قدامت میں ایک خاص مہک تھی.. اس ماحول میں وقت واقعی ایسے ٹھہرا ہوا تھا کہ آپ کو قطعی طور پر صدمہ نہ ہوتا اگر اچانک ٹالسٹائی وہاں نمودار ہو جاتا اور آپ سے دریافت کرتا کہ آپ

کس سلسلے میں میرے ذاتی ڈائننگ روم میں موجود ہیں' میں نے تو آپ کو ڈنر پر مدعو نہیں کیا..

اس ڈائننگ روم کے علاوہ اُس گھر کے جتنے کمروں میں بھی ہم گئے اُن میں سے بیشتر کی کھڑکیاں اُس بیک یارڈ پر کھلتی تھیں جہاں نرگس اور گل لالہ کی کیاریاں بہار پر تھیں اور اُن سے پرے برچ کے سفید تنوں کی قطاریں اور جھنڈ تھے اور سبزے سے نچڑتی گھاس میں زرد پھولوں کے چھینٹے تھے.. اور میں جس کمرے میں بھی داخل ہوتا سب سے پہلے اُس کی کھڑکیوں میں تصویر ہوتے منظر کو آنکھوں میں اُتارتا اس لئے بھی کہ ٹالسٹائی بھی اس منظر کو دیکھتا تھا.. گھر کے اندر تصویر کشی مکمل طور پر ممنوع تھی. اور میں نے صرف ایک بار جب ہم ٹالسٹائی کی سٹڈی میں تھے جہاں اُس نے ''وار اینڈ پیس'' کے کچھ باب رقم کئے تھے تو وہاں جو کھڑکی کھلتی تھی اُس کی تصویر اُتارنے کی اجازت چاہی کہ وہ جب اس عظیم ناول کو لکھتے ہوئے مسودے پر سے نظر اُٹھاتا تھا تو اُس کھڑکی میں سے اُسے کیسا منظر نظر آتا تھا لیکن اجازت نہ ملی.. اُس کھڑکی میں اُس روز باہر بارش ہو رہی تھی اور برچ کے درخت اُس میں بھیگتے جا رہے تھے..

اس ڈائننگ رُوم میں ایک کونہ سنجیدہ کہلاتا تھا اور دوسرا پُر مزاق.. سنجیدہ کونے میں ٹالسٹائی اپنے دوستوں اور ملاقات کے لیے آنے والے دانشوروں کے ساتھ دنیا بھر کے موضوعات کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا اور شطرنج کھیلتا اور دوسری جانب پُر مزاق حصے میں اُس کی دونوں بیٹیاں پیانو بجاتیں اور نوجوان لوگ رُوسی لوک گیت گاتے.. وہاں ایک سکیچ بک بھی رکھی تھی جس پر ٹالسٹائی تصویریں بنایا کرتا تھا..

ڈائننگ رُوم کے بعد ہم ٹالسٹائی کی مطالعہ گاہ میں داخل ہوئے.. یہاں ایک کونے میں ایک عجیب سی دقیانوسی مشین پڑی تھی.

''آپ ایڈیسن کو جانتے ہیں ناں.'' آرینا عام حالات میں بھی سرگوشیاں کرتی تھیں لیکن ٹالسٹائی کے گھر کے اندر تو وہ اتنی مؤدب ہو گئی کہ وہ سرگوشی بھی مزید سرگوشی میں کرتی اور کچھ پلے نہ پڑتا کہ کیا کہہ رہی ہے اور وہ کہہ رہی تھی ''یہ ایڈیسن کا ایجاد کردہ اوّلین فونوگراف ہے جو اُس نے ٹالسٹائی کو تحفے کے طور پر روانہ کیا کہ وہ بھی ایک مداح تھا. اُس نے درخواست کی کہ ٹالسٹائی اس مشین پر امریکی عوام کے نام اپنا پیغام ریکارڈ کر کے اُسے بھیج دے.. آج بھی امریکہ میں جو ایڈیسن میوزیم ہے وہاں ٹالسٹائی کی آواز کی ریکارڈنگ موجود ہے لوگوں کی فرمائش پر اُنہیں سنائی جاتی ہے..''

یاسنایا پولیانا کے بارے میں یہ ذاتی روئیداد لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آئرینا کے اس بیان کو چیک کر لینا چاہیے کہ کیا واقعی تالستائی کے گھر میں رکھا فونوگراف اُسے تھامس ایڈیسن نے بھیجا تھا' وہی ایڈیسن جس کے ایجاد کردہ بجلی کے بلب کی روشنی میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں.. چنانچہ میں نے تُمیر کے تعاون سے گوگل پر جا کر تالستائی اور ایڈیسن کی سائٹ کھولی اور وہاں کچھ اور انکشاف ہوئے. ان دونوں کی ملاقات 1908ء میں ہوئی تھی اور یہ فونوگراف جسے ایڈی گراف کہا جاتا ہے ایڈیسن نے اُسے روانہ نہیں کیا تھا ذاتی طور پر پیش کیا تھا.. تالستائی جو ہمیشہ اُفق کے پار دیکھنے والا ایک شخص تھا اس نئی ایجاد سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے نہ صرف اپنے کچھ خطوط بلکہ اپنے دو ناول "دے وولف" اور "دے فورس آف چلڈرن" بھی اپنی آواز میں ریکارڈ کروائے.. اور یہ کیا ہی خوشگوار حیرت تھی کہ گوگل پر میں نے تالستائی کی آواز میں "دے وولف" کے کچھ حصے سنے.. آپ کو دلچسپی ہو تو آپ بھی سن سکتے ہیں..

"ہاں" آئرینا نے پھر مجھے متوجہ کیا اور دیوار پر آویزاں ایک شناسا شخص کی تصویر کی جانب اشارہ کیا "چارلز ڈکنز" وہ بھی تالستائی کے مداحین میں شامل تھا اور یہ تصویر اُس نے ذاتی طور پر اُسے بھیجی تھی.. ڈکنز ایک عظیم ناول نگار.."

ڈکنز کو کس نے نہیں پڑھا' میں نے بھی پڑھا ہے لیکن میں کبھی بھی اُس کی پھیکی نثر' افلاس زدہ ماحول اور اُس کے کرداروں سے لطف اندوز نہیں ہو سکا.. تالستائی کی سٹڈی میں اُس کی تصویر مجھے نہیں جچ رہی تھی' اس پر مستزاد یہ کہ آئرینا نے ایک مرتبہ پھر دوہرایا کہ ڈکنز ایک عظیم نثر نگار تو میں نے مسکرا کر کہا "تالستائی کے گھر میں اُس کے سوا اور کوئی عظیم نہیں ہو سکتا" اس پر آئرینا نے سر ہلا کر میری جانب تحسین آمیز بوڑھی آنکھوں سے دیکھا..

اسی کمرے میں سیاہ چمڑے کا ایک بوسیدہ دیوان یا صوفہ تھا اور آئرینا اسے دیکھ کر بھی ذرا وجد میں آ گئی ذرا جھومی اور کہنے لگی "یہ صوفہ.. یہ کوئی عام صوفہ نہیں ہے.. تالستائی اس صوفے پر پیدا ہوا تھا.."

"اچھا" "میری نظر میں بھی اُس صوفے کی اوقات بڑھ گئی.." یعنی وہ کسی بستر وغیرہ پر نہیں ایک صوفے پر پیدا ہوا تھا.."

"ہاں یہ وہی تاریخی صوفہ ہے.. نہ صرف تالستائی بلکہ اُس کا باپ اور دادا.. بھی اسی

صوفے پر پیدا ہوئے تھے.. بلکہ اُس کے سارے بہن بھائی اور گیارہ بچے بھی اسی صوفے پر پیدا ہوئے تھے.. کیا یہ حیرت ناک نہیں ہے.."

"گھر میں کوئی اور صوفہ نہیں تھا جس پر پیدا ہوا جا سکتا"

"صوفے تو تھے لیکن یہ تالستائی خاندان کے لیے ایک خوش بخت صوفہ تھا.. اس لئے جب بھی کوئی بچہ پیدا ہونے لگتا تھا تو حاملہ کو فوراً اس پر لٹا دیتے تھے.. اس صوفے پر پیدا ہونے والوں کے نصیب اچھے ہوتے تھے.."

مجھے تو یہ ایک ناقابل یقین سی بات لگتی تھی کہ تالستائی کی دو تین نسلیں اسی صوفے کی برکت سے وجود میں آئی تھیں "آئرینا.. کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ تالستائی خاندان میں جس حاملہ خاتون کو بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ وقت آن پہنچا ہے تو وہ جہاں کہیں بھی ہوتی تھی بھاگم بھاگ یہاں پہنچتی تھی اور اس صوفے پر لیٹ کر اپنے بچے کے رونے کا انتظار کرنے لگتی تھی.."

"بالکل.. آپ درست کہہ رہے ہیں ایسا ہی ہوتا تھا.."

"لیکن آئرینا.. آپ نے اس گھر میں داخل ہونے سے پیشتر ہمیں بتایا تھا کہ تالستائی جس گھر میں پیدا ہوا تھا وہ اُس نے جوئے میں ہاری ہوئی رقم ادا کرنے کی خاطر فروخت کر دیا تھا اور اُس کے نئے مالک نے اُسے مسمار کر کے ذرا فاصلے پر ایک اور رہائش گاہ تعمیر کر لی تھی تو پھر تالستائی اس گھر میں اور اس صوفے پر کیسے پیدا ہو سکتا ہے"

"آپ بہت باریکیوں میں جاتے ہیں" وہ خوش ہو گئی "تالستائی نے اپنا آبائی گھر جس میں وہ پیدا ہوا تھا فروخت تو کر دیا لیکن اُس گھر کا سارا سامان آرائش اور فرنیچر اس گھر میں منتقل کر دیا گیا تھا یوں یہ تاریخی صوفہ بھی یہاں لے آیا گیا.."

"صحیح" یہ گتھی سلجھنے پر میں نے سر ہلایا "یہ صوفہ نہ ہوتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا' تالستائی خاندان کے بچے جانے کہاں اور کیسے پیدا ہوتے.."

تالستائی ایسا دانشور جو مذہب کو بھی نہیں مانتا اور اپنی آخری رسوم پر کسی مذہبی تقریب کے انعقاد کی ممانعت کر دیتا ہے اور بھی مانتا ہے تو اپنا ایک نیا مذہب ایجاد کر لیتا ہے اور اس کے باوجود اتنا ضعیف العقیدہ ہے کہ گیارہ مرتبہ ہر بچے کی پیدائش کے موقع پر وہ اپنی بیوی صوفیہ کو اس خوش بخت صوفے پر لٹا کر بچے پیدا کرواتا ہے..

"یہ دیکھئے اس کونے میں ٹالسٹائی کی واکنگ سٹک جوں کی توں رکھی ہے وہ سیر کرنے کا بہت شوقین تھا..."

اور اس کمرے کی سب سے اہم اور نایاب شے.. لیو ٹالسٹائی کی ایرانی اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی اُس کی لکھنے کی میز.. جس پر اُس کے زیرِ تصنیف ناول کا مسودہ بکھرا ہوا تھا.. اس میز کے درازوں میں اُس کے متعدد قلم موجود ہیں جن پر سیاہی کے نشان ہیں. پنسلیں' پیپر نائف اور سادہ کاغذ.. وہ کہا کرتا تھا کہ میں اپنا کوئی بھی مسودہ تب تک اشاعت کے لیے نہیں دیتا جب تک کہ مجھے یقین نہ ہو جائے کہ میرے اندر جتنی صلاحیت ہے وہ ساری اُس پر صرف ہو چکی ہے.. اُس نے اپنے ناولوں کے کچھ حصے دس مرتبہ لکھے.. اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اُس نے اپنی تحریر کو تیس مرتبہ تبدیل کیا' میں اس سٹڈی ٹیبل اور اُس کرسی کو جس پر بیٹھ کر ٹالسٹائی لکھا کرتا تھا نہایت مؤدب ہو کر دیکھے جا رہا تھا.

میں نے کسی انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ زندگی میں سب سے زیادہ وفا میرے ساتھ میری سٹڈی ٹیبل اور میرے قلم نے کی.. میرے ہر ہیجان' ہر دھندلے خیال کو.. مسرت اور سوگواری کو اور لمحہ موجود کو اور بیتے ہوئے زمانوں کو.. انہوں نے زبان دی.. جو بھی میں نے لکھنا چاہا ان دونوں نے ہمیشہ مجھ سے وفا کی.. ٹالسٹائی کی سٹڈی ٹیبل نے تو اُس کے ساتھ بہت ہی وفا کی لیکن مجھے ایک خامی کھٹک رہی تھی کہ جس کرسی پر ٹالسٹائی لکھنے کے لیے بیٹھتا تھا وہ بہت چھوٹی تھی.. جیسے بچوں کی کرسی ہوتی ہے.. ایسا کیوں تھا..

"ہاں... آپ بہت باریکی میں جاتے ہیں" آئرینا میری معترف ہوتی جاتی تھی "آپ کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہے.. ٹالسٹائی ایک دراز قامت شخص تھا اور اُس کی نظر خاصی کمزور تھی.. اگر وہ ایک عام کرسی پر بیٹھتا تو میز پر رکھے کاغذ پر زیادہ بلندی سے نگاہ ڈالتا اور اُسے اُن پر جھک کر لکھنا پڑتا جو اُسے تھکا دیتا چنانچہ اُس نے یہ چھوٹی کرسی اس لئے منتخب کی کہ اس پر بیٹھنے سے وہ اپنے مسودے کے اوپر مناسب فاصلے سے نگاہ ڈال سکتا تھا اور اُسے جھکنا نہیں پڑتا تھا."

سٹڈی ٹیبل کی قربت میں شیشے کے ایک شوکیس میں روسی زبان کی کوئی پرانی کتاب کھلی پڑی تھی.. اور زمانے نے اُس کے کاغذ کو بھورا کر دیا تھا..

"اس میز پر بیٹھ کر موم بتی کی روشنی میں.. اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت

ہو جانے سے پیشتر ایک سویر اُس نے اپنی بیوی کو الوداعی خط لکھا تھا.. مجھے معاف کر دینا.. میں جس نوعیت کی پُر آسائش زندگی بسر کر رہا تھا یہ میرے لئے شرمندگی کا باعث ہے.. میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں.. میں اس زندگی کو ترک کر کے کاکیشیا جا رہا ہوں اور میں وہاں کسانوں اور مزدوروں کے ہمراہ اُن کی محرومیوں اور غربت میں شریک ہو کر اپنے بقیہ دن گزاروں گا.. اُس نے یہ خط لکھا اور موم بتی گل کر دی.. گھر کے تمام مکین.. اُس کی بیوی اور بچے گہری نیند میں تھے.. وہ انہیں چھوڑ کر اپنے کوچوان کے جھونپڑے تک گیا اور اُسے جگا کر کہا کہ بگھی میں گھوڑے جوتو اور مجھے ریلوے سٹیشن تک چھوڑ آؤ.. وہ وہاں سے ایک ٹرین میں سوار ہوا اور تیسرے درجے کے ڈبے میں سوار ہوا اور شوئے کینالین کے سٹیشن پر جا اُترا جہاں ایک راہب خانے میں اُس کی ہمشیرہ ایک راہبہ کی زندگی گزار رہی تھی.. وہ وہاں ایک رات ٹھہرا اور پھر اُسے نمونیا ہو گیا اور وہ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں مر گیا.. چھ بج کر پانچ منٹ پر.." آئرینا جس کی نیلی مرجھاتی آنکھوں میں یوں بھی نمی کی ایک جھلی موجود ہوتی تھی یہ قصہ بیان کرتے کرتے آبدیدہ ہونے لگی اور اثر تو مجھ پر بھی ہو گیا..

"وہ وہاں ایک دُور افتادہ سٹیشن پر مر گیا تو اُس کی بیوی کو اُس کی موت کی خبر کیسے پہنچی."

"اس سفر کے دوران اُس کا وفادار اور دوست ڈاکٹر دوشان ماکوٹسکی بھی اُس کے ہمراہ تھا.. اُس نے اطلاع کی اور تب صوفیہ نے اس گھر کے تمام کلاک چھ بج کر پانچ منٹ پر روک دیے.. دوشان ہی ٹالسٹائی کی لاش لے کر یاسنایا پولیانا پہنچا.. اور وہ کمرہ جس میں ڈاکٹر قیام کرتا تھا وہاں اُس کی لاش دیدار کے لیے رکھ دی گئی.. اُس کا آخری دیدار کرنے والوں میں جہاں رُوس کے اہم ترین دانشور اور شاہی خاندان کے افراد تھے وہاں وہ ہزاروں غلام دہقان بھی تھے جن کے لیے وہ ایک مسیحا تھا."

آئرینا کے پُراثر اور دل کی گہرائیوں سے اُمڈنے والے بیان سے محسوس یہی ہوا کہ ٹالسٹائی ابھی ابھی مرا ہے اور ہمیں اُس کی موت کا بہت دُکھ ہوا.

"اور یہ کتاب اُس کی سٹڈی ٹیبل کے برابر میں شوکیس میں جو محفوظ ہے.. وہ ناول ہے جو وہ اُس آخری شب میں پڑھ رہا تھا.. اور ہمیشہ کے لیے چلے جانے سے پیشتر اُس نے اُسے جہاں تک پڑھا تھا اُن اوراق تک کھلا چھوڑ دیا اور چلا گیا.. اور آپ جانتے ہیں یہ کون سا ناول ہے.. دوستوؤسکی کا 'برادرز کرامازوو'.. وہ اُس کا بے حد مداح تھا اور اُس سے بہت متاثر تھا."

اسی سٹڈی میں وہ سیاہ سُوٹ کیس بھی محفوظ ہے جو ٹالسٹائی اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔۔

کبھی کبھار ادب، مصوری یا موسیقی کی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ آتا ہے کہ نابغہ روزگار تخلیق کاروں کی ایک بھیڑ سی لگ جاتی ہے اور یہ طے نہیں ہو پاتا کہ اُن میں سے افضل ترین کون ہے کہ وہ سب کے سب بلند ترین مسند پر بٹھائے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔۔۔ یہ قصہ ایسا ہے کہ بہت طویل ہو جائے گا لیکن ذرا دیکھئے کہ اندلس میں ابن رشد کے زمانے۔۔اطالیہ میں نشاۃ ثانیہ کا دور بیتھووِن اور موزارٹ کا عہد موسیقی۔فرانسیسی تاثراتی مصوری کے چند برس، بڑے غلام علی خان کے زمانوں کے موسیقار اور گوئٹے۔۔ پاکستان میں خواجہ خورشید انور کی دُھنیں۔اُردو ادب میں ایک ہی عہد میں۔۔ پریم چند، بیدی، غلام عباس، شفیق الرحمٰن، منٹو، پطرس اور قرۃ العین حیدر کے زمانے۔۔

اور اب ذرا ٹالسٹائی کے زمانوں پر ایک نظر ڈالئے تو محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق اور سوچ کے حوالے سے جو دھارے پھوٹے۔۔جو ادب اور دنیا کو بدل دینے والے فلسفی بہت نامور ہوئے وہ کسی اور زمانے میں کیا ہوں گے، اور ان تاریخی واقعات کو ملاحظہ کیجئے جو ٹالسٹائی کے زمانوں میں ظہور پذیر ہوئے۔۔

فیودور دوستوفسکی کو تمبر سازش میں شریک ہونے کے جرم میں سزائے موت ملتی ہے اور پھر معافی ملتی ہے۔۔

سائبیریا میں قید ہونے کے دوران وہ ناول "سفید راتیں" لکھتا ہے۔۔

ٹالسٹائی سینٹ پیٹرز برگ میں ترگنوف سے پہلی مرتبہ ملتا ہے۔۔

ترگنوف کے ناول "رودین" کی اشاعت ہوتی ہے۔۔

ٹالسٹائی طیش میں آ کر ترگنوف کو ذاتی مبارزت یعنی ڈوئل کا چیلنج دیتا ہے کیونکہ اُس کے تعلقات اُس کی ہمشیرہ ماریا سے ہیں۔

لندن میں کارل مارکس فرسٹ انٹرنیشنل کا قیام بروئے کار لاتا ہے۔۔

ٹالسٹائی کے ناول "وار اینڈ پیس" کے حصہ اوّل کی اشاعت ہوتی ہے۔۔

دوستوفسکی کے ناول "کرائم اینڈ پنشمنٹ" "ایڈیٹ" اور "دے ڈیولز" شائع ہوتے ہیں۔۔

ٹالسٹائی کا "آنا کرینینا" شائع ہوتا ہے۔اور وہ کریمیا کے سفر کے دوران گوشت خوری، شراب نوشی، تمباکو نوشی اور شکار سے تائب ہو جاتا ہے۔۔

گورکی اور چیخوف اپنے بہترین ناول لکھ رہے ہیں۔۔

راسپوٹین شاہی خاندان کو اپنی سحر انگیز شخصیت میں گرفتار کر رہا ہے۔۔

ٹالسٹائی کو رُوسی آرتھوڈوکس چرچ سے مرتد قرار دے کر خارج کر دیا جاتا ہے۔

ٹالسٹائی 20 نومبر 1910ء میں ایک دُور افتادہ سٹیشن پر لاوارث مر جاتا ہے۔۔

چنانچہ موت سے پیشتر اُس رات جو اُس کے گھر میں اُس کی آخری رات تھی وہ دوستوفسکی کا ناول "برادرز کرامازوو" پڑھ رہا تھا۔۔

اُن دونوں میں سے وہ کون ہے جسے دنیا کا عظیم ترین ناول نگار قرار دیا جا سکتا ہے؟۔ اس کا فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا۔ فیصلہ صرف یہ ہو چکا ہے کہ اگر ٹالسٹائی ایک عظیم رزمیہ نگار ہے تو دوستوفسکی ایک عظیم المیہ نگار۔۔ان دونوں کا تقابل جائز نہیں۔۔

میں نے انگلستان، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں یہاں تک کہ اطالیہ اور ہسپانیہ میں بھی جاگیرداروں اور شاہی خاندان سے متعلق افراد کے گھر دیکھے ہیں لیکن اُن کے مقابلے میں ٹالسٹائی کا یہ گھر نہایت معمولی تھا۔۔ بے شک وہ ایک کاؤنٹ تھا اور اُس کی زمینوں اور مزارعوں کا کوئی انت نہ تھا لیکن اُس کے گھر میں کچھ بھی شاہانہ یا شاندار نہ تھا۔ نہایت معمولی تھا۔۔اور میمونہ مسلسل نکتہ چینی کر رہی تھی کہ ٹھیک ہے اس گھر کے اردگرد سیبوں کے باغ ہیں اور برچ اور دیودار کے جنگل ہیں لیکن اس کے کمرے تو ہمارے مختصر گھر کے کمروں سے بھی مختصر ہیں۔اور ٹالسٹائی کی خواب گاہ میں داخل ہو کر تو وہ بہت ہی مایوس ہوئی۔ اُسے بستر پر بہت اعتراض تھا کہ یہ اتنا چھوٹا ہے کہ ٹالسٹائی اپنی دراز قامتی کے ساتھ جانے اس پر کیسے لیٹتا ہو گا۔ اگر لیٹ جاتا ہو گا تو کروٹ بدلنے سے وہ یقیناً بستر سے گر جاتا ہو گا تو یہ بستر اتنے مختصر کیوں ہیں۔"

"کیونکہ رُوس میں سردی بہت ہوتی ہے۔"

"سردی کا بستروں سے کیا تعلق۔۔ بھلا وہ اتنے چھوٹے سے بستر پر اپنی بیوی کے ساتھ کیسے سوتا ہو گا۔"

"اتنے چھوٹے اور مختصر بستروں کے فوائد ہوتے ہیں رُوسی سردیوں میں مونا بیگم۔۔ ان پر دو شخص سوئیں گے تو پہلو بہ پہلو تو نہ سوئیں گے۔۔ جیسے سوئیں گے وہ تم جانتی ہو۔"

مونا نے دوبارہ نہیں پوچھا کہ یہ بستر اتنے مختصر کیوں ہیں۔۔

خواب گاہ کے دروازے کی چوکھٹ کے برابر میں ٹالسٹائی کا سفید اونی لبادہ لٹک رہا تھا.. آخری ایام میں یہ سادہ سا لبادہ اُس کا دل پسند پہناوا تھا اس لیے بھی کہ وہ اس میں ایک دہقان دکھائی دیتا تھا.. ایک زمانہ ایسا آیا کہ نوجوان نسل میں جو بھی جمہوریت پسند ہوتے تھے اور مذہب فلسفے اور سماجی بہبود کے حوالے سے ٹالسٹائی کے نظریات سے اتفاق کرتے تھے اسی قسم کے لبادے پہنتے تھے اور ان لبادوں کو ''ٹالسٹووکاس'' کہا جاتا تھا..

سٹڈی ٹیبل کے بعد اس لبادے نے میری پوری توجہ حاصل کر لی.. میں اُس کے قریب ہو کر اُس میں موجود کسی مہک کا متلاشی تھا.. ''آئرینا کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اس لبادے کی آستین کو اپنے ہاتھوں سے چھو لوں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ اس گھر میں کسی شے کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔''

اُس سٹڈی میں بھی ایک کرخت چہرے والی موٹی پہریدار خاتون تعینات تھی..

''آپ میری طرف سے اس خاتون کو درخواست تو پیش کر دیجیے.. اسے بتائیے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور بہت دُور سے صرف اسی لیے آیا ہوں کہ اپنے اُستاد کا لبادہ چھو سکوں..''

آئرینا نے پہریدار خاتون سے رجوع کیا اور میرے بارے میں جانے کیا کیا سرگوشیوں میں اُس کے کان میں پھونکا کہ وہ مسکرانے لگی اور وہ جان بوجھ کر منہ پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی کہ چلو جو کرنا ہے کر گزرو۔

میں نے آگے بڑھ کر اُس دہقانی لبادے کی آستین کو چھوا.. جہاں باباجی کے ہاتھ ہوا کرتے تھے جو ''وار اینڈ پیس'' لکھا کرتے تھے.. اور مجھے اُس لمحے پروین شاکر یاد آ گئی اُسے دفن کرتے ہوئے قبر میں اُتارتے ہوئے جب افتخار عارف نے اپنے دل میں ایک گھبراہٹ سی محسوس کی تو میں نے آگے بڑھ کر کفن میں لپٹی پروین کو تھام لیا اور میرا ہاتھ اُس کی مردہ انگلیوں سے مس ہونے لگا اور میں بھی نروس ہو گیا کہ وہ انہی انگلیوں سے شاعری لکھا کرتی تھی... میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک عجیب سرد سنسناہٹ تیرتی گئی..

کچھ ایسے ہی ٹالسٹائی کے لبادے کی آستین چھوتے ہوئے میں نے اُس کی انگلیاں محسوس کیں..

اس دوران مونا ٹالسٹائی کے بستر پر جو پھول بوٹوں کی کڑھائی والا دیسی سا تکیہ تھا اُسے

قریب ہو کر دیکھ رہی تھی..

آئرینا جو کہیں اور تھی مونا کی نظروں کا تعاقب کرتی اُڑتی ہوئی تکیے تک پہنچ گئی ''نہ صرف میز پر بچھی چادر بلکہ اس تکیے کا غلاف بھی اُس کی بیوی صوفیہ نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا۔''

''میں اسے ہاتھ لگا کر دیکھ لوں..''

آئرینا گھریلو عورتوں کی نفسیات سے خوب واقف تھی اُس نے ذرا شرارتی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا ''لبادے کے بعد یہ پہریدار خاتون ٹالسٹائی کے تکیے کو ہاتھ لگانے کی ہرگز اجازت نہ دے گی... یوں کرتے ہیں کہ'' اُس نے ذرا آگے ہو کر مونا کو روپوش کر دیا ''یوں کہ پہریدار خاتون یہ نہ جان سکے کہ وہاں کیا کارروائی ہو رہی ہے اب ہاتھ لگا لیں.. ذرا جلدی سے..''

مونا نے نہایت اطمینان سے ٹالسٹائی کے تکیے کو نہ صرف ہاتھ لگایا بلکہ خوب تھپک تھپک کر یہ اندازہ بھی لگایا کہ اس کے اندر روئی کتنی ہے اور پھر اُس پر کاڑھے ہوئے بیل بوٹے نہایت غور سے دیکھتے ہوئے کہا.. ''تکیوں کے اس سے زیادہ نفیس کاڑھے ہوئے غلاف تو لاہور کے اچھرے میں عام مل جاتے ہیں..''

مونا میں ایک نہایت قابل اعتراض عادت تھی.. اُس نے طے کر رکھا تھا کہ ممالک غیر میں کسی شے سے متاثر نہیں ہونا.. اور یہ ثابت کرنا ہے کہ پاکستان میں وہی شے اس سے کہیں بہتر میسّر ہے.. وہ جدہ میں ہو نیویارک یا ماسکو میں اُس کا یہی وتیرہ تھا.. خوراک' لباس' چہرے' آب و ہوا... سب پاکستان پاکستان.. اور اکثر اوقات اُس کا مشاہدہ درست بھی ہوتا تھا لیکن یہاں وہ کاؤنٹ ٹالسٹائی کے کاؤنٹیس صوفیہ کے کاڑھے ہوئے تکیے کو اچھرے کے تکیوں سے کمتر ثابت کرتے ہوئے قدرے زیادتی کر رہی تھی.. پھر اُسے خود ہی کچھ خیال آیا اور کہنے لگی ''نہیں.. میں یونہی مذاق کر رہی تھی' یہ کڑھائی تو بہت ہی نفیس اور نازک ہے.. ویسے دوہرا ٹانکہ لگا ہوا ہے۔''

میں قدرے نروس ہو رہا تھا کہ اگر پہریدار خاتون نے مونا کو ٹالسٹائی کے تکیے کے ساتھ یوں اٹکھیلیاں کرتے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ شرمندگی ہو گی ''اب اسے رکھ بھی دو۔''

''میں ذرا اس کی کڑھائی حفظ کر رہی ہوں تاکہ پاکستان واپس جا کر ایک ایسی ہی کڑھائی والا تکیہ بنا کر آپ کے بستر پر رکھ دوں.. تاکہ آپ کو شکایت نہ ہو۔''

''کیسی شکایت..؟''

جب سے ہم اس گھر میں داخل ہوئے تھے میں میمونہ کے ساتھ عاشقانہ تو نہیں شکایتانہ چہلیں کیے جا رہا تھا کہ دیکھو مونا اس کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر کیسا سہانا ہے' برچ کے درختوں سے بھرا ہوا ایسا منظر میری کھڑکی میں بھی ہوتا تو میں بھی یقیناً ٹالسٹائی سے کم ناول نگار نہ ہوتا.. اور اگر میری بیوی بھی اتنی کمسن اور خوبصورت ہوتی تو.. اور میرے گھر کے گرد بھی اگر سیبوں کے باغ مہکتے تو.. اور میں نے پوچھا کہ کیسی شکایت تو اُس نے وہ چھوٹے بستر والی بات کا بدلہ لیا" یہی کہ مونا میں ٹالسٹائی ایسے ناول اس لئے نہ لکھ سکا کہ میرے بستر پر میری بیوی کے ہاتھوں کا کاڑھا ہوا تکیہ نہ تھا۔" مونا نے ایک اور وار کیا.. کہ جب وہ زہری ہوتی ہے اور صرف میرے ساتھ ہوتی ہے تو اُس کے کاٹے کا پانی نہیں مانگتا..

خواب گاہ کے ایک کونے میں رکھے پورسلین کے جگ اور لکڑی کے ایک سٹینڈ میں نصب ایک پورسلین کے ہی پیالے کی جانب آئرینا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا" آپ اُن زمانوں کی سختیاں نہیں جان سکتے.. ٹالسٹائی صبح بیدار ہوتا تھا تو اکثر ٹھنڈے پانی کے ساتھ منہ ہاتھ یہیں دھوتا تھا.. شیو وہ کرتا نہیں تھا کہ داڑھی رکھی ہوئی تھی.. اور ٹائلٹ گھر سے باہر ہوا کرتے تھے اُسے سردی میں بھی وہیں جانا پڑتا تھا.. اور فلش سسٹم کا بھی بندوبست نہیں ہوا کرتا تھا.. سنٹرل ہیٹنگ کی آسائش بھی نہیں تھی اور کوئلے کی انگیٹھی اور آتش دان پر انحصار کرنا پڑتا تھا.. بجلی بھی نہیں تھی چنانچہ موم بتی کی ناکافی روشنی میں ہی لکھنا پڑتا.. اور لکھنے کے لیے بھی قلم دوات کا استعمال ہوتا تھا.. یہ آسائشیں تو بہت دیر بعد لوگوں کے نصیب میں آئیں۔"

اور مونا نے یہ بیان سن کر ایک اور وار یہ کیا کہ.. چلو ہمارے گھر کی کھڑکی میں سے ایسے منظر دکھائی نہیں دیتے.. سیبوں کے باغ بھی نہیں ہیں اور تمہاری بیوی اتنی کمسن اور خوبصورت نہیں ہے (دراصل اس کومنٹ کی بنا پر وہ زہری ہو رہی تھی)۔ یہ سب کچھ تو میسر نہیں ہے لیکن ٹالسٹائی کی پیروی کرتے ہوئے آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ اٹیچڈ باتھ روم کو ترک کر کے کمرے میں رکھی بالٹی کے پانی سے منہ ہاتھ دھوئیں' پھر لوٹا اُٹھا کر گھر سے نکل جائیں.. رات کو ایئر کنڈیشنر نہ چلائیں اور بجلی بند کر کے ایک موم بتی کی روشنی میں لکھیں.. اور وہ قلم دوات کے ساتھ... پھر آپ کتنی آسانی سے ٹالسٹائی ہو جائیں گے۔"

بیویوں کی کمینگی کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی..

آئرینا نے اپنے علم کے سب دروازے ہم پر کھول دیے تھے..

ان دروازوں کے کھلنے کا ایک سبب تو وہ ایک ہزار رُوبل تھے جو اُس کی رہنمائی کے عوض طے پا چکے تھے' اور دوسرا اور اہم سبب یہ تھا کہ وہ مجھے جانے کس پائے کا ادیب سمجھ بیٹھی تھی اور وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ آج تک میری معلومات کے مطابق یہاں کوئی پاکستانی لکھنے والا نہیں آیا اور ایک ایسا لکھنے والا جو ٹالسٹائی کا نہ صرف مداح ہو بلکہ اُسے اپنا گورو مانتا ہو.. اور اگر آپ وطن واپسی پر یاسنایا پولیانا کی اس ملاقات کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کریں تو وہ تحریر مجھے ضرور روانہ کیجیے گا.. تاکہ میں اُسے ٹالسٹائی میوزیم کی لائبریری میں محفوظ کر لوں۔ اور یہ اُردو میں یاسنایا پولیانا کے بارے میں پہلی تحریر ہو گی جو ہمارے میوزیم میں جگہ پائے گی.. ویسے آپ کی اطلاع کے لیے ان دنوں ٹالسٹائی میوزیم کے جو انچارج ہیں وہ بھی ایک ٹالسٹائی ہیں اور لیو کے رشتے دار ہیں"

ابھی تک تو میرا مصمم ارادہ یہی ہے کہ بہ شرط زندگی میں اپنا یہ سفرنامہ جب کتابی صورت میں شائع ہو گا تو اس کی پہلی کاپی آئرینا کو روانہ کروں گا.. کیا یہ اعزاز کم ہے کہ میری تحریر جیسی کیسی بھی ہے ٹالسٹائی میوزیم میں محفوظ ہو جائے کہ آج سے سینکڑوں برسوں بعد میرا نام و نشان نہ ہو گا لیکن ٹالسٹائی کا نام بھی ہو گا اور سب نشان بھی.. اور تب شاید کسی محقق کی نظر کے سامنے میری یہ تحریر آ جائے اور وہ جان جائے کہ اس نام کا ایک پاکستانی ادیب صدیوں پہلے یاسنایا پولیانا میں آیا تھا..

خواب گاہ کے بعد ہم چند سیڑھیاں اُتر کر ایک نیم تہہ خانے میں پہنچے.. جس کی مختصر چوکور کھڑکیاں چھت کے قریب تھیں اور باہر جو ہریاول اور گل و گلزار تھے' گل لالہ اور نرگس تھے یہ تقریباً اُن کی سطح پر تھیں.. یہ تقریباً اُسی طرز کا ایک نیم تہہ خانہ تھا جو پرانے وکٹورین گھروں میں ہوتا تھا اور سردیوں کے لیے کوئلہ سپلائی کرنے والا گھر کے اندر جانے کے بجائے لان کی سطح پر کھلتے روشن دان کے راستے کوئلے کی بوریاں دھکیل دیتا تھا.. یہ کمرہ جو محراب دار چھت والے کمرے کے نام سے جانا جاتا ہے بنیادی طور پر ایک سٹور تھا اور یہاں صرف گھریلو ملازموں کا آنا جانا ہوتا تھا.. ٹالسٹائی کو اس کی خاموشی اور گھر سے الگ تھلگ تنہائی اتنی پسند آئی کہ اُس نے اسے ایک سٹڈی کا رُوپ دے دیا.. یہاں دیواریں اتنی دبیز تھیں کہ باہر کی آوازیں بھی اس کے سناٹے میں مخل نہیں ہو سکتی تھیں.. اگرچہ یہ ایک نہایت سرد آماجگاہ تھی لیکن صرف ایک سٹوو کے جلانے سے اس کی

پتھریلی دیواریں جب گرم ہو جاتی تھیں تو ایک نہایت آرام دہ اور حدت بھرا ماحول تخلیق ہو جاتا تھا.. ٹالسٹائی کے ہم عصر اسے ایک راہب کی کوٹھڑی سے تشبیہ دیتے تھے.. یہ محراب دار چھت والا کمرہ بیس برس تک اُس کی مطالعہ گاہ کے طور پر استعمال ہوا... 1910ء میں یہاں ٹالسٹائی کی سب سے چھوٹی بیٹی الیگزانڈرا قیام پذیر تھی' اُس کی ہمراز اور دوست اور سب سے لاڈلی.. 28 اکتوبر کو جب وہ یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا تھا تو رخصت ہوتے ہوئے وہ صرف الیگزانڈرا کو ملا اور اسی کمرے میں آ کر آخری ملاقات کی اور چلا گیا..

''کیا آپ جانتے ہیں کہ ٹالسٹائی نے ''وار اینڈ پیس'' کا پہلا باب اسی محراب دار چھت والے کمرے میں لکھا تھا'' آرینا پھر رواں ہو گئی..

''آپ ہمیں کوئی ایسا کمرہ بھی دکھا دیجیے جس میں اُس نے ''وار اینڈ پیس'' نہ لکھی ہو..'' مجھے شرمندگی ہے لیکن میں اس ''وار اینڈ پیس'' سے قدرے بیزار ہونے لگا تھا..

وہ مسکرانے لگی ''بہر طور اس ناول کا آغاز اُس نے اسی کمرے میں کیا تھا.. اور یہاں کی مکمل تنہائی میں وہ ان چوکور کھڑکیوں میں بیک یارڈ میں کھلے پھول اور گھنے درخت دیکھ سکتا تھا..''

''لیکن آرینا یہ کھڑکیاں تو چھت کے قریب ہیں' میز پر بیٹھے ہوئے اُسے ان میں سے پھول اور درخت وغیرہ کیسے نظر آتے تھے..''

''ہا..'' آرینا فتح یاب ہو گئی ''آپ بے شک بہت باریکیوں میں جاتے ہیں لیکن آپ کو یاد نہیں رہا کہ ٹالسٹائی کتنا دراز قامت تھا.. وہ دیکھ سکتا تھا..''

''اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہو گا ورنہ وہ کوئی زرافہ تو نہیں تھا..'' یہ فقرہ مونا نے کہا اور شکر ہے اُردو میں کہا اور نہ آرینا کو بہت صدمہ ہوتا..

ہاں یہاں ایک راہب کی کوٹھڑی والا سکون اور ایک سوگواری تھی..

''اور ہاں..'' آرینا حسب عادت میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی ''ٹالسٹائی نے اپنے ناول ''آنا کرینینا'' میں جہاں اپنے ڈاکٹر دوست کے کمرے کو بیان کیا ہے وہاں اس محراب دار چھت والے کمرے کا بھی تفصیلی نقشہ کھینچا ہے..''

''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے اپنے ناولوں میں گھر سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور یہاں کے تمام کمروں کو اپنے کرداروں سے بھر دیا ہے..''

تب آرینا نے کیا پتے کی بات کی.. ''ایک ادیب کے آس پاس جو ہوتا ہے' جہاں وہ زندگی کرتا ہے وہ اُسے ہی بیان کرتا ہے..''

اس سٹڈی میں ایک راکنگ چیئر بھی تھی.. لکھتے لکھتے تھک جاتا تو اس میں بیٹھ کر اپنے آپ کو جھلاتا رہتا..

''اور ہر ادیب اپنے مزاج کے مطابق لکھنے کے وقت کا تعین کرتا ہے.. ٹالسٹائی ہمیشہ صبح سویرے اُٹھ کر اپنے مسودوں پر کام کرتا تھا' رات کو بہت کم لکھتا تھا جب کہ دوستووسکی صرف رات کے وقت لکھتا تھا اور پوری پوری رات لکھتا رہتا تھا.. آپ بھی تو ناول نگار ہیں آپ کس وقت لکھتے ہیں؟'' آرینا کے مرجھاتے لبوں میں سے یہ پہلا فقرہ تھا جو ٹالسٹائی کے بارے میں ادا نہ ہوا اور پہلا ذاتی سوال تھا جو اُس نے مجھ سے کیا.. ''میں صبح سویرے اُٹھ کر تو ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا.. دن کے وقت ایسی تحریریں لکھ لیتا ہوں جن میں تخلیق اور سوچ کا عنصر قدرے کم ہوتا ہے.. اخباری کالم یا ڈرامے وغیرہ.. لیکن سفرناموں اور ناولوں کے لیے مجھے رات چاہیے..''

اُس تہہ خانے میں سے نکلے اور چند سیڑھیاں طے کر کے پہلی منزل پر واقع اُس کمرے میں آئے جو اُس کے سیکرٹری کی رہائش گاہ ہوا کرتا تھا.. سیکرٹری کا فرض ہوتا تھا کہ وہ مسودوں پر کام کرے اور ٹالسٹائی کے نام آنے والے خطوط اور ٹیلی گراموں کے جواب دے.. ظاہر ہے وہ خطوں کے جواب خود سے نہیں لکھتا تھا' ٹالسٹائی اُسے لکھواتا تھا.. وہ ٹائپ رائٹر موجود تھا جو اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا ہینڈ پریس بھی تھا جس پر تمام خطوط کی نقلیں تیار کی جاتیں.. یہی وجہ ہے کہ ٹالسٹائی میوزیم میں اُن سینکڑوں خطوط کی کاپیاں موجود ہیں جو اُس نے اپنے دوستوں' مداحوں اور ہم عصر ادیبوں کو لکھے.. خطوط نویسی بھی اُس کا ایک خبط تھا..

ہم پورے گھر کی زیارت مکمل کر کے گھومتے پھرتے اُسی لائبریری میں اُتر گئے جہاں سے ہمارا سفر شروع ہوا تھا.. اور یہاں آرینا نے ایک نیم سوختہ دیوار کی جانب ہماری توجہ مبذول کروائی ''یہ آثار اُس آگ کے ہیں جو نازیوں نے لگائی تھی.. آپ واقف ہوں گے کہ وہ فاشسٹ رُوس میں داخل ہو کر ٹولا کے شہر تک آ گئے تھے.. اور جب اُن کی فوجیں ادھر ٹالسٹائی کی ریاست یاسنایا پولیانا کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھیں تو سوویت افواج نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ٹالسٹائی کے گھر میں جتنی اشیا بھی نمائش پر تھیں اُنہیں پیک کر کے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا لیکن

اس کے باوجود سو کے قریب یادگار اشیاء ضائع ہو گئیں.. جرمن فوج پورے پینتالیس دن یاسنایاپولیانا پر قابض رہی اور اس دوران اُنہوں نے گھر کے ایک حصے کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش بھی کی جس کے شواہد آپ دیکھ رہے ہیں.. اور پھر... ہماری عظیم سوویت آرمی نے صرف پینتالیس دن کے اندر اندر جارحیت کے مرتکب نازیوں کو شکست دے کر یہاں سے نکال دیا.. یہ ایک عظیم کارنامہ تھا.''

میں نے نوٹ کیا کہ جب بھی آرینا ''ہماری عظیم سوویت آرمی'' کہتی ہے تو واضح طور پر اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے.. اُن میں ایک جذبۂ تفاخر اور عزتِ نفس کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں.. وہ اب تک اُنہی زمانوں میں سانس لیتی ہے اور عہدِ حاضر کی جو نئی ہوا چل رہی تھی اُس میں وہ سانس لینا پسند تو نہ کرتی تھی پر کیا کرے زندہ تو رہنا تھا.. جیسے اُس نے سوویت زمانوں کے چھپے ہوئے کارڈ اور تصویریں سنبھال رکھی تھیں ایسی یادیں بھی سنبھال رکھی تھیں..

گھر سے باہر آئے تو کچھ رنج ہوا.. ہم گزر چکے زمانوں کی قدامت کی مہک کے اندر چلے گئے تھے.. اُن کے سکون اور تنہائی کی عادت سی ہو گئی تھی.. بلکہ ٹالسٹائی کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی.. اب باہر آئے تو وہاں سیاحوں کا شور تھا.. رُت بدل چکی تھی اور سیبوں کے باغوں میں جو پرندے بولتے تھے اُن کی آواز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی... ہم نے برآمدے میں جا کر اپنے بوٹوں کو چرمی پیتاووں سے آزاد کیا..

''اور اب آپ اطمینان سے کہ یہاں کوئی نہیں ہے اس برآمدے میں کھڑے ہو کر اپنی تصویریں اُتروا سکتے ہیں جس کے تختے ٹھونکتے ہوئے ٹالسٹائی نے اپنی اُنگلیاں زخمی کر لی تھیں اگرچہ وہ ایک کمال کا بڑھئی تھا..''

ٹالسٹائی کو نہ صرف جوتے بنانے اور گانٹھنے کا خبط تھا بلکہ وہ لکڑی کے کام کا بھی شیدائی تھا اور ایک خاصا ہنرمند ترکھان تھا..

ہمارے ہاں ایسی ہنرمندی کو عام لوگ بھی کمتری کی دلیل سمجھتے ہیں اور ادیب حضرات تو اسے ہرگز اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے.. البتہ اشفاق احمد کو یہ ہنرمندی سیکھنے کا بہت شوق تھا.. وہ لوہارے ترکھانے کام کے شیدائی تھے.. وہ میرے اباجی کے دوست تب تھے جب میرا ادب کے ساتھ کچھ واسطہ نہ تھا.. وہ اکثر ہماری بیجوں کی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' میں آیا کرتے تھے اور اباجی

کے ساتھ سبزیوں اور پھولوں کی کاشت کی گفتگو کے علاوہ دیر تک گپ لگایا کرتے تھے.. اور مجھے یاد ہے کہ وہ اُن دنوں اندرون شہر پہلے تو خلیفے کے کباب کھایا کرتے تھے اور پھر کسی بڑھئی سے لکڑی کا کام سیکھنے کے لیے جایا کرتے تھے.. اُنہوں نے اپنے گھر میں بھی ایک ترکھان شاپ قائم کر رکھی تھی جہاں وہ رندہ چلاتے رہتے تھے..

ہم نے اُس برآمدے میں اسی جگہ کھڑے ہو کر تصویریں اُتروائیں جس مقام پر آج سے سو برس پیشتر ٹالسٹائی کھڑا تھا اور دہقانوں اور اُن کے بچوں کے ساتھ ایک تصویر اُترواتا تھا..

میں نے آرینا کی متعدد بار عطا کردہ برآمدے میں کھڑے بوڑھے ٹالسٹائی کی تصویر کو اپنے سامنے رکھا' اُس برآمدے کو سامنے دیکھا اور موازنہ کیا.. وہ جوں کا توں تھا صرف چھت کے کنگرے نہیں تھے.. اور ہاں ذرا غور کرنے پر کھلا کہ حضرت اس تصویر میں وہی چوغہ زیبِ تن کیے ہوئے ہیں جس کی آستین کو میں نے ابھی ابھی چھوا تھا..

ٹالسٹائی نے اس برآمدے کی ریلنگ بنانے کے لیے لکڑی کے تقریباً 3x1½ فٹ تختوں کو پہلے تو خوب رندہ لگایا.. پھر اُن میں آری کے ساتھ ایسے ٹکڑے کاٹے جو کہیں گول اور کہیں لمبوترے تھے اور یوں اُن پر کہیں پرندے.. کہیں ایک گڑیا اور کہیں ایک گھوڑا نمودار ہوتے تھے.. یہ شبیہیں اور گل بوٹے تختوں میں چھیدے گئے تھے.. اور اس بڑھئی شوق میں اُس نے اپنی انگلیاں زخمی کر لیں..

تصویریں بنوا کر جب ہم کھلے آسمان تلے آئے تو ایک ہلکی پھوار اُتر رہی تھی..

ٹالسٹائی کے گھر سے ایک راستہ جنگلوں کی جانب جاتا تھا اور وہاں' پھوار میں بھیگتی نکھرتی ہریاول اور جڑی بوٹیوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا سفید پتھر نمایاں ہو رہا تھا جس پر کندہ تھا کہ کبھی یہاں وہ گھر ہوا کرتا تھا جہاں ٹالسٹائی پیدا ہوا تھا..

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ٹالسٹائی نے اپنے آبائی گھر کو جوئے میں ہاری ہوئی رقم ادا کرنے کی خاطر فروخت کر دیا تھا اور نئے مالک نے اُسے مسمار کر کے ذرا فاصلے پر ایک نئی رہائش گاہ تعمیر کر لی تھی اور اب یہاں صرف ایک پتھر تھا جو کبھی اُس گھر کی دیواروں میں نصب تھا..

ایک دوراہا آ گیا چلتے چلتے جہاں منزل کی نشان دہی کرنے والی دو تختیاں آویزاں تھیں..

ٹالسٹائی کی قبر..

ٹالسٹائی کا بیچ..اس جانب

یہاں پہنچ کر ہم نے آرینا سے رخصت ہونا چاہا پر وہ رخصت نہ ہونا چاہتی تھی. وہ ایک بے ضرر سرگوشیاں کرتی اور برگزیدہ رُوح تھی اور اُس نے جس تفصیل سے ٹالسٹائی کی حیات کے گوشوں کو منور کیا تھا' اُس کے گھر کی ایک ایک شے کی اہمیت بیان کی تھی اور کوئی گائیڈ اتنی تفصیل فراہم نہ کر پاتا. کوئی اور گائیڈ ٹالسٹائی کی محبت میں گرفتار ہوتا تو ایسا کر پاتا..

اُس نے خاصا اصرار کیا کہ میں آپ کی بہت قدر کرتی ہوں کہ آپ اتنی دُور سے لیو کے گھر آئے اور ایک ادیب کی حیثیت سے آپ نے جیسے اُس کی ذاتی اشیاء سے تقدس کا رشتہ جوڑا اور ایسے سوال پوچھے جو مجھ سے کبھی نہ پوچھے گئے تھے کہ اس کی سٹڈی ٹیبل کی کرسی اتنی چھوٹی کیوں ہے اور چھت کی قربت میں واقع چوکور کھڑکیوں میں سے وہ باہر کا منظر کیسے دیکھ سکتا تھا. اور آپ نے اُس کا لبادہ چھوا تو گویا میرے دل کو چھو لیا.. آپ نے مجھے ادائیگی کر دی ہے لیکن میں ایک رفیق کی حیثیت سے آپ کا ساتھ دے سکتی ہوں یوں بھی آج میری چھٹی ہے اور مجھے اور کوئی کام نہیں.. ہم نے پھر بھی اُس سے اجازت چاہی کہ اب ہم قدرے آزاد ہو کر مزید معلومات سے چھٹکارا حاصل کر کے ٹالسٹائی کے باغوں اور جنگلوں میں گھومنا پھرنا چاہتے تھے..

اس کے باوجود وہ کچھ دُور تک ہمارے ہمراہ چلی آئی کہ میں کم از کم آپ کو اُس مقام تک تو لے جاؤں جہاں سے ٹالسٹائی کے بیچ اور اُس کی قبر کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں.

اور یہ راستہ بھی ایسا تھا جسے مجید امجد نے راہ کا سہانا پن کہا.

تو نے' ہم سفر دیکھا
صبح کے اُجالے میں
راہ کا سہانا پن!
دائیں بائیں دُور رویہ
شادماں درختوں کی
جھومتی قطاریں ہیں..

دائیں بائیں دُور رویہ برچ کے سفید تنے اور سیاہ شاخیں آسمان کو اُٹھتی آپس میں اُلجھتی تھیں.. اور درمیان میں ایک چوڑا کچا راستہ جس کی مٹی پر جو بارش برس چکی تھی وہ اُسے نرم اور پھسلواں کرتی تھی..

خاصی دُور تک چلتے گئے.. اُن ہرے بھرے جنگلوں اور کناروں پر اُمڈتی اُلجھتی ہریاول کے درمیان چلتے گئے..

اور پھر وہ مقام آیا جہاں سے ٹالسٹائی کے بیچ اور قبر تک جانے والے راستے جدا ہوتے تھے..

"میں آپ کو یہ تو بتادوں کہ یہ سامنے "محبت کا درخت" ہے" آرینا نے جیسے ایک عجب اُداسی کی گرفت میں آ کر اپنے آپ سے سرگوشی کی..

اور سامنے.. دوراہے پر جو درخت بلند ہو رہا تھا وہ ایک نہ تھا' دو تھے.. اُن دونوں کے تنے آپس میں لپٹے ہوئے ایک ہو رہے تھے.. ہم آغوش تھے اور انہیں جدا نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ گرمی میں آئے ہوئے سانپوں کی مانند ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے..

"ان میں سے ایک برچ ہے اور دوسرا شاہ بلوط کا.. ٹالسٹائی کے زمانے میں یہ چھوٹے چھوٹے تھے اور جانے کیسے ان دونوں کے تنے ایک دوسرے میں اُلجھ گئے اور وہ اسی حالت میں بڑے ہوتے گئے."

مجھے یاد آیا کہ بیجنگ کے شہر ممنوعہ کے ایک پوشیدہ سے قدیم شاہانہ باغ میں بھی دو درخت ایسے ہی تھے جن کے تنے آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے اور انہیں بھی "محبت کا درخت" کہتے تھے لیکن وہ دونوں سوکھے ہوئے اور بہت ٹیڑھے میڑھے ہو چکے تھے.

"کیا آپ اپنی خوبصورت اہلیہ کے ہمراہ اس درخت کے ساتھ لگ کر ایک یادگار تصویر نہیں اُتروائیں گے؟"

میں نے بیگم سے درخواست کی کہ محض آرینا کا دل ایک اور مرتبہ رکھنے کی خاطر ایک تصویر اُتروالی جائے تو کیا حرج ہے تو وہ مسکرا کر کہنے لگی "لو اس عمر میں ہم یہ چونچلے کرتے اچھے لگتے ہیں."

اب مجھے کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ بیگم جب عمر تھی تب ہم نے کون سے چونچلے کیے تھے تو

اب کر لیتے ہیں لیکن میں چپ رہا.. ہم نے محبت کے اُس درخت کے ساتھ تصویریں تو اُتروائیں لیکن الگ الگ کیونکہ اس طرح ہم اچھے لگتے تھے جو نچلے جو نہیں کرتے تھے.

بالآخر آزرینا بادل نخواستہ رخصت ہونے پر راضی ہو گئی..

''موسم سرما اس بار کچھ ٹھہر گیا ہے.. ورنہ ان دنوں سیب کے باغ شگوفوں سے لدے ہوتے ہیں اور وہ منظر کچھ اور ہوتا ہے جس میں اُن شگوفوں کی ہلکی مہک تیرتی پھرتی ہے.. اور اُسے ٹالسٹائی کے برآمدے میں بیٹھے محسوس کیا جا سکتا ہے آپ اگلی بار آئیں تو ایسے موسموں میں آئیں.''

''ہم ایسے موسموں میں ہی آئیں گے'' میں نے رسمی طور پر مسکرا کر کہا..

آزرینا کیا جانے کہ جو موسم آنے تھے آ چکے اب ایسے موسم عمر اور نصیب میں نہیں ہیں جب سیب کے درختوں میں شگوفے پھوٹیں گے.. جوگی کے پاس اس نگر میں دوبارہ آ نکلنے کی گنجائش نہ تھی کہ عمر کی نقدی ختم ہونے کے دن آ رہے تھے.

رخصت ہوتے ہوئے آزرینا کی بجھتی نیلی آنکھوں میں ایک اُداسی آئی اور کیا اُن آنکھوں پر نمی کی ایک نامعلوم سی جھلی نمودار ہو چکی تھی کہ مجھے اُن میں ٹالسٹائی کے جنگلوں کی گھنی ہریاول پل بھر کے لیے منعکس ہوتی تھرتھراتی نظر آئی..

یہ طے تھا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی گئے زمانوں کی کوئی شہزادی تھی جو اُس کرشمہ ساز بوڑھے کی محبت میں مبتلا ہو کر اب تک اپنے محبوب کے دیار میں بھٹکتی پھرتی تھی. آج اُس کے نیلے کوٹ کی جیب میں خاصے رُوبل تھے' ہو سکتا ہے وہ ان سے آج شام اپنی من پسند وائن کی ایک بوتل خریدے اور گئی رات ٹالسٹائی کے گھر میں داخل ہو کر وہ موم بتی جلائے جسے موت سے پیشتر ٹالسٹائی نے بجھایا تھا اور پھر اُس کی روشنی میں بیٹھ کر وائن کے گھونٹ بھرتی اپنے محبوب کی موجودگی محسوس کرے اُسے یاد کرے اور اُس کی نیلی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی پر موم بتی کا شعلہ ایک تھرتھراتی تصویر ہو جائے..

پہلے تو ہم خواہش کر رہے تھے کہ وہ اب رخصت ہو چکے لیکن جب وہ اپنے ٹخنوں تک آتے نیلے کوٹ اور سفید اونی ٹوپی میں اُس طویل راستے پر چلتی اوجھل ہو گئی تو ہم اُس کے لیے اداس ہو گئے کہ وہ کیسی غیر متوقع' انوکھی اور محبت بھری قدیم رفاقت تھی..

دوپہر کا کھانا ہم نے محبت کے درخت کے سامنے ایک آہنی بنچ پر براجمان ہو کر کھایا.. اور ہم دونوں نے نہیں بلکہ ہم تینوں نے کھایا.. آنیا حسب معمول بے حد منصوبہ بند.. معلومات حاصل کر چکی تھی کہ یاسنایا پولیانا میں کوئی کیفے یا ریستوران نہیں ہے تا کہ اس کی قدامت پر جدید دھبے نہ لگیں' خوراک کا مناسب بندوبست کر کے ماسکو سے چلی تھی.. سینڈوچ' جوس' کیک اور آلو کے قتلے.. اور وہاں اُن جنگلوں میں گھرے ایک بنچ پر.. ہلکی پھوار کے باوجود یہ ایک یادگار پکنک تھا..

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ایک سگریٹ.. ایک پاکستانی سگریٹ سلگایا' اُن کنوارے جنگلوں کو قدرے آلودہ کیا اور مونا سے کہا ''ہاں بھئی مونا بیگم.. پہلے کدھر چلنا ہے.. ٹالسٹائی کے مشہور زمانہ بنچ کی جانب جو اُدھر کہیں گھنے اشجار کی اوٹ میں ہے یا اِدھر جو کیا ہی پُرفضا کچا راستہ اُس کی قبر تک جا رہا ہے..''

''بنچ کو چھوڑ نہ دیں..'' صرف مونا ہی نہیں بلکہ میں بھی تھکاوٹ کا شکار تھا ''اُس کی قبر ہی کافی ہو گی..''

''ہم نے دوبارہ اِدھر کہاں آنا ہے.. ذرا ہمت کرتے ہیں.. آہستہ آہستہ چل لیں گے..''

''تو پھر پہلے قبر دیکھ لیتے ہیں اور پھر بنچ کی جانب چلے جائیں گے..''

''نہیں' مجھے معلوم ہے ہم قبر تک جا کر جب واپس یہاں تک آئے تو اتنے نڈھال ہو چکے ہوں گے کہ بنچ دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیں گے.. اور اگر ہم پہلے بنچ کا سفر کر لیں تو نڈھال ہونے کی صورت میں بھی اپنے آپ پر جبر کر کے قبر تک ضرور جائیں گے.. اس لیے پہلے بنچ..''

ہم بنچ تک جانے والے راستے پر ہو لیے جو یاسنایا پولیانا کے دیگر راستوں کی مانند گھنے اشجار میں گھرا ہوا تھا اور اُن میں گم ہو رہا تھا..

اس ریاست میں داخل ہونے کے بعد میں اس کے باغوں اور جنگلوں میں کہیں بلند ہونے والے اور کہیں پستہ قد رہ جانے والے پیڑوں کو کبھی شجر کہتا ہوں اور کبھی درخت لیکن اُن کی اقسام سے آگاہ نہیں کرتا.. یہ ایسے ہی ہے جیسے اپنے دوستوں کا تعارف کرواتے ہوئے آپ اُن کو صرف انسان یا بندے وغیرہ کہیں اور اُن کے نام نہ لیں.. اُن کا حسب نسب نہ بتائیں..

یاسنایا پولیانا میں سات آٹھ مختلف قسم کے درخت ہیں... اور یہ اطلاع بھی مجھے اللہ

مغفرت کرے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والی آرینا نے بہم پہنچائی تھی اور میں نے فوری طور پران کی اقسام کو ڈائری پر نوٹ کر لیا تھا۔ سیب تو بہر طور ہیں لیکن ان کے علاوہ یہاں.. ایش' اوک' میپل' ایلم' پائن' سپروس اور لارچ کے ذخیرے ہیں.. وطن واپسی پر میں نے انگریزی اُردو لغات میں سے ان کے اُردو نام تلاش کیے۔ چونکہ بنیادی طور پران میں سے بیشتر مغربی خطوں کی آب و ہوا کے پروردہ ہیں اس لئے ان کے اُردو نام تقریباً مفقود تھے.. بہر حال ایش.. اگرچہ ایشور یہ رائے کو بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ صرف ایک جنگلی درخت ہے.. اوک کو شاہ بلوط کہا جائے گا.. میپل کسی حد تک ایک چنار ہے.. ہمارے چنار بہت گھنے اور قدیم اور بلند قامت ہوتے ہیں اور چنار کی آگ مشہور ہے جب کہ کینیڈا جس کا امتیازی نشان ہی چنار کا پتہ ہے وہاں کے چناروں کے رَس سے بسکٹ اور مٹھائیاں بنتی ہیں..

لغات میں ایلم کو بھی صرف ایک نوکدار اور کھر درے پتوں والا جنگلی درخت کہا گیا ہے.. اس درخت کی ایک وجۂ شہرت صوفیہ لارین' ٹونی پرکنز اور برل آئیوز کی فلم جو غالباً ٹینیسی ولیمز کے ڈرامے پر مبنی تھی "ڈیزائر انڈر ایلمز" ہے جس میں باباجی برل آئیوز کی نوجوان اور شہوت انگیز بیوی صوفیہ لارین دُبلے پتلے ٹونی پرکنز کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے... پائن.. خاصی حد تک صنوبر ہے. سپروس... یہ بھی صنوبر کی ایک قسم ہے اور لارچ کو بھی دیودار کے خانے میں ڈالا جاسکتا ہے.. چنانچہ ہمارے راستے کے آس پاس جو جنگل گھنے ہو رہے تھے اُن میں درختوں کی یہی اقسام پائی جاتی تھیں..

اور ہاں اگر درختوں کی اقسام کی اُکتا دینے والی تفصیل کا تذکرہ اگر چل ہی نکلا ہے تو ایک درخت اور بھی.. جس پر ٹالسٹائی پیدا ہوا تھا..

آرینا ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی آرینا چلتے چلتے ایک خاص درخت کے قریب رُک گئی تھی اور اُس کے تنے پر ایک محبت بھرا ہاتھ رکھ کر کہنے لگی تھی "یہ لارچ کا درخت ہے.. اور ٹالسٹائی کہا کرتا تھا کہ میں لارچ کے ایک درخت کی بلند ترین شاخوں پر پیدا ہوا تھا.."

یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والا بیان تھا پر ٹالسٹائی کی شخصیت بھی تو نہ سمجھ میں آنے والی تھی.. اگرچہ وہ ایک خوش نصیب صوفے پر پیدا ہوا تھا لیکن وہ اکثر یہ بیان نہایت سنجیدگی سے دیا کرتا تھا کہ میں ایک لارچ کی سب سے آخری اور بلند ترین شاخوں پر پیدا ہوا تھا.. اور میں وہاں

رُک گیا تھا.. بہت دیر تک اُس کی بلند ترین ٹہنیوں کو تکتا رہا تھا..

اُس نے ایسا کیوں کہا تھا.. اس کی کوئی نہ کوئی توجیہہ تو ہوگی.. کیا یہ ممکن ہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اصل میں وہاں پیدا نہیں ہوتا کہیں اور ہوتا ہے.. یہ صرف اُس کا ظاہر ہے بدن کا پنجرہ ہے جو کسی ایک مقام پر جنم لیتا ہے جب کہ اُس پنجرے کے اندر جو اُس کی ازلی رُوح ہوتی ہے.. جو اُسے اس کائنات کا حصہ بناتی ہے.. جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ میں ہی حق ہوں.. چونکہ حق نے مجھے تخلیق کیا تو میں اُس کا ایک حصہ ہوں تو ایسی رُوح کی پیدائش کہیں اور ہوتی ہے.. وہ اپنے اندر ایک خدا ہوتی ہے اسی لئے انا الحق ہوتی ہے.. بیشتر انسان اس ازلی رُوح کے وجود سے لاعلم ہوتے ہیں اس لئے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اُن کی پیدائش کہاں ہوئی تھی.. ٹالسٹائی جان گیا تھا..

اگر ایک عظیم رُوسی ادیب کا لارچ کی سب سے اُونچی شاخوں پر جنم ہوتا ہے تو ایک گمنام پاکستانی کہاں پیدا ہوا ہوگا..

وہ ایک لارچ پر تو نہیں اپنی دھرتی کے کسی درخت پر پیدا ہوا ہوگا..

شاید کانٹوں بھرے زرد پھولوں سے مہکتے ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کے درخت پر.. یا کسی بوڑھے برگد کی داڑھیوں کے جنگلک دُھندلکوں میں..

یا پھر برنے کے پیڑ کے آسمان کی قربت میں پتوں اور ٹہنیوں میں.. جس کی شاخوں سے بندھے رسّے سے نتالیہ جھولتی تھی..

بائیں جانب چیڑ کے درختوں کے گھنے پن کے اندر گھپ اندھیرا تھا اور اُس میں پنچھی چہکتے تھے.. پھیر دَخل کرتے تھے..

ایک بھیگتی ہوئی خاموشی تھی اور ہم اُس کے درمیان میں چپ چلتے تھے اور پھوار تیز ہونے لگی تھی..

یہ راستہ ایک مقام پر خود بخود بائیں جانب ہو گیا.. اب دائیں ہاتھ پر ایک وسیع گھاس بھرا میدان تھا جس کے آخر میں ایک دریا بہتا تھا اور کہیں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور بائیں جانب وہی چیڑ کے درختوں کے جھرمٹ تھے جن کے اندر اتھاہ تاریکی تھی اور اُس میں عجیب سے پرندے چہکتے تھے..

ہم احتیاط کرتے.. کیچڑ سے بچتے.. پھوار میں بھیگتے چلتے گئے.

اور یہ پرندے اُس گھنے تاریک جنگل کے اندر چہکتے تو تھے پر یوں جیسے کسی کو پکارتے ہوں.. چیڑ کے تنے بہت قربت میں تھے اتنے کہ اُن کے درمیان میں سے کسی انسان کا گزرنا مشکل ہوگا..اور تاریکی بھی بہت تھی..شاید اس جنگل کے اندر پنچھی پھیرو کھو جاتے ہوں گے.. پرواز نہ کر سکتے ہوں گے بار بار چیڑ کے تنوں سے ٹکرا جاتے ہوں گے..تو یہ اُنہی پرندوں کی آوازیں ہوں گی جو اس جنگل میں کھو چکے ہوں گے اور فریاد کرتے تھے..

ٹالسٹائی کا بنچ دُور سے نظر آ گیا اُس کچے راستے کے کنارے پر..اس لئے کہ وہ برچ کے سفید تنوں سے تراشیدہ تھا اس لئے بھی کہ وہ قدرت کی بناوٹوں میں ایک انسان کے ہاتھوں کی بناوٹ تھی..

یہ بنچ ایک دیومالائی حیثیت اختیار کر چکا ہے..

آخری برسوں میں اُس کی شہرت اور ناموری اُس کے لیے ایک عذاب بن گئی.اور اُس میں اتنی سکت نہ تھی وہ اس کے کھوکھلے پن اور نمود و نمائش کو سہہ سکے..اُس کے ہاں ملاقاتی اور مہمان بہت آنے لگے..عزیز و اقارب ہجوم کرنے لگے تو وہ تنگ آ کر چپکے سے فرار ہو جاتا..اُس نے گھر سے دُور اس مقام کو اپنی تنہائی کے لیے چنا..اپنے بڑھئی کے اوزار لے کر یہاں آ بیٹھا.. برچ کے تنوں کو آری سے کاٹ کر ٹھونک بجا کر اپنی نشست کی خاطر ایک انوکھا سا بنچ بنا لیا..وہ ہجوم سے کترا کر یہاں آ بیٹھتا اور پہروں بیٹھا رہتا..اور صوفیہ جانتی تھی کہ اُس کا خاوند بھیڑ سے بیزار ہو کر چپکے سے نکل گیا ہے اور تنہا ہونا چاہتا ہے وہ اُس کا پیچھا نہ کرتی.....وہ یہاں بیٹھ کر اپنے ناولوں کے تانے بانے سوچتا..اُن کے کرداروں سے باتیں کرتا..اُن آخری برسوں میں اُس کے دماغ میں یہ سودا سمایا کہ دنیا کے تمام مذاہب کو یکجا کر کے ایک ایسا مذہب متعارف کروایا جائے..مشترکہ اخلاقی اقدار کی ترویج یوں کی جائے کہ وہ سب کے لیے قابل قبول ہو تا کہ پوری انسانیت سکھ چین سے رہ سکے مذہب کی بنیاد پر برسرپیکار نہ رہے..اُس کی یہ کاوش اور سوچ کسی حد تک بابا گورونانک سے مماثلت رکھتی تھی جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ مذہب میں پرونے کی کوشش کی تھی تا کہ ان کی بے وجہ عداوتیں اور نفرتیں اختتام کو پہنچیں..اور یہ بھی کیا ہی اتفاق تھا کہ ٹالسٹائی اور بابا گورونانک دونوں یہ لمبی سی نورانی سفید داڑھیاں رکھتے تھے..

ہم ٹالسٹائی کے بنچ کے قریب آ تو گئے پر وہاں ٹالسٹائی نہ تھا دو تین خاصے مخمور اور

سرمست رُوسی جوڑے تھے جو اس الگ تھلگ مقام میں اپنی جوانی کے زور کو بشکل لگا میں کھینچے لطف اندوز ہو رہے تھے..اُن کی بادہ نوشی اور خورد و نوش کے سامان ٹالسٹائی کے بنچ پر پڑے تھے یعنی کچھ خالی بوتلیں اور ڈبے..وہ اپنے حال میں اتنے مست تھے کہ چیڑ کے جنگل کے اندر کو کھو چکے پرندوں کی آوازوں پر بھی دھیان نہ کرتے تھے..اپنی دُھن میں مست الست تھے..وہ ہمیں قریب ہوتا دیکھ کر کھسیانے سے ہو گئے..ذرا سنبھل گئے اور اپنے چونچلوں کو موقوف کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے..میں نے پاس پہنچ کر مسکراتے ہوئے سلام دعا کی تو وہ ذرا شرمندہ سے ہو گئے کہ شاید یہ اجنبی شباہت والے لوگ جن کے ہمراہ ایک بہت پرکشش رُوسی لڑکی بھی آتی ہے یہ ہماری کیفیت کو پُرتحسین نگاہوں سے نہ تکتے ہوں گے پر ایسا نہیں تھا..

ٹالسٹائی نے اگر اپنے ادب اور شخصیت سے اور نظریات سے ایک دنیا کو مسرت سے ہمکنار کیا تو آج یہ بنچ جو اُس کی تخلیق تھا اُس کی پیروی کر رہا تھا...ویسے میں ذاتی طور پر اُن کے ذوق جمال کا قائل ہو گیا' اگر میں بھی نوخیز ہوتا' بادہ خوار ہوتا' میرے ہمراہ ایک عشق خاص نہ سہی ایک عشق عام بھی ہوتا تو میں بھی اُسے یہیں لے کر آتا..اور ایک عمر خیام ہو جاتا..

میں نے کسی حد تک اُن جوڑوں کی خلوت اور مے خواری میں مخل ہونے پر جرم محسوس کیا.

وہ خمار میں تھے اور شرمندہ بھی ہو رہے تھے..لڑکیاں ہنستی چلی جا رہی تھیں..وہ انگریزی سے ناواقف تھے اور رُوسی میں کچھ کہہ رہے تھے اور آنیا بھی مسکراتی چلی جا رہی تھی..

میں نے آنیا کی جانب دیکھا کہ ذرا ترجمہ کر دو" اور ہاں..اب جا کر معلوم ہوا ہے کہ ٹالسٹائی اپنے گھر سے فرار ہو کر یہاں کیوں آ بیٹھتا تھا..وہ یہاں بیٹھ کر بیئر پیا کرتا تھا کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اُس کے بنچ پر بیئر کی بوتلیں اور ڈبے پڑے ہیں.."

اُنہوں نے میرے اس کومنٹ کو شرمندگی سے سراہا اور اپنا سامان مے نوشی بنچ سے اُٹھا لیا..اور ذرا پرے ہو گئے..ہمیں بنچ کی زیارت کے لیے تنہا چھوڑ دیا..

موتا نے حسب عادت ایک اعتراض کر دیا "اُس کے گھر سے یہاں تک آتے آتے ہمارا تو بھرکس نکل گیا ہے اتنا فاصلہ ہے تو وہ اسّی سالہ بابا وہاں سے یہاں تک پیدل کیسے آتا جاتا ہو گا."

"موتا بیگم اس سوال کا جواب بھی اُس کے چھوٹے سے بستر میں پوشیدہ ہے..اُن زمانوں کے بوڑھوں اور آج کل کے میرے ایسے بوڑھوں میں بہت فرق ہے..وہ تو آخری

سانسوں تک باز نہیں آتے تھے۔''

''ہاں'' وہ خفا ہونے کے بجائے مسکرادی اور مجھے خدشہ ہے کہ اُس کی مسکراہٹ میں ایک ہلکا سا طنز پنہاں تھا۔''ہاں۔اُن زمانوں کے اور آج کل کے بوڑھوں میں واقعی بہت فرق ہے۔''

میں نہایت مؤدب ہو کر اُس بنچ پر بیٹھا۔اب ٹیک لگا کر برچ کے تنوں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوں تو پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے' معلق ہیں۔۔ذرا آگے سرک کر انہیں زمین پر لگانے کی کوشش کرتا ہوں تو بمشکل کرتا ہوں۔۔

باباجی نے بے شک کسب کمال کیا اور عزیز جہاں ہوئے پر ترکھان پنے میں کمال نہ حاصل کر سکے اناڑی رہے یعنی کیا بیہودہ بنچ بنایا ہے کہ بیٹھنے سے پاؤں دونوں پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے' جھولتے رہتے ہیں۔۔

اور تب مجھے مرحومہ آرینا کا کہا یاد آ گیا کہ وہ ایک دراز قامت شخص تھا تو اُس نے یہ بنچ اپنی قامت کے مطابق بنایا تھا اور تبھی مجھ ایسے درمیانے قد کے شخص کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے ہوا میں معلق رہتے تھے۔۔

البتہ میرے اباجی یہاں ہوتے۔۔تو وہ نہایت اطمینان سے اس بنچ پر بیٹھ جاتے کہ وہ بھی ٹالسٹائی کی مانند دراز قد تھے۔۔

میں نے حسب منشا اُس بنچ پر بیٹھ کر قدرے فکر انگیز اور گہری سوچ میں گمشدہ حالت میں چند تصویریں اُتروائیں تاکہ سند رہے۔۔

میں نے مونا کو وہاں بٹھا کر ایک تصویر اُتاری تو وہ کہنے لگی ''نہایت ہی بے آرام بنچ ہے۔برچ کے تنے اتنے چبھتے ہیں کہ اس پر زیادہ دیر بیٹھا نہیں جا سکتا۔۔پتہ نہیں وہ بوڑھا یہاں کیسے پہروں بیٹھا رہتا ہوگا اور سوچ بچار بھی کرتا ہوگا۔''

اس دوران دو نہایت پلے ہوئے گھوڑے۔۔ایک سراسر برف سفید اور دوسرا مشکی رنگت کا اپنے سواروں کو سنبھالے اُس کچے راستے پر نمودار ہوئے جدھر سے ہم آئے تھے۔۔ہمارے قریب ہوتے گئے اور پھر پاس سے گزر گئے۔مشکی گھوڑے پر سوار ایک مرد تھا جس نے ایک سرخ کیپ پہنی ہوئی تھی اور سفید گھوڑے پر ایک تنومند لڑکی تھی' گہرے نیلے لباس میں' اُس کے سر پر اٹکی ٹوپی بھی نیلے رنگ کی تھی' اپنے بدن کے ساتھ کسی ہوئی لڑکی کی ٹانگوں کی حدت سے سفید گھوڑا

کبھی کبھار بدک جاتا تھا۔۔اور جب وہ ہمارے پاس سے گزر گئے دُور ہونے لگے تو لڑکی کے سرمئی بال اُس کی نیلی ٹوپی میں سے اُس کی پشت پر گرتے دکھائی دے رہے تھے۔۔

دونوں گھوڑوں کے درمیان میں اُن کی باگیں تھامے ایک رکھوالا بھی چلتا جا رہا تھا۔۔

وہ دونوں گھڑ سوار کچھ بھی ہو سکتے تھے۔۔ٹالسٹائی کے خاندان میں سے ہو سکتے تھے۔اُس کا پڑپوتا یا پڑپوتی بھی ہو سکتے تھے جو اپنی آبائی ریاست کی سیر پر نکلے ہوں۔۔لیکن غالب امکان یہی تھا کہ وہ ہمارے جیسے سیاح تھے جنہوں نے ٹالسٹائی کے اصطبل میں سے یہ گھوڑے کرائے پر حاصل کیے تھے ورنہ اُن کے ساتھ ایک رکھوالا نہ چل رہا ہوتا۔۔شاید وہ یہ محسوس کرنا چاہتے تھے کہ جب اُن زمانوں میں ٹالسٹائی اپنے اصطبل میں سے کسی ایک گھوڑے کو پسند کر کے اُس پر سوار ہو کر اپنی ریاست کے ان جنگلوں میں گھرے راستے پر جاتا تھا تو وہ کیا محسوس کرتا تھا۔۔

کیچڑ کے باعث گھوڑوں کے سُم کبھی کبھار پھسلتے پر وہ سنبھل جاتے۔۔

وہ دونوں سوار اُن پر سیدھی کمر کے ساتھ بت بنے بیٹھے ہم سے دُور ہوتے جاتے تھے اور اُن پر درختوں کی شاخوں کے پردے گرتے جاتے تھے۔۔

اس بنچ پر بیٹھے ہوئے شخص کو اپنے سامنے سوائے چیڑ کے گھپ اندھیرے جنگل کے اور کوئی منظر دکھائی نہ دیتا ہے۔۔وہ اپنے بنچ کے لیے اپنی ریاست میں واقع کوئی اور مقام بھی چن سکتا تھا جہاں سامنے کوئی پُرفضا منظر پھیلتا ہو۔۔اگر اُس نے یہی جگہ منتخب کی تو صرف اس لئے کہ یہ گھر سے بہت دُور تھی اور اُسے سامنے کے منظر سے کچھ غرض نہ تھی وہ صرف تنہا بیٹھ کر اپنے آپ میں گم ہونا چاہتا تھا۔۔

تصویر کشی سے فارغ ہو کر میں نے اُن جوڑوں کو۔۔جو چیڑ کے درختوں تلے منتظر تھے کہ ہم کب رخصت ہوں اور کب اُن کا شغل مے نوشی جاری ہو۔۔اشارہ کیا کہ حضرت آ جائیے اور سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیجیے اور وہ شرمندہ سی مسکراہٹوں کے ساتھ چلے آئے۔۔

ہم نے فیصلہ تو یہی کیا کہ جدھر وہ گھوڑے جا رہے تھے اُسی راستے پر چلتے ہوئے دریا کو ایک نظر دیکھتے ایک چکر کاٹ کر محبت کے درخت والے دوراہے پر جا نکلیں لیکن ہم ایسا نہ کر سکے کہ ہم گھوڑے نہ تھے۔۔ہمارے پاؤں میں نعلوں کی بجائے جوگرز تھے جو کبھی پھسلتے اور کبھی کیچڑ میں دھنس جاتے۔۔اور ہم اپنے آپ کو گرنے سے بمشکل بچاتے۔۔ہمارا حال میاں محمد بخش جیسا تھا کہ

ایک تو میں اندھا ہوں اور پھر راستہ بھی تلکن ہے.. پھسلن ہے.. چنانچہ کچھ دور جا کر ہم نے یہ ارادہ ترک کیا اور اُسی راستے پر واپس ہو گئے جدھر سے آئے تھے..

پھوار پھر سے تیز ہو گئی.. اتنی کہ ہم بھیگنے لگے..

آنیا نہایت منصوبہ بند بچی.. کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار.. اُس نے اپنے شاپر بیگ میں سے فوری طور پر دو چھاتے برآمد کر کے ہمیں پیش کر دیے..

تھکاوٹ غالب آ رہی تھی.. ہم صبح سے مسلسل سفر میں تھے..

بالآخر ہم واپس محبت کے درخت والے دوراہے پر پہنچ گئے.. اور ہماری حالت کچھ اتنی خوشگوار نہ تھی.. تھکن ہڈیوں کو شکستہ کر رہی تھی.. مزید چلنے کی سکت نہ تھی' کہیں آرام کرنا چاہتے تھے.. کہیں سو جانا چاہتے تھے.. جی یہی کہتا تھا کہ تالستائی بہت ہو گیا اب واپس ہو جائیں لیکن یہی جی مانتا نہ تھا کہ اُس کی قبر پر حاضری دیے بغیر رخصت ہو جائیں.. اور پھوار میں بھیگتا وہ راستہ جنگلوں میں پوشیدہ ہوتا جاتا کچا راستہ کیسا پُرکشش اور ہریاول کے سحر میں سانس لیتا دکھائی دے رہا تھا جو تالستائی کی قبر کو جاتا تھا.. اور ہمیں جانا تھا..

اسے "خاموشی کا جنگل" کہا جاتا تھا..

اور میں نے اس جنگل کے درمیان دُور تک جاتے کچے راستے پر چلتے ہوئے خاص طور پر غور کیا کہ وہاں دونوں جانب درختوں کے بھیتر میں کوئی چہکار نہ تھی.. وہ چپ تھے' جنگل خاموش تھا.. کیا یہ شہرِ خاموشاں کی ایک علامت تھی.

اور اُس شہرِ خاموشاں کا ایک ہی باسی تھا... لیو تالستائی!

گھنے اشجار کے تنوں کے گرد خودرو بیلیں سبز سانپوں کی مانند لپٹتی اُوپر شاخوں تک جا پہنچی تھیں اور ان تنوں کو کائی کی سبز روئیدگی ڈھکتی تھی.. اور جو بارش اُترتی تھی وہ ان تنوں کو بھگو کر سیاہ کرتی اُن زرد اور جامنی رنگ کے خودرو پھولوں پر گرتی تھی جو ان اشجار کے سائے میں کھلتے تھے..

ہمارے آگے اُس دُور تک جاتے کچے راستے پر ایک سرخ چھاتے تلے ایک جوڑا ہولے ہولے چلا جا رہا تھا.. مرد کے دائیں ہاتھ میں ایک بیساکھی تھی جسے وہ پھوار سے نرم ہوتی مٹی

میں ٹیکتا ایک پاؤں ذرا گھسیٹ کر چلتا تھا اور عورت احتیاط کر رہی تھی کہ اُس پر بارش نہ گرے اور ہاتھ میں تھامے سرخ چھاتے کو اُس مرد کی غیر متوازن چال کے مطابق اُس کے سر پر تانے رکھتی تھی.. عورت کا آدھا بدن بارش کی زد میں آ رہا تھا لیکن وہ اپنے مرد.. اپاہج مرد کو بھیگنے نہ دیتی تھی..

"کیسا باہمت شخص ہے.." مونا نے اچنبھے سے کہا "ان دونوں کو میں نے یاسنایا پولیانا کے گیٹ میں سے اندر جاتے دیکھا تھا اور وہاں بھی اس کو چلنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی.. اور جب آپ کچھ دیر کے لیے سیب کے درختوں کے اندر چلے گئے تھے تو میں نے اس جوڑے کو تالستائی کے گھر سے باہر آتے بھی دیکھا تھا.. تالستائی کے بھی کیسے کیسے دیوانے ہیں۔"

ویسے ایسے دیوانے تو میں نے بہت دیکھے تھے.. نیویارک کے میٹرو پالٹن میوزیم میں ایک ایسے کبڑے شخص کو دیکھا تھا جو اپنے سامنے کی کسی شے کو دیکھنے سے معذور تھا' وہ صرف فرش کو دیکھ سکتا تھا.. اور وہ پکاسو کی ایک پینٹنگ کو "دیکھ" رہا تھا.. اُس نے غالباً اپنی ہتھیلی میں کوئی چھوٹا سا آئینہ تھام رکھا تھا جس کا رُخ اُس نے پینٹنگ کی جانب کر رکھا تھا اور یوں وہ اُس میں عکس ہوتی پکاسو کی تصویر سے لطف اندوز ہو رہا تھا..

ایک اور دیوانے کو خانہ کعبہ کے طواف کے دوران دیکھا اور وہ بھی نہ صرف کبڑا تھا بلکہ بہت بوڑھا تھا اور وہ بھی اپنے سامنے نہیں اپنے پاؤں تلے حرم کا جو فرش تھا اُسے دیکھ سکتا تھا.. اُس کی گردن کی رگیں اتنی مردہ ہو چکی تھیں وہ اُسے موڑ کر جس گھر کا وہ طواف کر رہا تھا اُسے بھی نہ دیکھ سکتا تھا.. اس کے باوجود وہ اک عالم سرخوشی میں سر ہلاتا چلتا جاتا تھا صرف اس احساس کے خمار میں کہ میرے بائیں جانب خانہ کعبہ ہو گا.. اُس کی مٹھی میں تو نہیں شاید اُس کے بدن میں ایک ایسا آئینہ تھا جس میں خانہ کعبہ عکس ہو رہا تھا اور وہ اُسے "دیکھ" سکتا تھا.

ہم نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی تا کہ اس جوڑے سے آگے نہ نکلیں.. اُس شخص کو اپنے اپاہج پن کا احساس نہ ہو..

میرا قیاس ہے کہ وہ عورت اُس کی بیوی نہ تھی محبوبہ تھی' یا ایسی بیوی تھی جو محبوبہ ہو گئی تھی. کیونکہ جس طور وہ اُس کا دھیان رکھ رہی تھی' کوشش کر کے اُس کی ہم قدم ہو رہی تھی اور اسے بچانے کی کاوش میں خود بھیگ رہی تھی ایسا رشتہ معاشرتی اور مذہبی بندھنوں سے نہیں بندھتا.. میں تالستائی کی وصیت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے دفن کرتے ہوئے کسی قسم کی مذہبی رسومات نہ

ادا کی جائیں' صرف لکڑی کا ایک تابوت ہو اور ہر اُس شخص کو کاندھا دینے کی اجازت ہو جو یہ خواہش رکھتا ہو.. اور مجھے ستاری ذاکاز کے جنگل میں' پہاڑی نالے کے قریب' چھوٹی سبز شاخ کی جگہ دفن کیا جائے... اور اس کی یہ خواہش کہ قبر کو کچا رکھا جائے تاکہ موت کے بعد بھی وہ موسموں کو محسوس کر سکے.. برفانی رُتوں' بارشوں اور خزاں کے دنوں کو محسوس کر سکے.. اور میں سوچ رہا تھا کہ اُس کی یہ وصیت' یہ خواہش اُس کی شخصیت کی آئینہ دار تو نہ لگتی تھی.. وہ کوئی خوابوں اور خیالوں میں بسیرا کرنے والا غیر حقیقت پسند شخص تو نہ تھا.. وہ تو اس زمین پر جو غربت' استحصال اور ناانصافی تھی اُس پر نہ صرف کڑھنے والا بلکہ اُسے مٹا دینے کی آرزو کرنے والا ایک شخص تھا تو پھر اُس نے ایسی رومانوی اور خوابناک وصیت کیوں کی.. شاید یہ اُس چھوٹی سبز شاخ کا کرشمہ تھا جس پر وہ راز لکھا تھا جس کے انکشاف سے دنیا کے سارے غم دور ہو جاتے اور اور کبھی جنگ نہ ہوتی.. وہ اُسے بچپن میں تلاش کرتا رہا تھا ستاری ذاکاز کے جنگل میں' پہاڑی نالے کے قریب اور اب موت کے بعد بھی وہ اُسے اُس مقام پر دفن ہو کر تلاش کرنا چاہتا تھا.. شاید اس لئے بھی کہ ہر عظیم تخلیق کار بہر طور ایک رومان پرور اور خوابناک رُوح رکھتا ہے اور وہ اسے عام طور پر روپوش رکھتا ہے..

میں تھکا ہوا بہت تھا' بارش کی بوندیں چھتری سے پھسل کر میری گردن پر گرتیں اور اور میری ریڑھ کی ہڈی پر گیلی لکیریں بہاتی مجھے ایک سنسناہٹ سے دوچار کرتیں..

پہلے تو میں اُسے گھنے بھیگتے درختوں تلے سبز پتوں کا ایک ڈھیر سمجھا پر وہ دراصل ٹالسٹائی کی ڈھیری تھی' اُس کی قبر تھی جو نظر آنے لگی تھی..

لیو ٹالسٹائی واقعی خاموشی کے جنگل میں جہاں درختوں تلے جو گل بوٹے تھے وہ کناروں پر اُمڈتے بھیگتے جاتے تھے وہاں دفن تھا..

کچی زمین پر سرو کے ہرے پتوں میں ڈھکی ہوئی قبر اُبھری ہوئی تھی اور اُن پتوں پر گرتی پھوار اُن میں بے آواز جذب ہوتی تھی.. جذب ہو کر ٹالسٹائی کی کچی قبر تک رسائی حاصل کرتی تھی اور اُسے بھی بھگوتی تھی..

قبر کے گرد نشاندہی کی خاطر کہ کہیں کوئی شخص چلتا ہوا آئے اور بے دھیانی میں ٹھوکر نہ کھا جائے' لوہے کے کڑوں کو کچی زمین میں نصب کر دیا گیا تھا. اور وہ زمین سے بالشت بھر نمایاں ہوں گے..

گل لالہ کے چند پھول احاطے کے اندر پڑے تھے جن پر کسی چاہنے والے کے ہاتھوں کی لکیروں کے نشان ہوں گے.. اور ان پھولوں کے اردگرد کچی زمین پر بارش گرتی تھی اور کچھ بوندیں اپنے زور میں زمین پر گرتیں اور اُن میں مٹی شامل ہو جاتی اور وہ اُن پھولوں کی سرخ پتیوں پر بکھر جاتیں.. اُن پر پھولوں پر وہ گیلی مٹی اُنکی سرخی کو اور بھی نمایاں کرتی..

سرخ چھاتے تلے وہ جوڑا کچھ دیر وہاں ٹھہرا.. نہ اُنہوں نے ہم سے کوئی بات کی اور نہ ہم نے اُن سے کچھ کلام کیا.. کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور چلا گیا.. البتہ جہاں وہ ٹھہرا تھا وہاں مرد کی بیساکھی کے نشان بارش میں نمایاں نظر آتے تھے.. اور اگر ہم دیکھ سکتے تو اُس عورت کی دھیان بھری محبت تھی..

میں نے... جنوں میں جتنی بھی گزری بیکار گزری ہے... حیات میں کیسے کیسے سلطانوں' شہنشاہوں' خلفاء.. شاعروں' صحابہ کرام اور پیروں فقیروں کے مرقد دیکھے تھے. جنت البقیع میں. دمشق کے باب الصغیر میں، استنبول میں حضرت ایوب انصاریؓ، داتا گنج بخش، شاہ حسین، نظام الدین اولیاء، سلیم چشتی، اکبر اعظم، ممتاز محل اور منٹو کے مدفن دیکھے تھے... وہاں عقیدت کی سرشاری اور شانداری عظمت تو دل پر اثر کرتی تھی پر کوئی ایسا مدفن کبھی نہ دیکھا تھا جو مجھ پر ایسے اثر انداز ہو جائے کہ میں اُس لمحے وہیں مر جانے اور وہیں دفن ہو جانے کی آرزو کروں..

ٹالسٹائی کی وہ کچی قبر مجھ پر ایسے ہی اثر انداز ہوئی..

اور یہ کوئی رومانوی واہمہ نہیں کہ ایسی آرزو جنم لیتی ہے..

اُس کی کچی قبر کو سرو کی شاخوں سے نہایت سلیقے سے ڈھانپا گیا تھا جیسے ایک سبز غلاف سے ڈھانپا گیا ہو... یہ شاخیں اور سرو کے یہ پتے نہایت سرسبز اور تر و تازہ لگتے تھے. یقیناً ان کے مرجھانے اور پژمردہ ہونے پر انہیں تبدیل کر دیا جاتا ہوگا.. انہیں اُتار کر اُس کی قبر کو سرو کی شاخوں کا ایک نیا پیراہن پہنا دیا جاتا ہوگا.. لیکن کوئی تو ہوگا جو یہ فرض باقاعدگی سے سرانجام دیتا ہوگا تو وہ کون تھا...

شاید اصطبل کا کوئی رکھوالا یا اُس کوچوان کی اولاد میں سے کوئی جو ٹالسٹائی کو اُس کے آخری سفر پر لے گیا تھا. اور وہ اب تک وفادار تھا.. وہ خوب جانتا تھا کہ یہ سبز پیراہن کتنے روز بعد تبدیل کرنا ہے اور قبر کو ڈھانکنے والی پژمردہ شاخوں کو الگ کر کے اُنہیں کہاں پھینکنا ہے..

قبر تک تو ایک کچا راستہ جاتا تھا لیکن اُس کے آگے صرف جنگل تھا اور اُس میں کوئی راستہ نہ جاتا تھا میرا گمان ہے کہ جب اُسے اُس کی وصیت کے مطابق ستاری ذاکاز کے جنگل کے عین درمیان میں دفن کیا گیا تو وہاں تک کوئی باقاعدہ راستہ نہ جاتا تھا اور پھر اُس کے چاہنے والوں کی سہولت کی خاطر خاموشی کے اُس جنگل کے کچھ شجر کاٹ کر اُن کے درمیان میں ایک پگڈنڈی بنادی گئی..

میں یوں بھی سدا سے ایک پیاسی مٹی ہوں کہ جس پر بارش کی ایک بوند گرے تو بھی وہ مہک اُٹھتی ہے اور جب اُس پر ایک ایسے خاموش جنگل کی بوچھاڑ اتر آئے تو وہ مٹی کیسے مہک جاتی ہے' دھوم مچاتی اثر کرتی ہے اس کا کیا بیان ہو. یہ مقام کا سحر نہ تھا اثر تھا. ایک گہری مرگ اداسی میں بھیگتی ہوئی دُھند تھی جس کے پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا کہ یہ دنیا کیا ہے اور انسان یہاں کیا کرنے آ جاتا ہے.. ڈبویا مجھ کو ہونے نے.. اگر نہ ہوتا تو کیا ہوتا..

بلند درختوں کی شاخوں میں سے رِستی بارش سے بھیگتی اُس کی قبر کو تکتے ہوئے یکدم مجھ پر اثر ہو گیا.. ایک بے نام کیفیت جس میں دنیا کی بے ثباتی اور اس وجود کے خاک ہو جانے کی آمیزش تھی مجھ پر اُتری اور اُس گہری مرگ اداسی میں بھیگتی دُھند جو میرے بدن میں پھیلی تھی سرگوشیاں کرتی تھی کہ یہ جہان کیا ہے اور اگر میں اس جہان میں ہوں تو آخر کیوں ہوں. میمونہ بھی چپ کھڑی دیکھتی جاتی تھی اور آنیا.. ایک نوخیز ہرنی کی مانند ہراس کی کیفیت میں جیسے آس پاس خاموشی کا جو جنگل پھیلا ہوا تھا اُس میں کچھ خدشے ہوں.. کوئی گھات لگائے بیٹھا ہو..

"تم چلو میمونہ.. میں آ جاؤں گا۔"

وہ سراسر منتظر تھی اور توقع کر رہی تھی کہ میں یہی کہوں گا کہ تم چلو میں آ جاؤں گا..

"آؤ آنیا۔" میمونہ نے چھاتا بردار آنیا سے کہا "ہم چلتے ہیں یہ بعد میں آ جائیں گے.."

آنیا کے چہرے پر نا سمجھی کی تشویش تیر گئی "مستنصر.. بارش ہو رہی ہے.. آپ بھیگ جائیں گے.."

"ہاں میں بھیگ جاؤں گا.." میں نے مسکرا کر کہا "آپ دونوں ٹالسٹائی کے گھر کے قریب میرا انتظار کرنا' میں آ جاؤں گا.."

میمونہ میری سرشت سے خوب واقف تھی' وہ جان گئی تھی کہ میں وہاں کچھ دیر کے لیے

تنہا رہنا چاہتا ہوں" "آؤ.. آنیا۔"

وہ دونوں ایک چھاتے کی پناہ میں واپس ہو گئیں..

کچھ دُور تک اُس ویران کیچڑ ہوتے راستے اور اُس پر اُمڈے ہوئے درختوں تلے وہ نظر آتی گئیں اور پھر اُن کے اور میرے درمیان بارش کی چادر اتنی دبیز ہو گئی کہ وہ دُھندلانے لگیں' صرف اُن کا سرخ چھاتا پانیوں میں جھلملاتا دکھائی دیتا رہا.. پھر وہ ایک دھبے کی صورت بارش اور ہریاول میں تحلیل ہو گئیں..

جونہی وہ دونوں اور چھاتے کا سرخ رنگ پیڑوں میں برستی بارش کی اوٹ میں چلے گئے' اوجھل ہوئے تو مجھے شاید واہمہ ہوا کہ بارش کا شور کم پڑ گیا ہے' ٹالسٹائی کی قبر سے پرے درختوں تلے جو سرسبز ڈھلوانیں تھیں جن میں نمودار ہونے والی جھاڑیوں کے پتوں پر بوندیں ٹھہری ہوئی تھیں وہ بے آواز سرک کر زمین پر گرنے لگیں..

یہ کیسی فہم سے باہر.. تصور سے ماورا انہونی تنہائی تھی جیسے زمین سے ہزاروں نوری برسوں کے فاصلے پر کوئی ویران جہان ہے جس میں میں ہوں اور یہ تنہائی ہے.. اور میں ٹالسٹائی کی سرد قبر کی جانب بھی دھیان نہ کرتا تھا' میرے چھدرے ہوتے بالوں پر جتنی بوندیں گرتی تھیں وہ میرے سر کے ماس پر گیلاہٹ کے بوسے دیتی تھیں.. زہر مورا رنگ کی فلیس کی جیکٹ جس پر "وکٹوریا" نقش تھا جو بینش سید نے مجھے کینیڈا میں ملاقات پر تحفے میں دی تھی یہاں بھی میری رفیق تھی. اُس پر مینہ کی بوندیں گرتیں اور فلیس انہیں جذب کر لیتی. تھوڑی ہی دیر میں وہ سراسر گیلی ہو گئی اور اُس کا زہر مورا رنگ اور گہرا ہو گیا.. وہ سبز گھاس لگنے لگی.. یہ جیکٹ بارش سے اتنی گہری سبز ہو گئی..

ہوا میں ایک بوجھل نمی تھی اور آس پاس کے شجر ذخیروں کی کچی سبز مہک تھی..

جانے مجھ سے یہ بے دھیانی کیوں ہو گئی تھی' مجھے کیوں خیال نہ آیا تھا کہ ٹالسٹائی کی قبر پر چڑھانے کے لیے میں چند پھول لے آؤں.. میں خالی ہاتھ آ گیا تھا. مجھے اس افسوس نے افسردہ کر دیا.. میں نے آج تک اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ کسی بزرگ' اولیاء کے مرقد پر پھول نہیں چڑھائے تھے.. احترام کے باوجود جی نہ چاہا تھا اور آج جی چاہ رہا تھا اور وہ جی مجھے ملامت کر رہا تھا کہ پھول کیوں نہیں لائے..

قبر کے اردگرد جو کچی مٹی تھی اس پر گل لالہ اور کرائی سنتھم کے پھول بارش کی بوندوں سے ستھرے ہوتے تھے.. اور مجھے احساس ہوا کہ ان باقاعدہ پھولوں کے پہلو میں پھولوں کے چند ایسے گچھے تھے جو لائے نہیں گئے تھے.. یہ پھول خاموشی کے جنگل میں خودرو تھے.. بہت نہیں تھے لیکن وہ درختوں کے بھیگتے تنوں کے آس پاس اور سرسبز ڈھلوانوں میں کہیں کہیں نمودار ہوتے تھے.. کچھ مداحوں نے جو میری طرح خالی ہاتھ آئے تھے انہیں چنا اور ٹالسٹائی کی نذر کر دیے.. اور یہ تو میں بھی کر سکتا تھا..

مجھے ان کے حصول کی خاطر جنگل کے بھیگتے ہوئے گھنے پن کے اندر جانا پڑا.. بھیگی ہوئی جھاڑیوں اور نم آلود گھاس میں پاؤں رکھتے پھول تلاش کرتے میری پتلون کے پائنچے گیلے ہو گئے اور بوٹ کیچڑ آلود ہو گئے.. کچھ خوش نما رنگین پتے.. ہری بھری لڑیاں اور چند زرد اور بنفشی پھول میں نے جمع کیے اور واپس آ کر ٹالسٹائی کے قدموں میں رکھ دیے..

بارش کی وجہ سے بہت کم لوگ ادھر آئے تھے اور جو آئے تھے وہ چند لمحے ٹھہر کر.. چلے گئے تھے.. مونا اور آنیا بھی جا چکی تھیں اور یہاں تک آنے والے کچے راستے پر ڈور ڈور تک ویران اور بارش بھری تنہائی تھی اگرچہ یہ خواہش جنوں کے زمرے میں آتی ہے لیکن میرا جی چاہا کہ میں قبر کے گرد چل کر اسے ہر رخ سے دیکھوں.. یعنی ایک ادبی طواف کر لوں.. اسے مختلف پس منظروں میں دیکھوں.. قبر تک جو راستہ آ رہا تھا وہ آگے چل کر جنگل میں جاتا تھا.. اسی طور یہ قبر راستے سے ذرا ہٹ کر دائیں جانب تھی اور اس کے پس منظر میں بھی جنگل تھا اس کے گرد چلنا ذرا دشوار اور مشکل تھا بارش کی وجہ سے پھسلن ہو رہی تھی اور احاطے کے دوسری جانب زمین ہموار نہ تھی بلکہ ڈھلوان صورت میں نیچے جاتی تھی.. میں اس جنوں میں کم از کم دو بار بری طرح پھسلا لیکن گرنے سے بچ گیا.. دوسری جانب سے پس منظر ہی اور تھا.. راستہ تھا اور عقب میں خاموشی کا جنگل تھا اور قبر کی ہیئت مختلف نظر آ رہی تھی.. میں نے جنگل میں اتر کر ذرا فاصلے سے اس طرف دیکھا تو نمی سے بوجھل ٹہنیوں میں وہ ہر بوند کے ساتھ لرزتی نظر آتی تھی..... یہ بوندیں میرے چہرے کو تر کرتی تھیں تو اس یکسر تنہائی میں جب مینہ کا شور مدھم پڑ چکا تھا مجھے ایک عجیب سا خیال آیا..

ایک عجیب تجسس نے قبر کے احاطے کی کچی اور گیلی مٹی میں جڑیں پکڑ لیں..

کوئی نہیں..

آس پاس کوئی بشر نہیں..

قبر تک آنے والے کچے راستے پر بھی ڈور ڈور تک کوئی ادھر کو آتا دکھائی نہیں دے رہا..

تو میں قبر کو ہاتھ لگا کر دیکھ لوں اس کو ڈھکتے سرو کے پتوں کے اندر انگلیوں سے محسوس تو کروں کہ ان پتوں کے اندر قبر واقعی کچی ہے.. کچی ہو گی تو اس کی مٹی پوروں سے لگ جائے گی..

یہ تجسس خاصی دیر تک جڑیں پکڑتا رہا کہ احاطے میں داخل ہو کر سرو کے پتے ہٹا کر یا ان میں ہاتھ ڈال کر دیکھنا تو چاہیے کہ کیا قبر واقعی کچی ہے.. اور میں ایک ایسے شخص کی مانند جو جرم کا ارتکاب کرنے سے پیشتر موقع واردات پر بظاہر لاپروائی سے یہ تسلی کرنے کے لیے کہ کوئی اسے رنگے ہاتھوں پکڑ نہ لے ادھر ادھر نگاہیں ڈالتا ہے.. اب ایک مختلف نظر سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا.. ادھر آنے والے راستے کے آخر میں کوئی سیاح نمودار تو نہیں ہوا.. میں بالکل تنہا ہوں تو کوئی کدھر سے آ سکتا ہے.. بس مجھے دو چار لمحے درکار ہیں.. کچے احاطے میں داخل ہونا پھر سرو کے پتوں کو ٹٹولنا کہ ان کے نیچے کیا ہے.. لیکن اس تجسس کا گلا ایک مفروضے نے گھونٹ دیا کہ فرض کریں کوئی کسی اور جانب سے آ نکلتا ہے.. اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ٹالسٹائی کی اس عظیم یادگار پر کوئی نظر رکھنے والا نہ ہو.. ہو سکتا ہے وہ خاموشی کے اس جنگل میں پوشیدہ ہو کر یہاں آنے والے سیاحوں پر نظر رکھتا ہو.. حکومت کی جانب سے تعینات کوئی رکھوالا ہو جو سامنے نہ آتا ہو.. اور اگر وہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں کرتا ہوا دیکھ لے تو اسے بہر صورت مغالطہ ہو گا کہ میں ٹالسٹائی کی قبر کے درپے ہوں.. میری نیت پتہ نہیں کیا ہے.. تو اس خوف نے مجھے اپنا جنوں انگیز ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا..

جب میمونہ اور آنیا واپس جا رہی تھیں تو آنیا اس سے پوچھ رہی تھی کہ مستنصر یہاں تنہا رہ کر کیا کریں گے تو میمونہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی اکیلے میں ٹالسٹائی سے باتیں کریں گے..

کیا میں نے اس عجیب افسردگی میں تنہا ہو کر اس مقام کے فسوں کے زیر اثر ٹالسٹائی سے کچھ باتیں کیں..

نہیں..

البتہ میں نے اسے دیکھا..

یہ خیال ہر اس شخص کے ذہن میں آتا ہے اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا' اسے ذہن

سے جھٹکنے کی کوشش کرتا ہے جو اپنے کسی عزیز کسی بزرگ کی قبر پر اک عالم اندوہ میں کھڑا ہوتا ہے.. یہ خیال اُس کے ذہن کے نہاں خانوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی جنم لیتا ہے کہ وہ... آج.. اپنی موت کے اتنے برس بعد.. اس لمحہ موجود میں 'مٹی میں دفن.. وہ اب کیسا ہوگا.. کس حالت میں ہوگا.. اُس کا ماس تو کیڑے کھا چکے ہوں گے تو اُس کی پہچان کیا ہوگی.. وہ کون سی ایسی علامت یا شباہت ہوگی جس سے یہ جان لیا جائے کہ یہ تو... وہ... ہے. ڈھانچے کی تو کوئی شناخت نہیں ہوتی.. سب شاہ و گدا موت کے بعد ایک ہو جاتے ہیں.

شاید کفن کی کچھ دھجیاں.. شاید نہیں بہر طور اُس کے بال..

تو میرے ساتھ بھی یہی ہوا..

البتہ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں جب یہ خیال آیا کہ نیچے.. سرو کے پتوں سے ڈھکی کچی قبر کے نیچے دفن کیے جانے کے ستانوے برس بعد آج اس لمحہ موجود میں لیو ٹالسٹائی کیسا ہوگا.. تو میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا نہیں.. بلکہ اسے جنم لینے دیا.. اور اس خیال کا جواب آیا کہ لکڑی کا تابوت تو کب کا بارشوں اور برفوں کی نمی سے بوسیدہ ہو کر مٹی ہو چکا ہوگا.. صرف ڈھانچہ ہوگا اور وہ بھی بکھرا ہوا لیکن اُس کی شناخت ہو جائے گی.. لیو پہچانا جائے گا.. اُس کی سفید داڑھی ابھی مٹی میں مٹی نہ ہوئی ہوگی..

ابھی تک یہاں تک 'قبر تک آنے والے کچے راستے پر ویرانی تھی.. صرف ہلکی بارش تھی جو اُس پر چلتی تھی..

آنیا اور مونا جانے کہاں ہوں گی.. جہاں بھی ہوں گی فکر مند اور منتظر ہوں گی.. اور اگر میں کچھ دیر تک اُنہیں دکھائی نہیں دیتا تو.. کم از کم مونا میری تلاش میں واپسی کی راہ اختیار کر لے گی.. یہاں آ جائے گی..

جن لوگوں کو کشف ہوتا ہے وہ اُس لمحے کو اپنی حیات کے تمام لمحوں پر فوقیت دیتے ہیں.. رُوس میں بسر کیے جانے والے پندرہ دنوں میں سے یہ ایک لمحہ بھیگتی ہوئی جنگلی ہریاول میں تنہائی کا ٹالسٹائی کی قربت میں وہ لمحہ تھا جو میرے لیے بھی ایک کشف کی مانند تمام لمحوں پر حاوی ہو گیا تھا.. میں رخصت ہونے لگا تو میں نے ایک آخری نظر اُن زرد اور بنفشی پھولوں پر ڈالی جو میں نے خاموشی کے جنگل میں سے چن کر قبر کے قریب کچی مٹی پر رکھے تھے اور وہ بھیگتے ہوئے اپنے

رنگ روشن کر رہے تھے.. اور میں نے پہلے کچھ دھیان نہ کیا تھا اور اب چلنے لگا تو وہ نظر آ گئے.. اس سے پیشتر وہ مجھے دکھائی ہی نہیں دیئے تھے..

ٹالسٹائی کی قبر کے ایک کونے میں چند خود رو بوٹے بوندوں کے بوجھ سے دوہرے ہو رہے تھے اور اُن پر کچھ زرد جامنی اور سفید پھولوں کے گچھے بوجھ ہوتے تھے.. یہ بوٹے ٹالسٹائی کی قبر کے پہلو میں سے یوں پھوٹے ہوئے تھے کہ وہ گواہ ہو رہے تھے کہ سرو کے پتوں کے اندر مٹی ہے اور ہم اُس میں سے جنم لے کر نمایاں ہو رہے ہیں... ہم وہ لالہ و گل ہیں جو خاک میں پنہاں اُس صورت میں نمایاں ہو رہے ہیں.. میں نے پہلی بار کچے احاطے میں قدم رکھا اور قبر کے پہلو میں کھلے ان پھولوں کو توڑ کر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا.. وطن واپسی پر میں نے ان سوکھ چکے پھولوں کو "وار اینڈ پیس" کے اوراق کے درمیان میں رکھ دیا.. اُن کی پتیاں خشک ہو کر بکھرنے کو تھیں..

میں جب بھی "وار اینڈ پیس" کو کھولتا ہوں تو جامنی اور زرد پتیاں ناول کے حرفوں سے چپکی ہوتی ہیں.. حرفوں سے اُن کی شناسائی ہو گئی ہے کہ انہیں اُس شخص نے تخلیق کیا تھا جس کی قبر کی مٹی سے ہم نے جنم لیا تھا.. میں اُنہیں دیکھ کر پھر سے اُس انہونی' فہم سے باہر تنہائی میں چلا جاتا ہوں جہاں کوئی اور جہان ہے اور اُس میں جنگل خاموش ہے اور مٹی میں مٹی ہوتی ایک لمبی سفید ریش ہے اور میں بارش میں بھیگ رہا ہوں.

آنیا اور مونا میری منتظر تھیں..

بلند ترین برج اور شاہ بلوط کے درختوں میں گھرے راستے کے آخر میں وہ میری راہ دیکھتی تھیں. اور بارش تھم چکی تھی..

دائیں جانب کوچوان کا جھونپڑا تھا جس میں اُس کا ذاتی سامان ابھی تک محفوظ ہے اور ٹالسٹائی اپنے گھر سے پیدل چلتا ایک سویر جب تاریکی ابھی راج کرتی تھی اس جھونپڑے تک آیا تھا اور اُس نے خوابیدہ کوچوان کو بیدار کر کے اُسے بگھی میں گھوڑے جوتنے کا حکم دیا تھا..

ذرا آگے ہوئے تو دائیں ہاتھ پر اُس تالاب کے کنارے جس میں ٹالسٹائی دہقان بچوں کے ساتھ تیرا کرتا تھا اصطبل کی مستطیل عمارت تھی جہاں سے کوچوان نے گھوڑوں کو نکال کر

بگھی میں جوتا تھا..

ایک نوجوان کسرتی بدن کی عورت ایک بیلچے سے اصطبل کے آگے بارش کی وجہ سے جو کیچڑ ہو گیا تھا اُسے صاف کر رہی تھی.

آئرینا نے کہا تھا کہ بہار اب کے ٹھہر گئی ہے.. ہوا میں سے خنکی رخصت نہیں ہو رہی..

اگر آپ آج سے پندرہ بیس روز بعد یہاں آتے تو ٹالسٹائی کے گھر کے آس پاس سیبوں کے شگوفوں کی آبشاریں رواں ہوتیں.. اور یہ کیا ہی میرے حق میں بہتر ہوا کہ میں یہاں پندرہ بیس روز بعد نہ آیا. اگر آتا تو کیا ایک ایسا منظر دیکھ کر میں حواس نہ کھو بیٹھتا..

میرے آگے اگر صرف ایک شگوفہ گرتا تھا.. وادی سوات میں دریا کے کنارے ایک شام گرتا تھا تو میں اُس کے سحر کو سہار نہ سکتا تھا.

ہم برچ کے درختوں میں گھرے اُس راستے پر آنکلے جسے ٹالسٹائی نے ''وار اینڈ پیس'' میں بیان کیا ہے اور ہمیں اُس کے آخر میں وہ بھدے اور ٹھگنے ستون نظر آنے لگے جہاں سے ہم یاسنایا پولیانا میں داخل ہوئے تھے.. اور جہاں سے وہ بگھی نکلی ہوگی جس کی پچھلی نشست پر ایک دنیا جہان کے افلاس ظلم اور ناانصافی پر کڑھتا آزردہ ہوتا' اپنی پُرتعیش زندگی سے بیزار کسانوں کے پہلو بہ پہلو کھیتوں میں مشقت کرنے کی خاطر قفقاز جانے والا ایک سفید ریش بوڑھا اپنی بیوی صوفیہ کو آخری خط لکھ کر.. دوستووسکی کے ناول ''برادرز کرمازوو'' کو پڑھتے ہوئے ادھورا چھوڑ کر.. اپنی لاڈلی اور سب سے چھوٹی بیٹی الیگزانڈرا سے ملاقات کر کے وہ سفید ریش بوڑھا بیٹھا تھا جس نے ایک دُور افتادہ ریلوے سٹیشن استاپوورو میں سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں مر جانا تھا..

جیسے وہ ان سفید اور بھدے ستونوں میں سے آخری بار باہر آیا ویسے میں بھی اُن میں سے چلتا باہر آیا. اگرچہ مرنا تو میں نے بھی ہے لیکن گمان ہے کہ کسی سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بے آسرا نہیں مروں گا.. اگرچہ جہاں کہیں بھی مروں گا گمنام مروں گا..

اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس قبرستان میں دفن ہوں گا..

پر یہ طے ہے کہ میری قبر برچ' دیودار یا صنوبر کے خاموش جنگلوں میں پوشیدہ نہ ہو گی اور نہ ہی اُس کی جانب کوئی ہریاول کی دیواروں کے درمیان میں سے کوئی کچا راستہ جائے گا اور نہ

ہی کوئی گل لالہ رکھے گا.. اور نہ ہی اُس کے پہلو میں سے کوئی خودرو پھول نمودار ہوں گے.

لیکن اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا..

موت میں شاہ و گدا برابر ہوتے ہیں..

ٹالسٹائی اور تارڑ برابر ہو جاتے ہیں..

اور ہاں راستے میں میں اُس درخت کے پاس رُک گیا جس کے تنے پر ایک محبت بھرا ہاتھ رکھ کر آئرینا نے کہا تھا'' یہ لارچ کا درخت ہے اور ٹالسٹائی کہا کرتا تھا کہ میں لارچ کے ایک درخت کی بلند ترین شاخوں پر پیدا ہوا تھا.''

اور میں نے بھی ایک محبت بھرا ہاتھ اُس کے تنے پر رکھا.. اور اُس کی بلند ترین شاخوں کو تکنے لگا.. اور اُن جنگلوں میں ایش' اوک' میپل' ایلم' پائن اور سپروس کے جو شجر تھے وہ میری نظروں میں آنے لگے اور اُس لمحے مجھے اپنے درخت یاد آنے لگے.. یہ درخت پرائے تھے.. اجنبی تھے.. میرا ان سے کچھ تعارف نہ تھا.. نہ وہ مجھے جانتے تھے اور نہ ہی میں اُن سے واقف تھا کہ ان کے پتے کب پھوٹتے ہیں ان پر پھول کون سے رنگ کے اور کس مہک والے کھلتے ہیں.. مجھے اپنے کیکر' برنے' برگد' شیشم' پیپل اور دھریک کے درخت درکار تھے..

وہ مجھ سے واقف تھے اور میں اُن کی چھاؤں میں پلا بڑھا تھا.

مجھے کیکر کے زرد پھول بلاتے تھے.. برنے کے نازک اور تیز مہک والے شگوفے کشش کرتے تھے. برگد کی گہری گھناوٹ اور قدامت.. شیشم کے تالیاں بجاتے ہوئے پتے.. پیپل کے پتوں کی ہتھیلیاں جن کی لکیروں میں میری قسمت پوشیدہ تھی اور دھریک کے جامنی رنگوں کے مست مہک والے پھول کھینچتے تھے..

مجھے لارچ کے درخت کی بلند ترین شاخوں پر پیدا ہونا منظور نہ تھا بے شک میں ٹالسٹائی ہو جاتا.

مجھے کسی کیکر یا شیشم کے درخت کی بلند ترین شاخوں پر پیدا ہونا منظور تھا بے شک میں کچھ بھی نہ ہوتا..

کہ وہ میرے اپنے شجر تھے..

یہ شجر یاد آنے لگے تو میں اُن کے لیے اپنے وطن کے لیے اداس ہوا.

پرائے دیس میں بہت دن ہو گئے تھے.. مونا کھوئی کھوئی سی پھرتی تھی اور میرا دل بھی نہ لگتا تھا..

اس پرائے نگر میں ہمارے دن پورے ہو گئے تھے..
ہمیں ہمارے شجر بلاتے تھے..
ان کی چھاؤں ہمیں بلاتی تھی کہ کہاں بھٹکتے پھرتے ہو.. آؤ ہمارے سائے میں آن بیٹھو..
کیکر کے زرد پھول ٹپ ٹپ تم پر گریں گے اور تمہارے بدن کو زرد کر دیں گے..
برگد تلے ایک عرصے سے کوئی گوتم نہیں بیٹھا.. تم آ جاؤ..
شیشم کے پتے تالیاں بجا کر ہمارا استقبال کریں گے..
اور بیری کی ڈال سے بندھے رسّے کے جھولے میں ایک تالیا تمہارے لیے جھولتی ہے..
ہمیں ہمارے شجر بلاتے تھے..
